علوم اسلامی کے فروغ میں
قاضی اطہر مبارکپوری کی خدمات: ایک تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے

پی ایچ۔ ڈی

مقالہ نگار

وسیم احمد

شعبہ اسلامک اسٹڈیز

فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی

دسمبر 2023

علوم اسلامی کے فروغ میں
قاضی اطہر مبارکپوری کی خدمات: ایک تجزیاتی مطالعہ

مقالہ

برائے

جامعہ ملیہ اسلامیہ

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کے لئے مطلوبہ چیزوں کی تکمیل

اسلامک اسٹڈیز

مقالہ نگار

وسیم احمد

نگراں

ڈاکٹر محمد ارشد

جامعہ ملیہ اسلامیہ

شعبہ اسلامک اسٹڈیز

فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی

DECLARATION

I, **Waseem Ahmed**, student of Ph.D., hereby declare that the thesis titled, **"Uloom-e-Islami ke Farogh mein Qazi Athar Mubarakpuri ki Khidmaat: Ek Tajziyati Mutaala"** which is submitted by me to the Department of Islamic Studies, Faculty of Humanities & Languages, Jamia Millia Islamia, New Delhi in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of Doctor of Philosophy has not previously formed the basis for the award of any Degree, Diploma, Associateship, Fellowship or other similar title or recognition. This is to declare further that I have also fulfilled the requirements of Para 11 ((b) and (g)) of the Ph.D. Ordinance.

Waseem Ahmed
Research Scholar

Place: New Delhi

Date: 04/12/2023

JAMIA MILLIA ISLAMIA
(A Central University by an Act Parliament)
Maulana Mohammad Ali Jauhar Marg, New Delhi-110025

NAAC Accredited
A++ Grade
3rd Rank in NIRF

जामिया मिल्लिया इस्लामिया
(संसदीय अधिनियमानुसार केंद्रीय विश्वविद्यालय)
Website: jmi.ac.in

Department of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
Phone: 26981717 Ext. 2552

डिपार्टमेंट ऑफ इस्लामिक स्टडीज
जामिया मिल्लिया इस्लामिया
नई दिल्ली - 110025

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

CERTIFICATE

On the basis of the declaration submitted by **Waseem Ahmed**, student of Ph.D., I hereby certify that the thesis entitled, **"Uloom-e-Islami ke Farogh mein Qazi Athar Mubarakpuri ki Khidmaat: Ek Tajziyati Mutaala"** which is submitted to the Department of Islamic Studies, Faculty of Humanities and Languages, Jamia Millia Islamia, New Delhi in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of Doctor of Philosophy, is an original contribution with existing knowledge and faithful record of research carried out by him under my guidance and supervision.

To the best of my knowledge this work has not been submitted in part or full for any Degree or Diploma to this University or elsewhere.

Dr. Mohd. Arshad
(Supervisor)
Deptt. of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

Place: New Delhi

Date: 04/12/2023

Prof. (Dr) Iqtidar Mohd Khan
(Head)
Department of Islamic Studies
Faculty of Humanities and Languages
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

Prof. Dr. Iqtidar Mohd. Khan
Head
Deptt. of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

فہرست

DECLARATION

CERTIFICATE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہارِ تشکر

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم . اما بعد!

حمد وثناء کے بعد میں اللہ رب العزت کا سب سے زیادہ شکر گزار ہوں جس نے مجھے وہ ذہنی صلاحیت اور جسمانی قوت بخشی کہ جس کی بدولت میں نے تحقیق جیسے مشکل کام کا ذمہ لیا، پھر اسی کی رحمت ومہربانی سے یہ مرحلہ اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اللہ رب العزت کے بعد میرے شکریہ کے سب سے زیادہ حقدار میرے مشفق استاذ ڈاکٹر محمد ارشد ہیں، جنہوں نے مجھ پر اعتماد ظاہر کر کے اپنی نگرانی میں تحقیقی کام کرانے کی ذمہ داری لی، پھر اپنی پر خلوص رہنمائی، مشورے، تجاویز اور بعض دفعہ غلطی کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ سے مجھے اس قابل بنایا کہ اس موضوع پر کام کر سکوں، نیز اس کی تیاری میں ہر قدم پر مجھے ان کی رہنمائی حاصل رہی، ان کی شفقت کے بغیر اس تحقیقی مقالہ کا پورا ہونا ناممکن تھا، اس لیے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں اور ان کے حق میں رب ذی الجلال سے دعا گو ہوں کہ وہ اس کا بہترین بدلہ انہیں مرحمت فرمائے۔

میں اپنے محسن ومشفق استاذ اور شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے صدر پروفیسر ڈاکٹر اقتدار محمد خاں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں، جو وقتاً فوقتاً مجھ سے تحقیقی مقالے کے کام کی رفتار کے بارے نہ صرف پوچھتے رہے، بلکہ اپنے تجربات کی روشنی میں ہمیشہ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ اللہ تعالی انہیں بہترین جزاء عطا فرمائے۔

استاذ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق کا بھی شکر گزار ہوں، جن کے زمانہ صدارت میں مجھے پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ ملا اور اس کے تمام مراحل میں انہوں نے میری مدد کی۔

میں اپنے شفیق استاذ پروفیسر ڈاکٹر سید شاہد علی کا بھی ممنون ہوں جن کی رہنمائی اور تحقیق سے متعلق تجاویز

نے مجھے اس لائق بنایا کہ اپنے تحقیقی کام کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکوں۔

میں اپنے اساتذہ جناب جنید حارث، ڈاکٹر محمد خالد خان اور ڈاکٹر عمر فاروق کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، جنہوں نے کبھی بھی میرے حوصلوں کو پست ہونے نہیں دیا اور برابر حوصلہ افزائی کرتے رہے، نیز مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، ڈاکٹر خورشید آفاق، ڈاکٹر نگار افشاں اور مولانا ضیاء الحق خیر آبادی کا بھی بہ طور خاص شکر گزار ہوں۔ ان لوگوں نے قاضی اطہر مبارکپوری کے افکار و نظریات کو سمجھنے میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ اس سلسلہ میں بعض اہم کتابوں اور مضامین کی طرف نشاندہی بھی کی، اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازے۔

سینئر ساتھیوں اور ریسرچ اسکالرس میں ڈاکٹر محمد تحسین زماں، ڈاکٹر جاوید اختر، ڈاکٹر عمار عبدالحی، ڈاکٹر محمد اسامہ، ڈاکٹر محمد مسیح اللہ، ڈاکٹر انیس الرحمٰن قاسمی، ڈاکٹر عمر مبین اعظمی، ڈاکٹر امرین، ڈاکٹر اجمل سی سی، ڈاکٹر اویس منظور ڈار، ڈاکٹر سلیم حنان شیرین، احتشام الحسن، ڈاکٹر سیف انور، عامر فہد، منور کمال اور محمد لعل چاند وغیرہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، ان تمام ساتھیوں نے ہر موقع پر محبت و خلوص کے ساتھ اپنا تعاون پیش کیا۔

قدیم دوستوں میں انصار احمد، جنید ابراہیم، وقار اعظم، سفینہ انعام، صبیحہ اسلم، زینب آزاد، مدثر، فرحانہ شاہین، سدرہ، ردا ایوب اور ریحانہ شاہین وغیرہ کا اس لیے شکر گزار ہوں کہ یہ لوگ ہمیشہ میرے لئے مخلص و فکرمند رہے اور میری تعلیم و ترقی کے لئے اللہ سے دعا کی۔

ناقدری ہوگی اگر قاضی اطہر مبارکپوری کے صاحب زادے قاضی سلمان مبشر اور پوتے قاضی عدنان احمد کا شکریہ ادا نہ کروں، جن کی ذاتی اور خصوصی دلچسپی میرے تحقیقی سفر کے دوران شامل حال رہی، تحقیق و تدقیق سے لے کر مواد کی فراہمی اور مقالہ کی تکمیل تک انہوں نے میرا ہر مرحلہ میں بھرپور تعاون کیا، اللہ رب العزت انہیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں حسب ذیل کتب خانوں کے منتظمین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ اگر وہ پورے طور سے مدد نہ کرتے تو بہت سی اہم کتابوں تک رسائی نہ ہوتی:

1۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

2۔ شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند۔

3۔ شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

4۔ کتب خانہ جماعتِ اسلامی ہند، نئی دہلی۔

5۔ کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند۔

6۔ مکتبۃ الفہیم ،مئوناتھ بھنجن۔

مقالہ کی ترتیب وتزئین کے لیے محمد اشفاق عالم اور شکیل الرحمٰن کا ممنون ہوں کہ ان کے پرخلوص تعاون سے یہ مقالہ تکمیل کے مراحل کو پہنچا۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے آفس انچارج رونق علی اور معاون محمد اطیع اللہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے کاغذی کاروائیوں میں ہمیشہ تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام معاونین ومحسنین کو جزائے خیر دے۔

ناسپاسی ہوگی اگر دہلی گورمینٹ کے شعبۂ نقل وحمل (DTC) کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس شعبہ نے مجھ جیسے ہزاروں طلباء کو دہلی کے حدود میں محض سو روپے ماہانہ کے عوض اپنی بسوں میں سفر کرنے کی سہولیات فراہم کیں، جس سے میں ہمیشہ وقت پر گھر سے جامعہ اور جامعہ سے گھر پہنچ سکا۔ اس لئے میں اس شعبہ کے اراکین وکارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ان تمام حضرات کے علاوہ اپنے تین بھائیوں (محمد عتیق، محمد فیصل اور محمد عادل) دو ہمشیرہ (سعدیہ، روبینہ) اور رفیق حیات (میمونہ نگار) کا بھی ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے مجھے گھریلو مصروفیات اور ذمہ داریوں سے فارغ رکھا، تاکہ یہ تحقیقی کام یکسوئی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔

اخیر میں مرحوم والدین اور دادا دادی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے کہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود یہ ہستیاں میری تعلیم وتربیت کے لئے ہمیشہ فکرمند رہیں اور حسب استطاعت میرے لئے بنیادی تعلیم کا انتظام کیا، یہ ان لوگوں کی ابتدائی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ محلّہ کے معمولی مکتب سے لیکر جامعہ جیسے عظیم ادارے کے مشفق و باصلاحیت اساتذہ سے مجھے مستفید ہونے کا موقع ملا اور یہ سطور لکھنے کے لائق بن سکا۔ اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ انہیں جنت الفردوس میں حسب مراتب درجہ عطا فرمائے۔ آمین!

وسیم احمد
ریسرچ اسکالر
شعبہ اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مقدمہ

تعارف (Introduction)

علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے حوالہ سے سرزمین ہند زمانۂ قدیم سے ہی بڑی زرخیز رہی ہے۔ مسلمانوں کے دورِحکومت میں یہاں ایسے علماء ودانشور پروان چڑھے جن کے فضل وکمال اور علم ودانش مندی کو دنیا نے تسلیم کیا۔ پہلی صدی ہجری کے آخر تک اس ملک کا شمال مغربی علاقہ (موجودہ پاکستان) اموی خلافت کے زیرِ تصرف مسلم حکومت کا حصہ بنا اور بڑے پیانہ پر مسلمانوں نے وہاں رہائش اختیار کی۔ ان نوآباد مسلمانوں کے بودو باش، اخلاق وعادات اور طرزِ زندگی نے یہاں کے قدیم باشندوں پر اپنے اثرات مرتب کیے، جس سے ان کا معتد بہ حصہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوا۔ عہدِ عباسی میں جب عقلی ونقلی علوم کی اشاعت وتبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا تو دنیا بھر سے مختلف علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں خلیفۂ وقت کی خدمت میں حاضر کی گئیں، ہندوستان سے بھی علمِ نجوم، ہیئت اور ریاضی وغیرہ کی کچھ کتابیں بغداد لے جائی گئیں اور بیت الحکمۃ کے زیرِ انتظام عربی میں ان کا ترجمہ کیا گیا، اس حوالہ سے تاریخ کی کتابوں میں ''سدھانت'' اور ''پنچ تنتر'' کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے، ان میں ثانی الذکر کا عربی ترجمہ ''کلیلہ ودمنہ''، جسے عبداللہ ابن مقفع (م 759ء) نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، عربی ادب کی شاہکار کتابوں میں شامل ہے اور آج بھی مدارس اسلامیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں قرآن، حدیث، فقہ، سیر ومغازی اور فلسفہ وکلام وغیرہ علوم کی اشاعت بھی زوروں پر تھی اور ان علوم کے ماہرین مسلم دنیا کے تمام بڑے شہروں میں پائے جاتے تھے۔ ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں دیبل، منصورہ، محفوظہ اور ملتان وغیرہ ان علوم وفنون کے مراکز تھے، جہاں مقامی باشندوں کے علاوہ بیرونی علاقوں سے بھی حصول تعلیم کے لئے لوگ آیا کرتے تھے، چونکہ تاریخ وتذکرہ کی عام کتابیں ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لئے برائے نام بھی ان کا تذکرہ نہیں ملتا، البتہ اس زمانہ میں عرب میں آباد بعض ہندی الاصل علماء کے نام ان میں ضرور ملتے ہیں، چنانچہ عہدِ عباسی میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی (م 170ھ/787ء) فن سیر ومغازی کے امام

گزرے ہیں اور ایک دوسرے شخص ابوالعطاء سندھی (م 180ھ/796ء) نے عربی شعر و شاعری میں مہارت حاصل کی تھی۔ یہ دونوں اصحابِ علم ہندوستان کے علاقۂ سندھ سے تعلق رکھتے تھے، ان میں سے اول الذکر کی نشوونما مدینہ میں ہوئی اور مؤخر الذکر نے کوفہ میں پرورش پائی۔

خلافتِ عباسیہ کے عہدِ زوال میں برصغیر کا علاقہ عربوں کے بعد پہلے غزنویوں اور پھر غوریوں کی تحویل میں رہا۔ سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے غلام قطب الدین ایبک نے 1206ء میں ہندوستان میں ایک آزاد حکومت کی بنیاد رکھی جو سولہویں صدی عیسوی تک قائم رہی اور یکے بعد دیگر پانچ حکمراں خاندان (خاندان غلامان، خلجی، تغلق، سید اور لودھی) دہلی کے تختِ سیاست پر متمکن ہوئے، بعدازاں 1526ء میں ظہیر الدین محمد بابر (م 1530ء) نے "مغلیہ سلطنت" قائم کی۔ بابر کی قائم کردہ حکومت کو اس کے چند قابل جانشینوں نے بڑی وسعت و ترقی دی، جس کے باعث اگلی دو صدیوں تک اس سلطنت کا سورج اپنے عروج پر رہا اور آخری طاقتور حکمراں اورنگ زیب عالمگیر (م 1707ء) کی وفات کے بعد اس کا انحطاط شروع ہو گیا۔

دہلی سلطنت کے قیام سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال تک کا زمانہ ہندوستانی تاریخ کا عہدِ زریں کہلاتا ہے۔ علمی میدان میں اس زمانہ میں یہاں چوٹی کے علماء پیدا ہوئے، جنہوں نے علمِ حدیث، فقہ، تصوف اور تاریخ و ادب وغیرہ علوم میں اہم خدمات انجام دے کر ان میں قابلِ قدر اضافہ کیا، چنانچہ اس حوالہ سے امام رضی الدین حسن صغانی (م 1252ء)، شیخ احمد سرہندی (م 1624ء)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م 1642ء) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م 1762ء) وغیرہ نے اسلام اور علومِ اسلامی کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا، صوفیاء میں شیخ علی ہجویری (م 1072ء)، خواجہ معین الدین چشتی (م 1236ء)، بہاء الدین زکریا ملتانی (م 1262ء) اور حضرت نظام الدین اولیاء (م 1325ء) مرجع خلائق بنے، قاضی منہاج الدین (م 1260ء)، ضیاء الدین برنی (م 1357ء) اور ملا عبدالقادر بدایونی (م 1615ء) جیسے مؤرخین نے تاریخ کے موضوع پر گراں قدر کتابیں مرتب کیں، جب کہ ادب و شاعری میں امیر خسرو (1325ء) جیسے شعراء نے کمال پایا۔

سلاطینِ دہلی کے دورِ انحطاط میں کشمیر، بنگال، مالوہ، گجرات، بیجاپور اور گلبرگہ وغیرہ میں بھی بعض خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں، ان ریاستوں میں سے ایک جونپور کی شرقی سلطنت (1394ء تا 1467ء) تھی، جس کے چھ حکمرانوں میں ابراہیم شاہ شرقی (م 1440ء) سب سے مشہور حکمراں تھا، اس نے اپنے عہد میں علم اور علماء کی خوب سرپرستی کی اور دار السلطنت جونپور کو علوم و فنون کا مرکز بنا دیا، جہاں قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م 1445ء)

اور ملا محمود جونپوری (م 1505ء) جیسے نابغائے روزگار علماء مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوئے۔ تین سو سال تک شہر جونپور کی یہ علمی عظمت باقی رہی، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغل حکمراں شاہجہاں (م 1666ء) نے اسے ''شیرازِ ہند'' سے تعبیر کیا تھا۔(1)

اس زمانہ میں ریاست جونپور کی وسعت آج کل سے بالکل مختلف تھی، اس کے حدود موجودہ بہار و بنگال تک وسیع تھے اور پورا علاقہ علم وفن کا گہوارہ تسلیم کیا جاتا تھا، البتہ مرکزی حیثیت دارالحکومت شہر جونپور اور اس کے اطراف کے خطوں کو حاصل تھی، جن میں ضلع اعظم گڑھ بھی شامل تھا۔ یہ ضلع قدیم زمانہ سے اپنی گوں ناگوں خصوصیات وروایات کے باعث ممتاز رہا ہے، کیونکہ عہدِ وسطی میں اس کے مردم خیز قصبات میں ہزاروں ایسے عالم اور باکمال افراد پیدا ہوئے جنہوں نے علم کی مختلف شاخوں میں اہم خدمات انجام دیں، لیکن چونکہ اس وقت یہ خطہ جونپور ریاست کا حصہ تھا اس لئے وہ جونپوری کہلائے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''اعظم گڑھ ایک نئی آبادی ہے، البتہ اس کے مردم خیز قصبات پرانے ہیں اور پہلے وہ جونپور میں شمار ہوتے تھے اس لئے موجودہ اعظم گڑھ کے اکثر اگلے مشاہیر جونپوری مشہور ہوئے، اس زمانہ میں سرکار جونپور کی وسعت آج کل سے مختلف تھی۔''(2)

انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی علم ودانش کے اس گہوارے سے علمائے کبار کی نشو ونما کا تسلسل برقرار رہا اور ان میں سے بعض نے اپنی گرانقدر خدمات کے سبب عالمی سطح پر شہرت پائی، اس بات کا اندازہ مولانا اقبال احمد خاں سہیل (م 1955ء) کے مندرجہ ذیل شعر سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے ان عظیم شخصیات کے حوالہ سے اعظم گڑھ کے بارے میں کہا تھا:

اس خطّہ اعظم گڑھ پہ مگر، فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے، وہ نیّر اعظم ہوتا ہے(3)

انیسویں اور بیسویں صدی میں اعظم گڑھ میں پیدا ہونے والے مشاہیر علماء کی فہرست میں ایک بڑا نام شبلی نعمانی (م 1914ء) کا ہے، انہوں نے اسلامی تاریخ کے موضوع پر اردو زبان میں الفاروق، المامون، النعمان اور سیرت النبیؐ جیسی مدلل ومستند کتابیں تصنیف کیں کر کے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اہم رول ادا کیا، اس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں قابل اور صلاحیت مند تلامذہ کی ایک ایسی جماعت تشکیل دی جس نے ان کے بعد دارالمصنفین کے پلیٹ فارم سے اسلامی علوم کی نشر واشاعت میں بیش بہا علمی و دینی خدمات انجام دیں۔

شبلی کے بعد اس علاقہ کی دوسری اہم شخصیت مولانا حمید الدین فراہی (م 1922ء) کی ہے۔ اسلامی علوم میں علوم قرآنی سے انہیں خاص شغف تھا اور اس موضوع پر عربی میں ان کی تفسیر ''**نظام القرآن و تأويل الفرقان**'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی ضلع سے تعلق رکھنے والے مولانا اسلم جیراجپوری (م 1922ء) بھی تھے، جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے عصری اداروں میں تدریسی فرائض انجام دیئے اور اپنے خطبات کے ذریعہ اسلامی تہذیب وثقافت کو ان اداروں میں برقرار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا، مزید برآں اسلامی تاریخ کے موضوع پر ''تاریخ الامت'' کے عنوان سے ایک کتابی سلسلہ تحریر کیا۔ ان کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی (م 1997ء) صاحب تدبر قرآن، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (م 1992ء) محقق ''**مصنف ابن ابی شیبہ**'' اور مولانا محمد مصطفیٰ اعظمی (م 2017ء) محقق ''**صحیح ابن خزیمہ**'' وغیرہ اس علاقہ کی وہ نامور اور اہم شخصیات ہیں کہ جن کی مفید علمی خدمات کا لوگوں نے نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا۔

اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے علمائے کبار کی اسی صف میں شامل ایک نام قاضی اطہر مبارکپوری (م 1996ء) کا بھی ہے جنہوں نے عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر قابل رشک خدمات انجام دے کر علمی دنیا سے ''مؤرخ اسلام'' کا خطاب پایا، ان کا مولد ومسکن اسی ضلع کا قصبہ مبارک پور ہے جسے قرب و جوار کے علاقوں میں پارچہ بافی کی صنعت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے علاوہ یہ قصبہ مولانا ظفر حسن عینی (م 1928ء)، مولانا احمد حسین رسولپوری (م 1940ء)، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری (م 1935ء)، ملا رحمت علی اسماعیلی (م 1944ء)، مولانا عبید اللہ رحمانی (م 1994ء) اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری (م 2006ء) جیسے عالمی شہرت یافتہ علماء کا مسکن ہونے کے باعث علم ودانش کا گہوارہ بھی رہا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری 7 مئی 1916ء کو مبارک پور کے محلّہ پورہ رانی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبد الحفیظ تھا مگر موروثی لقب ''قاضی''، تخلص ''اطہر'' اور وطنی نسبت ''مبارکپوری'' کے مجموعہ یعنی ''قاضی اطہر مبارکپوری'' سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھریلو مکتب میں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مزید تعلیم مبارک پور کے مدرسہ احیاء العلوم میں پائی، اس کے بعد سند فراغت 1940ء میں مدرسہ شاہی مراد آباد سے حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے عملی زندگی کی ابتدا درس وتدریس سے کی اور پانچ سال مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی فرائض انجام دیئے، بعد ازاں اہل وعیال کی کفالت کی غرض سے پہلے امرتسر اور پھر دو ماہ وہاں قیام کے بعد لاہور کا قصد کیا جہاں سہ روزہ اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر

سر پرستی انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا، یہیں اخبار کے دفتر میں انہوں نے ''منتخب التفاسیر'' کے عنوان سے اردو زبان میں قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی ترتیب دی جو بدقسمتی سے تقسیم ملک کے نتیجے میں بگڑے ہوئے حالات کی نذر ہوگئی، نیز ایک کتاب بعنوان ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' مشہور شاعر احسان دانش کے ایماء پر لکھی جو مدت دراز کے بعد ناقص حالت میں چند سال قبل قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور سے شائع ہوئی ہے۔

1947ء میں ملک کی تقسیم کے بعد لاہور مغربی پاکستان کا حصہ قرار پایا اور قاضی اطہر مبارکپوری مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے مشورہ سے ان کے اخبار ہفت روزہ ''انصار'' بہرائچ کے مدیر ہوئے۔ اگلے سات آٹھ ماہ تک یہ اخبار بہرائچ سے ان کی ادارت میں نکلتا رہا، لیکن اپنے سیاسی مضامین کے باعث جلد ہی حکومتِ اتر پردیش کی نگاہ میں کھٹکنے لگا، جس کے سبب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کو اسے بند کرنا پڑا۔ اخبار بند ہونے کے بعد قاضی صاحب کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) میں پڑھانے کا موقع ملا، وہاں انہوں نے ایک سال مفوضہ تدریسی خدمات انجام دیں، بعدازاں 1950ء کے آخر میں کسبِ معاش کی خاطر حکیم فصیح اللہ خاں اعظمی کے توسط سے ممبئی چلے گئے۔

ممبئی میں جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ابتدا میں قاضی اطہر مبارکپوری کا مسکن بنا، جہاں وہ چند ماہ بے روزگار رہنے کے بعد جمعیۃ کے ترجمان روزنامہ ''جمہوریت'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے، لیکن چھ ماہ بعد مدیر اخبار مولانا حامد الانصاری غازی سے اختلاف کے سبب بادل ناخواستہ اس سے علیحدہ ہوکر روزنامہ ''انقلاب'' سے وابستہ ہوگئے اور آئندہ چالیس سال (1951ء تا 1990ء) تک اس سے منسلک رہے۔

ممبئی کے اسی زمانہ قیام میں چار سال کی مدت گزر جانے کے بعد صابو صدیق مسافر خانہ کی کمیٹی ''انجمن خدام النبیؐ'' نے ''البلاغ'' کے نام سے ہفت روزہ اور ماہنامہ نکالنے کا پروگرام بنایا، اس کی ادارت میں مولانا حامد الانصاری غازی اور مولوی عبدالرشید ندوی کے ہمراہ معاون مدیر کے طور پر قاضی اطہر مبارکپوری کو بھی شامل کیا گیا۔ ہفت روزہ ''البلاغ'' چند شمارے نکلنے کے بعد بند ہوگیا، مگر ماہنامہ ''البلاغ'' چھبیس سال تک جاری رہا اور قاضی اطہر مبارکپوری نے چوبیس سال تک اس کے مدیر رہے۔

ممبئی میں دورانِ قیام روزنامہ ''انقلاب'' اور ماہنامہ ''البلاغ'' کے علاوہ ملک کے الگ الگ حصوں سے شائع ہونے والے دیگر دینی و علمی رسالوں مثلاً مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''برہان'' دہلی اور ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ سے بھی قاضی صاحب کا علمی تعلق تھا اور ان مجلّات میں ان کے مقالات و مضامین شائع ہوتے تھے۔

مقالات و مضامین کے علاوہ کتابوں کی تصنیف و تالیف بھی قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کا ایک اہم مشغلہ

رہا ہے، جس کی بنیاد تعلیمی دور میں ہی پڑ چکی تھی۔ اس زمانہ میں انہوں نے بالترتیب حسب ذیل پانچ کتابیں لکھیں:

(1) خیر الزاد فی شرح بانت سعاد (2) مرآت العلم (3) ائمہ اربعہ (4) الصالحات (5) اصحاب صفہ۔

ان میں اول الذکر دو کتابیں عربی میں جبکہ بقیہ تین اردو میں لکھیں، آخر الذکر ''اصحاب صفہ'' سوا دو سو اشعار کی ایک منظوم کتاب تھی۔ ان پانچوں کتابوں میں مؤخر الذکر تین کتابیں شائع ہوئے بغیر مفقود ہوگئیں، البتہ اول الذکر دو کتابیں مسوّدہ کی شکل میں ابھی بھی ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد قاضی صاحب نے جب عملی میدان میں قدم رکھا تو چند برس کے وقفہ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ وہاں بھی جاری رہا اور تقسیم ملک سے قبل لاہور کے ڈیڑھ سالہ زمانۂ قیام میں انہوں نے دو کتابیں تحریر کیں، ایک ''منتخب التفاسیر'' زمزم کمپنی کی جانب سے ماہانہ طے شدہ اجرت پر اور دوسری ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' مشہور شاعر احسان دانش کی فرمائش پر، مگر بدقسمتی سے یہ دونوں بھی اشاعت سے قبل ملک میں پھیلی بدامنی کی نذر ہوگئیں۔

1950ء میں جب وہ ممبئی پہنچے تو وہاں ماحول اور حالات دونوں ان کے لئے سازگار ثابت ہوئے، چنانچہ یہاں آنے کے پندرہ دن بعد ہی ان کی پہلی کتاب بعنوان ''اسلامی نظام زندگی'' چھپ کر منظرِ عام پر آئی، اس کے بعد تصنیف و تالیف کا ایسا سلسلہ قائم ہوا کہ یہاں قیام کے دوران اگلے تیس سالوں میں ملک و بیرون ملک کے مختلف اشاعتی اداروں سے ان کی بیس کتابیں شائع ہوئیں۔

ممبئی میں تقریباً تیس برس علمی کاموں میں منہمک رہنے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے 1980ء میں اس شہر کو خیر باد کہا اور ہمیشہ کے لئے اپنے وطن مبارک پور لوٹ آئے، اپنی سابقہ روش کے مطابق انہوں نے یہاں بھی زندگی کے باقی سولہ سال علومِ اسلامی کے مختلف موضوعات پر تحقیق و جستجو میں صرف کیے، جس کے نتیجہ میں ان کے قلم سے آٹھ کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، ان کے علاوہ مزید کچھ کتابیں زیرِ ترتیب تھیں جنہیں مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ جولائی 1996ء کی 14 تاریخ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کی بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ اس اعتبار سے ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد پینتالیس ہے، جن میں سے اکثر تاریخی نوعیت کی ہیں، البتہ عناوین ان کے مختلف ہیں۔ ان میں نو کتابیں (6 اردو اور 3 عربی میں) صرف عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ

پر مبنی ہیں، جن میں عہدِ رسالتؐ سے لے کر ابتدائی عباسی خلفاء کے زمانہ تک ہندوستان کی سیاسی، دینی، علمی اور ثقافتی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتابیں بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، چنانچہ ایک کتاب ''خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت'' ہے، جس میں زمانہ رسالت، عہدِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اسلامی ریاست کے بڑے شہروں میں رائج تعلیمی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ ایک دوسری کتاب ''تدوین سیر ومغازی'' میں مختلف مراحل طے کرنے کے بعد فن سیر ومغازی کی تدوین کس طرح عمل میں آئی؟ اس پر معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ایک کتاب ''خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات'' ہے، جس میں انہوں نے قرون اولیٰ کی بعض ایسی مسلم خواتین کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ علومِ دینیہ کی نشر واشاعت میں عظیم خدمات انجام دی تھیں، اسی طرح ''ائمہ اربعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب میں انہوں نے فقہ اسلامی کی تاریخ اور اہل سنت والجماعت کے ائمہ متبوعین کے حالات زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں دو ایسی بھی کتابیں ہیں جن میں انہوں نے اپنے علاقہ کی تاریخ اور وہاں بسنے والے علماء کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں پہلی کتاب ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' ہے، جس میں انہوں نے مبارک پور کی چار سو سالہ تاریخ اور انیسویں و بیسویں صدی کے علماء، قراء اور حفاظ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور دوسری کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' میں انہوں نے شرقی سلطنت کے حوالہ سے عہد وسطیٰ کے مشرقی اتر پردیش کی علمی تاریخ بیان کی ہے۔ ایک کتاب ''علیؓ و حسینؓ'' کے عنوان سے محمود احمد عباسی امروہوی کی مشہور کتاب ''خلافتِ معاویہؓ و یزید'' کی تردید میں ہے۔ ان کے علاوہ الصالحات، اسلامی نظام زندگی، مسلمان، صفاتِ نفس، مکتوباتِ امام احمد ابن حنبلؒ، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء، طبقات الحجاج، تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں، قاضی اطہر مبارکپوری کے سفر نامے، معارف القرآن، ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت، مآثر ومعارف، آثار و اخبار، اسلامی شادی، حج کے بعد، مئے طہور، دیوان احمد اور کاروان حیات وغیرہ کتابیں اور کتابچے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں، ان میں سے اکثر ان کی حیات میں اور بعض وفات کے بعد شائع ہوئیں۔

ان کتابوں کے تعلق سے قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ چند کو چھوڑ کر ان میں سے اکثر مصنف کے ان مقالات ومضامین پر مشتمل ہیں جو روزنامہ ''انقلاب''، ماہنامہ ''البلاغ'' ممبئی، مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔

مطالعہ کی اہمیت ومعنویت(Significance & Relevance)

قاضی اطہر مبارکپوری نے تاریخ وتذکرہ نگاری کے میدان میں تحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔اس میدان میں ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ کو موضوع بحث بنایا اور اس سے متعلق اردو وعربی میں حسب ذیل نو کتابیں تحریر کیں:

1۔رجال السند والهند	2۔ العقد الثمین
3۔ الهند فی عهد العباسین	4۔عرب وہند عہدِ رسالت میں
5۔اسلامی ہند کی عظمت رفتہ	6۔ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
7۔خلافت راشدہ اور ہندستان	8۔خلافت بنوامیہ اور ہندوستان
9۔خلافت عباسیہ اور ہندوستان	

ان کتابوں میں انہوں نے اسلامی ہندوستان کی ابتدائی چار صدیوں کی سیاسی تاریخ بیان کی ہے، نیز عرب و ہند کے مابین قائم ثقافتی وعلمی تعلقات کا ایک واضح خاکہ مرتب کیا ہے۔ان سے قبل اس موضوع پر مولوی عبدالحلیم شرر (م1926ء) سید سلیمان ندوی (م1953ء) اور سید ابوظفر دسنوی (م1958ء) نے بھی قلم اٹھایا ہے، مگر ان کے یہاں بہت زیادہ اجمال وابہام پایا جاتا ہے، جب کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے ہر ایک نقطہ کی وضاحت میں تفصیل سے کام لیا ہے۔اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے تحقیقی کام کیا ہے جس کے نتیجہ میں کئی اہم کتابیں اور سیکڑوں مقالات منظرِ عام پر آئے ہیں اور علمی حلقوں میں انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، چنانچہ اسی اہمیت کے مدنظر اس موضوع کا انتخاب کیا گیا اور ان کے تحقیقی کاموں کا غیر جانب دارانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اہداف ومقاصد(Aims & Objectives)

قاضی اطہر مبارکپوری نے فن تاریخ اور تذکرہ وسوانح کے موضوعات پر کام کیا ہے اور اس تعلق سے سیکڑوں مقالات ومضامین اور پینتالیس چھوٹی بڑی کتابیں یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں، ان تمام کتابوں اور تحریروں کے حوالہ سے ان کی علمی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ تحقیق کا مقصد ہے اور اسی کے تحت زیرِ نظر مقالہ میں ان کے علمی کاموں کی نوعیت اور اسلوبِ تحریر سے بحث کی گئی ہے، ساتھ ہی معاصر علماء ومحققین کی تحریروں کی روشنی میں ان کے علمی کاموں کا تنقیدی وتجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

متعلقہ کاموں کا جائزہ (Review of Literature)

زیرِ بحث موضوع پر جو اہم کتب و رسائل دستیاب ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ کاروانِ حیات: یہ کتاب قاضی اطہر مبارکپوری کی ناقص خودنوشت سوانح ہے جو پہلی دفعہ 2003ء میں فرید بک ڈپو، نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

2۔ مجلّہ ترجمان الاسلام:

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو بنارس سے شائع ہوتا تھا۔ اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء پر مشتمل اس رسالہ کا ایک خاص نمبر بعنوان ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر'' شائع ہوا تھا، جس میں قاضی اطہر مبارکپوری کی حیات وخدمات کے بعض پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

3۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام:

یہ مجلّہ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ سے نکلتا تھا۔ اس مجلّہ کا ایک خاص نمبر'' قاضی اطہرؒ نمبر'' کے عنوان سے مارچ 2003ء میں شائع ہوا تھا، جس میں قاضی اطہر مبارکپوری کے متعلقین نے ان کے اوصاف و کمالات اور بعض کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔

4۔ مئے طہور:

یہ قاضی اطہر مبارکپوری کے اشعار کا مجموعہ ہے، جسے انہی کے ایک ہم وطن مولانا قمر الزماں مبارکپوری نے مرتب کیا ہے۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ابتدائی ڈیڑھ سو صفحات میں مرتب نے اختصار کے ساتھ قاضی اطہر مبارکپوری کی حیات وخدمات اور ان کے خاندان کے افراد کے احوال وکوائف بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب 2005ء میں فرید بک ڈپو، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

5۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ حیات وخدمات:

قاضی اطہر مبارکپوری کی حیات وخدمت پر مشتمل یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے، جو ایوروزا اکاڈمی علی گڑھ سے 2018ء میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر نگار افشاں اس کی مصنفہ ہیں، انہوں نے 2009ء میں قاضی اطہر مبا کپوری کی حیات وخدمات کے موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تھیولوجی میں اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔

متذکرہ بالا کتب ورسائل کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کی اپنی کتابیں اور مختلف مجلّات میں شائع شدہ ان کے مقالات ومضامین بھی اس زمرے کا حصہ ہیں۔

تحقیقی سوالنامہ(Research Questionnaire)

متعلقہ موضوع پر دورانِ تحقیق حسب ذیل سوالات کے جواب جاننے کی کوشش کی گئی ہے:

1۔قاضی اطہر مبارکپوری نے علوم اسلامی کے کن پہلوؤں پر کام کیا ہے؟

2۔قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریریں کس نوعیت کی ہیں؟

3۔کیا قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں سے اسلامی تاریخ میں اضافہ ہوا ہے؟

4۔قاضی اطہر مبارکپوری محض ایک علمی آدمی تھے یا کوئی خاص نظریہ وفکر بھی رکھتے تھے؟

5۔قاضی اطہر مبارکپوری کے تحقیقی کاموں کی کیا خوبی رہی ہے؟

6۔قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں کی دورحاضر میں کیا معنویت ہے؟

طریقۂ تحقیق(Research Methodology)

میرا یہ مقالہ بیانیہ تحقیق پر مشتمل ہے جس میں تاریخی اور تجزیاتی طریقۂ تحقیق کا استعمال کرتے ہوئے معروضی طور پر قاضی اطہر مبارکپوری کے علمی کاموں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تحقیقی مقالے کا انحصار زیادہ تر ابتدائی مآخذ پر ہے جس میں غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارکپوری کے معاصر علماء کی تحریروں کے حوالہ سے ان کے علمی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بنیادی مآخذ کے علاوہ ثانوی مصادر ومراجع یعنی موضوع سے متعلق دیگر کتب ورسائل سے بھی مدد لی گئی ہے، چنانچہ مقالہ کی تیاری میں معاصر علماء کے مقالات ومضامین، قاضی اطہر مبارکپوری کے اعزہ واقارب اور اساتذہ وشاگردوں کی اصل تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے، نیز رشتہ داروں اور دوستوں وغیرہ کے انٹرویوز کے ذریعہ مقالہ کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات کا طریقہ(Referencing Style)

تعلیمی اور تکنیکی اداروں میں علمی وتحقیقی کاموں میں حوالہ دینے کے مختلف طریقے رائج ہیں، جن میں عام طور پر A.P.A(American phycological association style and guide) ہاورڈ اسٹائل (Hawerd style guide) شکاگو اسٹائل (The Chicago manual and guide) اور MLA (Modern Language Association) وغیرہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔(4) زیرِ نظر مقالہ میں مؤخر الذکر

کو بنیاد بنا کر مقالات ومضامین اور کتب ورسائل وغیرہ کے حوالے مندرجہ ذیل طریقوں پر دیے گئے ہیں:

1۔ کتابوں کا حوالہ:

مصنف کا مشہور لقب / نسبت، اصل نام، کتاب، ناشر، مقامِ اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر

جیسے: مبارکپوری، قاضی اطہر، عرب وہند عہدِ رسالت میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء، ص:55

2۔ مطبوعہ مقالات کا حوالہ:

مقالہ نگار کا لقب / نسبت، اصل نام، ''مقالے کا عنوان''، کتاب، (مرتب)، ناشر، مقامِ اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر

جیسے: اعظمی، محمد عرفات اعجاز، ''ماہنامہ قائد مرادآباد: ایک تعارف''، مشمولہ: تذکرہ سید الملت، (مرتب: ضیاء الحق خیرآبادی)، جمعیۃ علماء الہند، نئی دہلی، 2019، ص:435

3۔ مترجمہ کتب کا حوالہ:

مصنف کا لقب / نسبت، اصل نام، کتاب کا ترجمہ شدہ نام، (مترجم)، ناشر، مقامِ اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر

جیسے: النمر، ڈاکٹر عبدالمنعم، آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، (مترجم: محمد علاء الدین ندوی)، مجلس گیارہ ستارہ انڈیا، کھگڑیا، بہار، 2012ء، ص:77

4۔ مجلّات ورسائل کا حوالہ:

مقالہ نگار کا لقب / نسبت، اصل نام، ''مقالے کا عنوان''، مجلّہ کا نام، تاریخ اشاعت، (مدیر)، ناشر، مقام اشاعت، صفحہ نمبر

جیسے: صدیقی، ظفر احمد، ''قاضی صاحب بحیثیت مورّخ ومصنف''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء، (مدیر: اسیر ادروی)، ریوڑی تالاب، بنارس، ص:68، 69

5۔ اخبار کا حوالہ:

مضمون نگار کا لقب / نسبت، اصل نام، ''مضمون کا عنوان''، اخبار، تاریخ اشاعت، مقام اشاعت، صفحہ نمبر

جیسے: دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب ورسائل''، مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 4 رجب

المرجب1394ھ / مطابق26 جولائی1974ء،ص:2

ابواب بندی(Chapterization)

یہ مقالہ مقدمہ، خاتمہ، کتابیات اور ضمیمہ کے علاوہ مندرجہ ذیل چار ابواب پر مشتمل ہے:

باب اوّل : قاضی اطہر مبارکپوری کے عہد کا سیاسی و سماجی پس منظر

باب دوم : قاضی اطہر مبارکپوری کی سوانح: ایک جائزہ

باب سوم : قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات

باب چہارم: قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ

باب اول قاضی اطہر مبارکپوری کے عہد سے متعلق ہے، اس کے تحت برصغیر کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد مسلمانوں کی معاشرتی و مذہبی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں دینی، علمی اور سیاسی نوعیت کے جن مشہور اداروں، جماعتوں اور تنظیموں کا قیام اس خطہ میں عمل میں آیا، ان کی کارکردگی و نتائج سے بحث کی گئی ہے۔

باب دوم قاضی اطہر مبارکپوری کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔اس باب کے شروع میں ضلع اعظم گڑھ اور قصبہ مبارک پور کی علمی و ثقافتی تاریخ، جغرافیائی حالات اور مصنوعات و پیداوار وغیرہ کا تذکرہ ہے، بعد ازاں قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کے اہم گوشوں یعنی ولادت، نام و نسب، خاندانی پس منظر، تعلیمی مراحل، اساتذہ، نکاح، تدریسی و تصنیفی مشغولیات، صحافتی زندگی، سماجی خدمات اور اخلاق و اطوار وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز علمی لیاقت کی بنا پر انہیں ملنے والے اعزازات کا ذکر بھی اس باب میں شامل ہے، اسی طرح ان اداروں کی فہرست بھی اس میں درج کی گئی ہے جن کی رکنیت انہیں حاصل تھی، غرض یہ کہ اس باب میں پیدائش تا مرگ ان کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں اور واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب سوم علمی خدمات سے متعلق ہے ۔اس باب کے ضمن میں قاضی اطہر مبارکپوری کی جملہ تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد پینتالیس ہے اور موضوع و اشاعت کے لحاظ سے درج ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں:

اول: سب سے پہلے ان کتابوں کا تفصیلی تعارف ہے جو قاضی اطہر مبارکپوری نے عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر لکھی تھیں۔ یہ کل نو کتابیں ہیں اور اپنے موضوع پر بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

دوم: اس قسم میں اٹھارہ ایسی کتابوں اور کتابچوں کا تعارف وتبصرہ ہے جو عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے علاوہ متفرق موضوعات پر ہیں اور مصنف کی زندگی ہی میں شائع ہوچکی تھیں۔ان میں (1) تذکرۂ علمائے مبارک پور (2) دیارِ پورب میں علم اور علماء (3) علیؓ وحسینؓ (4) ائمہ اربعہؒ (5) مآثر ومعارف (6) آثار واخبار (7) خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت ،اور (8) تدوین سیر ومغازی مصنف کی اہم اور مستند کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔

سوم: تیسری قسم میں ان کتابوں سے بحث کی گئی ہے جن پر قاضی اطہر مبارکپوری نے حواشی وتعلیقات لکھے یا ترجمہ کر کے اردو میں انہیں شائع کیا ،اور یہ تعداد میں کل پانچ ہیں یعنی (1) صفاتِ نفس (2) مسلمان (3) دیوانِ احمد (4) **جواھر الاصول فی علم حدیث الرسولؐ** اور (5) **تاریخ اسماء الثقات**۔

چہارم: اس کے بعد وہ کتب اور کتابچے زیرِ تبصرہ ہیں جو قاضی اطہر مبارکپوری کی وفات کے بعد روزنامہ ''انقلاب''، ماہنامہ ''البلاغ'' اور مجلّہ ''معارف'' وغیرہ میں شائع شدہ مقالات ومضامین کو مرتب کر کے شائع کی گئیں۔اس زمرہ میں شامل کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

(1) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں (2) علماءِ اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں (3) قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے (4) مئے طہور (5) ہندوستان میں علمِ حدیث کی اشاعت (6) مکتوبات امام احمد ابن حنبلؒ اور (7) جواہر القرآن۔ان سات کتابوں کے علاوہ مصنف کی ناقص خودنوشت سوانح ''کاروانِ حیات'' اور ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' کا تعارف بھی اسی زمرے میں کرایا گیا ہے۔

پنجم: آخری قسم میں قاضی اطہر مبارکپوری کی ان کتابوں پر تبصرہ ہے جو یا تو ضائع ہوگئیں یا پھر شائع نہ ہوسکیں ،اور اس قسم میں کل چار کتابیں یعنی (1) **خیر الزاد فی شرح بانت سعاد** (2) اصحابِ صفہ (3) مرآت **العلم** اور (4) الصالحات شامل ہیں۔

باب چہارم اس مقالہ کا اہم ترین باب ہے، اس میں قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کو تنقیدی وتجزیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔یہ باب چار اجزاء پر مشتمل ہے، سب سے پہلے قاضی اطہر مبارکپوری کے علمی کاموں کو ان کی اپنی تحریروں کے حوالہ سے تحقیقی وغیر تحقیقی دو حصوں میں تقسیم کر کے اس طریقۂ کار سے بحث کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی تحریروں میں اختیار کیا ہے، اس کے بعد علماء ومحققین نے ان کے جن علمی کاموں پر تنقید کی ہے اس

کا جائزہ لیا گیا ہے، بعدازاں ان تحریروں کو پیش کیا گیا ہے جو اہلِ علم کی طرف سے قاضی اطہر مبارکپوری کے علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف میں لکھی گئیں اور آخر میں تحقیقی کاموں کے نتیجہ میں قاضی اطہر مبارکپوری کو علمی دنیا میں جو اہمیت و وقعت حاصل ہوئی، معاصر علمی شخصیات کے خطوط کے حوالہ سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیشِ نظر مقالہ میں حسب استطاعت قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کا نہ صرف احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ ان کا تجزیاتی اور کسی حد تک تنقیدی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ یہ تحقیقی مقالہ موضوع کی اہم جہتوں کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ مقالہ میں کچھ خامیاں ہوں کیونکہ کوئی بھی تحریر حرفِ آخر نہیں ہوتی اور جب کبھی کوئی طالب علم تحقیقی میدان میں قدم رکھتا ہے اسے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مجھے بھی اس کا تجربہ ہوا، چنانچہ اس راہ میں جو کچھ دشواریاں اور مشکلات آئیں، خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا گیا اور ہر طرح کی کوششیں جاری رکھیں، تا کہ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔

حوالہ جات

(1) مبارکپوری، قاضی اطہر، دیار پورب میں علم اور علماء، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2020ء، ص:83

(2) ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2015ء، ص:113

(3) سہیل، اقبال احمد خاں، کلیات سہیل، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2011ء، ص:243

(4) عبدالقدوس، رہنمائے تحقیق، الہدیٰ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2016ء، ص:208،209

باب اول

قاضی اطہر مبارکپوری کے عہد کا سیاسی وسماجی پس منظر

قاضی اطہر مبارکپوری کے عہد کا سیاسی وسماجی پس منظر

ہر انسان کی شخصی تعمیر وتشکیل میں اس کے معاشرے میں موجود عوامل اثر انداز ہوتے ہیں، خواہ وہ عوامل خارجی ہوں یا داخلی، کسی نہ کسی پہلو سے ضرور اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور کوئی شخص ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بشرطیکہ اس میں معاشرہ سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت ضرور موجود ہو، اگر یہ قابلیت اس میں مفقود ہے تو کیسی ہی اس کی نشوونما ہوئی ہو زمانہ پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اسی طرح کسی بھی ماہر فن کار کے اعلیٰ ترکیبی عناصر کو سمجھنے کے لئے اس کے گردوپیش کے ماحول اور پس منظر کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے اثرات کے نقوش شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ اس میں نظر آتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی فن سے تعلق رکھنے والا شخص اپنے آس پاس کے ماحول سے (خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو مثلاً سیاسی، سماجی، تہذیبی یا تمدنی وغیرہ) اثرات ضرور قبول کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اس سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور بہت کچھ سکھاتا بھی ہے اور جس میں یہ جذبہ نہ ہو تو اس کی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ'' میں لکھتے ہیں:

> ''انسان کی ذہنی اور فکری نشوونما میں ماحول کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق کچھ ماحول سے لیتا ہے اور کچھ اس کو دیتا ہے۔ اس طرح ردّ وقبول، جذب وانجذاب، تقلید و اجتہاد کی خاموش لیکن طویل کشمکش کے بعد اس کی شخصیت کا مرکز متعین ہوتا ہے۔ اس بنا پر کسی انسان کو اس کے ماحول سے ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کبھی بارآور نہیں ہوسکتی۔'' (1)

قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کا بھی ماحول سے گہرا تعلق ہے۔ ان کا عہد 1916ء تا 1996ء پر محیط ہے۔ سیاسی ومعاشرتی اعتبار سے یہ زمانہ ہندوستانی تاریخ میں حیرت انگیز واقعات اور سبق آموز حادثات پر مشتمل ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ذیل کے صفحات میں ہندوستانی مسلم معاشرے کی علمی، دینی، سیاسی اور معاشرتی صورتحال پر اجمالاً روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستانی مسلمان تاریخ کے آئینہ میں

قاضی اطہر مبارکپوری کا تعلق گرچہ بیسویں صدی عیسوی سے ہے مگر ملکِ ہندوستان کی معاشرتی تاریخ میں ان سے ایک صدی قبل تبدیلی رونما ہوچکی تھی جس کا سیدھا اثر ان کی زندگی پر پڑا، اس لئے یہاں اس کا پوراپس منظر انیسویں صدی کے آغاز سے پیش کیا جارہا ہے۔

انیسویں صدی کا ہندوستان اکیسویں صدی (حالیہ) کے ہندوستان سے کافی مختلف تھا، اس زمانہ میں موجودہ پاکستان و بنگلادیش بھی اس کے جغرافیہ کا حصہ تھے، جب کہ آج کل ان تینوں ممالک کے لئے برّصغیر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس زمانہ تک اس ملک کی سیاست کی مرکزی باگ دوڑ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی جس پر وہ پچھلی سات آٹھ صدیوں سے متمکن تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں ان کے اقتدار کا ستارہ گردش میں آیا اور ملک کی سیاسی باگ ڈور برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئی، پھر ان کی استبدادی حکومت کے زیرِ اثر یہاں کی عوام کی حالت ہر لحاظ سے بدتر ہوتی چلی گئی، چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے سب سے زیادہ پریشانی کا سامنا انہیں کو کرنا پڑا۔ بہر حال ان حالات کے تفصیلی تذکرہ سے قبل اس ملک سے مسلمانوں کے تعلقات کس طرح استوار ہوئے، اس کا ایک اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب و ہند کے مابین زمانۂ قدیم ہی سے تجارتی تعلقات استوار تھے اور عرب تاجر ہندوستان اور اس کے قرب و جوار کے ممالک سے خرد و نوش کی اشیاء اور ضروریاتِ زندگی کا دیگر سامان خرید کر لے جایا کرتے تھے۔ (2) جہاں تک ہندوستان سے اسلام کے تعلق کی بات ہے تو تاریخ کی واضح روشنی میں اس کا چرچا عہدِ رسالت ہی میں ہوچکا تھا، البتہ مسلمانوں نے اس ملک کے دروازہ پر خلفائے راشدین کے زمانہ میں شمال مغربی ہند کے راستہ سے دستک دی اور پہلے پہل یہاں کے باشندے اسلامی فوج کے حملوں کی صورت میں ان سے براہ راست متعارف ہوئے۔ (3) لیکن اس ملک میں مسلمانوں کے باضابطہ قیام کی صورت اموی عہد میں اس وقت پیدا ہوئی جب محمد بن قاسم ثقفی عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے حکم کی تعمیل میں 711ء میں درۂ خیبر کے راستہ سندھ (پاکستان) میں وارد ہوئے اور راجہ داہر کو شکست دیکر مسلمانوں کے لئے اس ملک پر حکومت کرنے کا منظم راستہ ہموار کرلیا۔ امویوں کے بعد عباسیوں نے بھی یہاں زور آزمایا اور اپنے عہدِ عروج میں کامیاب حکومت کی، لیکن ان کی حکومت کا شیرازہ بکھرتے ہی ان کے ضعف کی بنا پر دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی ان کا اقتدار کمزور ہوتا چلا گیا، جس سے فائدہ اٹھا کر ان کے بعض جاہ پسند امراء نے اپنی خودمختار حکومتیں اس علاقہ میں قائم کرلیں، مگر ان

میں بھی ثابت قدم رہنے کی سکت نہ تھی اس لئے جلد ہی اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ (جو کہ آج کل پاکستان کہلاتا ہے) پر قریب تین صدیوں تک عرب مسلمانوں کا یہ اقتدار قائم رہا اور اس دوران انہوں نے یہاں کے امراء و حکام اور عوام سے مختلف قسم کے روابط قائم کئے۔ (4)

بعد ازاں غزنی کے حکمراں سلطان محمود غزنوی (م 1030ء) نے 1001ء میں ہندوستان پر اپنا پہلا حملہ کیا اور پھر پے در پے کئی حملوں کے بعد اس ملک کا ایک بڑا حصہ ان کی تحویل میں آ گیا، لیکن اس کی وفات کے بعد یہ علاقہ بتدریج اس کے جانشینوں کے تصرف سے نکل گیا۔ غزنویوں کے بعد غوری حکمراں ان کے جانشین ہوئے۔ اس خاندان کا فرمانروا محمد غوری (م 1206) ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے کے بعد اس نے اپنے ایک غلام سپہ سالار قطب الدین ایبک کو یہاں نائب مقرر کیا اور خود غزنی واپس لوٹ گیا۔ قطب الدین ایبک نے 1193ء میں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو فتح کیا اور محمد غوری کی وفات کے بعد 1206ء میں ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی کہ جس نے مستقبل میں اگلی تین صدیوں تک اس ملک کی سیاست میں مرکزی کردار ادا کیا۔ مؤرخین نے اس کی تعمیر کردہ اس حکومت کو ''عہد سلطنت'' کا نام دیا ہے۔ قطب الدین ایبک کے جانشینوں نے اس کے پیش روؤں کے برخلاف ہندوستان کو اپنا ملک تسلیم کیا اور یہاں ترقی کے وہ تمام اقدامات کئے جن کی بوقت ضرورت حاجت پیش آئی، چنانچہ دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں یادگار کے طور پر آج بھی ان کی عالیشان باقیات موجود ہیں۔

سولہویں صدی کے آغاز میں ''عہد سلطنت'' کا وقت پورا ہو گیا اور اس کی جگہ ہندوستان کے تخت سیاست پر ایک دوسرے حکمراں خاندان کی سیج سجی۔ یہ مغل تھے جو اپنے سے پہلے حکمرانوں سے کسی بھی طرح کم نہ تھے۔ انہوں نے جس حکومت کی داغ بیل ڈالی وہ ان کی نسبت سے ''مغلیہ سلطنت'' کہلائی۔ 1526ء میں ظہیرالدین محمد بابر (م 1530ء) نے ہندوستان میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی، جسے اس کے جانشینوں نے بڑی وسعت و ترقی دی اور ہندوستان کو وہ عزت بخشی جو سابقہ کسی بھی حکومت کی ماتحتی میں اس خطہ کو حاصل نہیں ہوئی۔ اگلی دو صدیوں تک اس سلطنت کا سورج اپنے عروج پر رہا اور پھر آخری طاقتور حکمراں اورنگ زیب عالمگیر (م 1707ء) کی وفات کے ساتھ ہی غروب ہونے لگا۔ عظیم مغلیہ سلطنت اٹھارویں صدی کے نصف اول میں انتشار کا شکار ہو کر زوال پزیر ہو گئی، تخت پر بیٹھنے والے اس وقت کے مغل فرمانروا اپنی طاقت و عظمت کھو بیٹھے اور ان کی سلطنت، جس کے حدود میں کبھی پورا برصغیر شامل تھا، نواحِ دہلی کے چند مربع میل علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی بلکہ اس بچے کھچے حصے پر بھی

1803ء میں انگریزی فوج کا قبضہ ہوگیا اور ذی شان مغل بادشاہ ایک غیر ملکی حکومت کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا۔ بالآخر 1857ء میں اس عظیم سلطنت کے زوال کے بعد ملک پوری طرح برطانوی حکومت کی تحویل میں چلا گیا۔

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط

براعظم یوروپ کا ایک ملک برطانیہ ہے جس کے باشندوں کو 'انگریز'' کہا جاتا ہیں۔ یوروپ کے ساتھ ہندوستان کی تجارت قدیم یونانی عہد میں شروع ہوئی اور عہد وسطی میں بھی اس ملک سے تجارت کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ اس تجارت میں ایشیا سے یوروپ جانے والا سامان کئی ممالک سے ہوکر گزرتا تھا، لیکن سامانِ تجارت پر اصل اجارہ داری عربوں کی تھی اور وہی اس سے زیادہ منافع حاصل کرتے تھے۔ یوں تو ایشیا سے یوروپ جانے والا تجارتی مال مختلف قسم کی اشیاء پر مشتمل ہوتا تھا مگر مغربی دنیا کے لوگ یہاں (ہندوستان اور انڈونیشیاء) کے مسالوں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ سردیوں میں صرف گوشت پر گزر بسر ہونے کے باعث ان لوگوں کو مسالوں کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی، اس لئے ان کے یہاں مشرقی مسالوں کی بڑی مانگ تھی اور وہ اس کے منہ مانگے دام دیتے تھے۔

ترکوں نے 1453ء میں قسطنطنیہ کو فتح کرکے جب ایشیائے کوچک پر قبضہ کیا تو مشرق ومغرب کے مابین ہونے والی تجارت کی شاہراہوں پر ان کا تسلّط ہوگیا، نیز اسی زمانہ میں وینس اور جنیوا کے تاجروں کی اجارہ داری بھی ان راستوں پر قائم ہوگئی۔ ان لوگوں کے اتحاد نے مغربی یوروپ کی نئی قومی ریاستوں خصوصاً اسپین و پرتگال کو اس راستہ سے تجارت میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ چونکہ مغربی ملکوں کی نظر میں ہندوستان اور انڈونیشیا سے ہونے والی تجارت کی بڑی قدر و قیمت تھی جسے وہ لوگ آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اس لئے مغربی عوام اور وہاں کے تاجروں نے وینسی اور عرب تاجروں کی اجارہ داری کو توڑنے اور ترکوں کی مخاصمت سے بچنے کے لئے مشرق سے تجارت کے متبادل راستوں کی تلاش وجستجو شروع کی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں اہل مغرب بالخصوص پرتگالیوں نے جہاز سازی کی صنعت اور فن جہاز رانی میں مہارت حاصل کی اور اپنی حکومتوں کی نگرانی و ہدایات کے تحت اس فن کے استعمال سے بحری سطح پر جغرافیائی انکشافات کے عظیم دور کا آغاز کیا، جس کا مثبت نتیجہ انہیں 1492ء میں کولمبس (م1506ء) کے امریکہ دریافت کرنے سے ملا، حالانکہ اس کا مقصد ہندوستان کا راستہ تلاش کرنا تھا، لیکن اس کی اس عارضی ناکامی کو چھ سال بعد 1498ء میں واسکوڈی گاما (م1524ء) نے اس وقت کامیابی میں بدل دیا جب اس نے افریقہ کا چکر کاٹ کر یوروپ سے ہندوستان تک کا راستہ احمد ابن ماجد (م1500ء) کی مدد سے تلاش کیا۔ (5) اس سفر میں وہ راس

امید ہوتا ہوا کالی کٹ پہنچا اور یہاں سے جو سامان لیکر وہ واپس ہوا اسے مؤرخین کے مطابق سارے اخراجاتِ سفر سے ساٹھ گنا زیادہ قیمت پر فروخت کیا گیا۔(6) جہاز رانی کے اس انکشاف نے اہل مغرب کے لئے ہندوستان اور مغربی ایشیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ براہ راست تجارت کا راستہ ہموار کر دیا۔

واسکو ڈی گاما پرتگال کا باشندہ تھا، کالی کٹ سے واپس ہوتے وقت آئندہ اس ملک سے تجارتی روابط استوار رکھنے کے لئے وہ یہاں اپنی کوٹھی قائم کر گیا، بعد میں تجارت کی غرض سے اس کے ہموطن لوگوں نے دمن، ممبئی اور گوا وغیرہ کے ساحلی علاقوں پر اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ پرتگالیوں سے شہ پا کر یوروپ کے دیگر ممالک کے تاجروں نے بھی سر زمین ہند میں قسمت آزمائی، چنانچہ 1602ء میں ڈچ قوم کے کچھ لوگ ہندوستان آئے اور 1605ء میں وشاکھا پٹنم میں اپنا پہلا تجارتی کارخانہ "ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے قائم کیا، بعد ازاں انہوں نے اس تجارت کو کوچین اور سورت وغیرہ تک وسیع کر لیا۔

یوروپ سے ہندوستان تک کا براہ راست بحری راستہ دریافت ہو جانے کے بعد مغربی ممالک کی اقوام تجارتی مال و دولت کی حرص میں افریقی اور ایشیائی ممالک میں اپنی ساکھ بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئیں۔ مذکورہ دونوں قوموں (پرتگیز اور ڈچ) کے علاوہ اس باہمی جنگ میں فرانسیسی اور برطانوی انگریز بھی پیش پیش تھے۔ فرانس نے بیشتر افریقی ممالک جب کہ برطانیہ نے ایشیائی ملکوں پر اپنے تجارتی اڈے قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ایشیائی ملکوں کی اس فہرست میں ہندوستان بھی شامل تھا۔

1599ء میں ملکہ الیزہ بیتھ اول (م 1603ء) کے ایک فرمان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا، لیکن ہندوستان میں یہ پہلی دفعہ سورت کے مقام پر 1613ء میں بادشاہ جہانگیر کی اجازت سے کیپٹن ولیم ہاکنس (م 1613ء) نے قائم کی۔ اس زمانہ میں مغربی تاجروں اور سپاہیوں کی یہ روش تھی کہ پہلے وہ ایشیائی ملکوں میں داخل ہوتے اور پھر وہاں اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرتے، یہی مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھی تھا، جس کے تحت سورت کے بعد انہوں نے ملک کی دوسری ریاستوں اور شہروں میں اپنی کمپنی کے مراکز قائم کئے اور سترہویں صدی کے اختتام تک پورے ملک کی معیشت پر چھا گئے۔

ابتدا میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت بہت معمولی تھی، 1687ء تک ان کی تجارت کا مرکز سورت تھا، یہاں سے انہوں نے بھڑوچ، احمد آباد، مچھلی پٹنم اور مدراس وغیرہ میں اپنی کوٹھیاں قائم کیں۔ مغربی اور جنوبی سمت میں قدم جمانے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں کا رخ کیا اور 1633ء میں اڑیسہ میں

اپنی پہلی کوٹھی قائم کی، اس کے بعد 1651ء میں جب انہیں بنگال میں ہگلی کے مقام پر تجارت کرنے کی اجازت مل گئی تو وہاں سے ڈھاکہ، پٹنہ اور بہار کے دوسرے علاقوں میں کوٹھیاں قائم کر کے وہاں اپنی تجارت کو وسعت دی۔ مغل دربار میں اب تک ان کی حیثیت سائل کی سی تھی جسے وہ ہمیشہ سے ناپسند کرتے تھے، اس کے بعد وہ تجارت میں خودمختاری حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔

ممبئی اور مدراس میں کمپنی نے جو شاخیں قائم کی تھیں، انہیں خودمختار نوآبادیوں کی حیثیت حاصل تھی، وہاں ان کے اپنے قلعے تھے اور تجارتی اشیاء کی خرید وفروخت میں وہ بالکل آزاد تھے۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی وہ اسی خودمختاری کے نفاذ کے خواہش مند تھے تاکہ ملک کی سیاسی طاقتوں کی پالیسیوں سے آزاد رہ کر ہندوستانیوں سے کم دام پر مال خریدیں اور زیادہ داموں میں انہیں اپنا مال فروخت کرسکیں، لیکن مغل سلطنت کی فوجوں سے میدانِ جنگ میں طاقت آزمائی کئے بغیر یہ ان کے لئے ممکن نہ تھا، اس لئے انہوں نے یہ جوکھم اٹھایا اور 1686ء میں ہگلی کو تخت وتاراج کر کے اورنگ زیب کے خلاف اس وقت جنگ کا اعلان کردیا جب کہ وہ دکن میں مرہٹوں سے نبرد آزما تھا، لیکن یہ لڑائی ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی، کیونکہ اورنگ زیب کے عہد میں مغلیہ سلطنت کی فوج اور اس کا توپ خانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے حقیقت فوج کے مقابلہ میں بہت قوی تھا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں انہیں نہ صرف بنگال سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ سورت، مچھلی پٹنم اور وشاکھاپٹنم میں قائم ان کی کوٹھیاں بھی ضبط کرلی گئیں اور ممبئی کے قلعہ کا محاصرہ کر کے انہیں ملک بدر کردیا گیا۔ بعد میں جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو مراعتیں حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے ایک مرتبہ پھر چاپلوسی اور عاجزی کی روش اختیار کی اور مغل دربار میں حاضر ہوکر اپنی خطاؤں کے درگزر کرنے کی التجا کی جو کہ قبول ہوئی، اس کے بعد 1744ء تک اس امید کے ساتھ تجارت میں مشغول ہوگئے کہ کب حکومت کا شیرازہ بکھرے اور وہ ملک پر اپنا تسلط قائم کریں۔ (7)

انگریزوں کی یہ خواہش 1707ء میں اورنگ زیب کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پوری ہوئی۔ وہ مغلیہ سلطنت کا آخری طاقتور فرمانروا تھا اور پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک اس نے پورے برصغیر پر حکومت کی تھی، اس کی حکمرانی سلطنت مغلیہ کا عہدِ عروج تھا، مگر اس کے بعد ناقابل اور آرام پسند جانشینوں کے سبب سلطنت کا تنزل شروع ہوگیا۔ اس کی موت پر بعد کے مؤرخین نے مغلیہ سلطنت کے زوال کو لیکر بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے اور کچھ تو اس سراغ کی تحقیق وجستجو میں لگ گئے کہ اتنی بڑی سلطنت کیسے ایک عظیم بادشاہ کی وفات پر بعجلت تمام زوال پزیر ہوگئی؟ اس حوالہ سے بیسویں صدی کے ایک مسلم دانشور مولانا سعید احمد اکبرآبادی اپنی کتاب ''مسلمانوں

کا عروج وزوال''میں لکھتے ہیں:

''کس قدر عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسا ہمہ صفت موصوف بادشاہ تقریباً اکیاون سال بکمال دبدبۂ وحشمت ہندوستان کے تخت پر متمکن رہ کر حکومت کرتا ہے لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کی عمارت کو گھن لگ چکا ہے اور اب وہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی۔''(8)

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنتِ مغلیہ اور اس کی سیاسی عمارت کے کھنڈرات پر بہت سی خود مختار و نیم خود مختار ریاستیں تعمیر ہوئیں، ان میں بنگال، حیدرآباد، میسور اور مرہٹہ وغیرہ وہ ریاستیں تھیں جنھوں نے اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں بالادستی حاصل کرنے کی برطانوی کوششوں کا مقابلہ کیا، ان میں سے بعض مغل اقتدار کی حمایت میں اور بعض ان کے خلاف بغاوت کے نتیجہ میں برسر اقتدار آئیں۔ مغلوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ مؤخر الذکر مرہٹہ پیش پیش تھے، اورنگ زیب سے بھی کئی مرتبہ ان کی جھڑپیں ہوئیں، اس کی وفات کے بعد ان کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ مغلوں کے کئی علاقوں پر قابض ہوگئے۔ جس وقت مغل مرہٹہ سرداروں سے برسرِ پیکار تھے، شاہِ ایران نادر شاہ (م 1747ء) نے ادھر کا رخ کیا اور بلا کسی مزاحمت کے ہندوستان میں داخل ہوکر 1739ء میں کرنال کے مقام پر مغل حکمران محمد شاہ (م 1748ء) کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کرکے تمام شاہی خزانہ (جس میں مشہور عالم کوہ نور ہیرا اور جواہرات سے مرصع شاہجہاں کا تخت طاؤس بھی شامل تھا) لوٹ کر ایران لے گیا۔ نادر شاہ کے بعد اس کے ایک بہادر سپہ سالار احمد شاہ ابدالی (م 1773ء) نے ہندوستان پر پے در پے حملوں کا سلسلہ شروع کیا اور سندھ و پنجاب کے جن علاقوں پر سکھوں کا قبضہ تھا ان پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا، لیکن اسے شہرت 1761ء میں اس وقت ملی، جب اس نے مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست دیکر ان کی اس آرزو کو خاک میں ملا دیا کہ مغلوں کو قابو میں کرکے وہ ملک پر چھا جائیں گے۔ بہر حال خانہ جنگی کی یہ کیفیت پورے ملک میں قائم تھی جس کا پوری مستعدی کے ساتھ انگریز مشاہدہ کر رہے تھے تاکہ وقت آنے پر اپنا پاسہ پھینک سکیں۔

اس دوسری مرتبہ بھی انگریزوں نے ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کی ابتدا بنگال ہی سے کی اور مرشد آباد سے بیس میل کے فاصلہ پر پلاسی میدانِ جنگ بنا، جہاں 1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے نواب سراج الدولہ (م 1757ء) کو شکست دیکر اپنی استعماری حکومت کا آغاز کیا۔ اس سلسلہ کی دوسری جنگ 1764ء میں

بکسر کے میدان میں ہوئی جس میں انگریزوں نے بنگال کے نواب میر قاسم (م 1777ء)، نواب اودھ شجاع الدولہ (م 1775ء) اور شاہ عالم ثانی (م 1806ء) کی اتحادی افواج کو شکست دی۔ ہندوستانی تاریخ کی یہ انتہائی فیصلہ کن جنگ تھی، کیونکہ اس نے ملکی طاقتوں کی متحدہ فوج پر برطانوی فوج کی برتری ثابت کردی تھی، نیز اس فتح نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا حکمراں بنا دیا تھا اور اودھ بھی ان کے رحم وکرم پر تھا بلکہ میسور کے حیدر علی کے علاوہ تمام چھوٹی بڑی حکومتوں نے ہندوستان پر ان کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ میسور کے فرمانروا حیدر علی نے پے در پے انگریزوں اور مرہٹوں کو شکستیں دیکر ان کے دانت کھٹے کئے اور اسی حالت میں 1782ء میں وہ فوت ہوا، اس کے جانشین ٹیپو سلطان نے 1799ء (انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہونے کے وقت تک) تک میسور پر حکمرانی کی۔ یہ ایک جدت پسند اور بڑی پہلودار شخصیت کا مالک تھا، اس تنہا شخص کی شہادت سے پورا برصغیر انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔

انیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے پورے ہندوستان پر انگریز قابض ہوگئے اور آئندہ ڈیڑھ سو سال تک بنگال کے علاوہ پورے ملک پر انھیں کا سکہ چلا، جبکہ بنگال دو سو سال تک ان کی تحویل میں رہا۔ برطانوی عہد میں ملک کا سیاسی اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر اعلیٰ کے ہاتھ میں تھا جس کا تقرر براہ راست برطانوی پارلیمینٹ سے ہوتا تھا اور وہ ''گورنر جنرل آف بنگال'' کہلاتا تھا، کیونکہ ابتدا میں ان کا پایہ تخت بنگال تھا۔ 1828ء میں اس کے سربراہ کا لقب ''گورنر جنرل آف انڈیا'' ہوگیا اور پھر 1856ء سے 1947ء تک ''وائسرائے آف انڈیا'' کہلایا۔ وائسرائے آف انڈیا کے عہدے سے قبل ملک کی سیاست میں کمپنی کا پورا دخل تھا جسے بعد میں برطانوی پارلیمنٹ نے منسوخ کردیا۔ اس پورے استعماری عہد میں 8 گورنر جنرل آف بنگال، 6 گورنر جنرل آف انڈیا اور 20 وائسرائے آف انڈیا ملک کی سیاسی کرسی پر متمکن ہوئے۔ ان میں سے کئی ایک نے اپنے دور اقتدار میں برطانیہ کے فائدے اور نقصانات کے پیش نظر ملک میں متعدد قوانین نافذ کئے، البتہ بعض نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں بھی حصہ لیا۔

برطانوی عہد میں ہندوستان کے

سیاسی حالات

ہندوستان کی وسیع سلطنت حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے حکومت اور نظم و نسق کے مناسب اصول وضع کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ 1757ء سے 1857ء تک کی طویل مدت کے دوران کمپنی کی انتظامی پالیسیوں میں اکثر تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں، لیکن دو مقاصد اس نے نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیئے، اول کمپنی کے منافع میں اضافہ اور دوم برطانیہ کے لئے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات کی افادیت میں ترقی ۔(9) ان دونوں مقاصد کو باقی تمام مقاصد پر فوقیت حاصل رہی، حکومت ہند کا جوڑ ھانچہ بنایا گیا اور جس طرح اسے چلایا گیا وہ بھی انھیں دونوں مقاصد کے تابع تھا، چنانچہ اپنے پورے دورِ اقتدار میں انگریزوں نے بر صغیر کے نظم وضبط کے لئے سیاسی، سماجی، علمی اور ثقافتی قسم کی متعدد پالیسیاں اپنائیں، بظاہر یہ پالیسیاں ملک اور اس کے باشندوں کے فروغ کے لئے نفع بخش معلوم دیتی تھیں مگر ان کے پس پشت صرف اور صرف برطانیہ اور اس کے باشندوں کی افادیت ہی کارفرماں تھی، مثل مشہور ہے کہ ''ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، اور کھانے کے اور ہوتے ہیں''، ہندوستان میں انگریزوں کا اپنی رعایا (جو ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی) کے ساتھ جو مثبت و منفی رویّہ تھا وہ پوری طرح اسی مثال پر مبنی تھا، البتہ اس ملک پر حکومت کے دوران انہوں نے ایسے امور بھی انجام دیئے جو قابلِ ستائش ہیں اور وہ ان پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

انگریزوں نے جو پالیسی اس ملک میں اختیار کی تھی، ان سے جاگیردار، زمیندار، امراء اور سرکاری عہدوں پر فائز ملازموں کا ایک بڑا طبقہ تو متفق ہو کر اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اکثریت پر مشتمل غریب اور ناخواندہ طبقہ (جن میں کسان، صنعت کار اور مزدور وغیرہ شامل تھے) کے حقوق پامال ہو رہے تھے اور حکومت کی جانب سے کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا، ان میں بھی بدحالی کا شکار سب سے زیادہ مسلمان تھے کیونکہ انھیں کو شکست دیکر انگریز ہندوستان کی سیاست پر قابض ہوئے تھے اور انہیں اندیشہ تھا کہ یہ ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں گے، جیسا کہ وقتاً فوقتاً بعد میں کئی مرتبہ دیکھنے میں آیا بھی، لہٰذا انہوں نے ان کی ترقی کے سبھی راستے بند کر دیئے۔ حکومت کی عائد کردہ ان پالیسیوں کے اثر سے ہندوستانیوں میں سراسیمی کا ماحول پیدا ہو گیا اور وہ ان سے بدظن ہو گئے، اس

کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر ظالم حکومت کے خلاف مظلوم عوام کی باضمیر اور قوم کے دردمند لوگوں کی قیادت میں ہندوستان کے الگ الگ خطوں میں بغاوتیں برپا ہوئیں، جن کی کامیابی کے لئے باضابطہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور علمی تحریکات چلائی گئیں۔ اس سلسلہ کی چند مشہور تحریکات ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں۔

1857ء کا انقلاب

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان مخالف پالیسیوں نے ایک صدی (1757ء تا 1857ء) میں ملک کے سبھی طبقوں میں بے اطمینانی پیدا کردی تھی، جن کے سبب ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً اس کے خلاف شورشیں برپا ہوئیں، مگر کمپنی کی فوج نے بزور اسلحہ ان پر قابو پالیا۔ اسی قسم کی ایک بڑی شورش بغاوت کی شکل میں 1857ء میں ہندوستان کے شمالی و وسطی علاقہ میں برپا ہوئی، جس نے برطانوی حکومت کا تقریباً خاتمہ ہی کردیا۔ اس شورش کا آغاز کمپنی کی فوج میں شامل بعض ہندوستانی سپاہیوں کے غدر سے ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے خطے کے باشندوں کو اپنی چپیٹ میں لے لیا، لاکھوں کسانوں، دستکاروں اور سپاہیوں نے ایک سال سے زائد عرصہ تک بہادری سے لڑکر ہندوستانی عوام کی تاریخ میں ایک زرّیں باب کا اضافہ کیا۔ (10) جدید ہندوستان کی تاریخ میں باغیوں اور محبین وطن نے اسے ''پہلی جنگِ آزادی'' کا نام دیا، جبکہ حکومت اور ان کے طرف داروں نے اسے ''1857ء کی بغاوت'' کہا۔

1857ء کا یہ انقلاب صرف سپاہیوں کی بے اطمینانی کا مظہر نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ کمپنی کی اجارہ داری کے خلاف عوام کی شکایات کا ایک انبار جمع ہوگیا تھا اور لوگ اس غیر ملکی حکومت سے نفرت کرنے لگے تھے۔ انگریز طویل مدت سے ملک کے مختلف خطوں کو ایک ایک کرکے ہضم کرتے جارہے تھے، جس کے سبب ہندوستانیوں میں ان سے نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ یہی بے اطمینانی تھی جس نے اس عظیم انقلاب کی شکل اختیار کی۔

مؤرخین نے اس انقلاب کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں، جن میں غالباً سب سے بڑا سبب انگریزوں کے ہاتھوں ملک کا معاشی استحصال اور اس کے روایتی معاشی ڈھانچے کا بیٹھ جانا تھا۔ ان دونوں عوامل نے کسانوں، دستکاروں، صناعوں، زمینداروں اور سرداروں کی کثیر تعداد کو مفلوک الحال بنادیا تھا، اس کے علاوہ نچلی سطح پر انتظامیہ کی رشوت ستانی کے دور دورے نے عوام کو پریشان کر رکھا تھا۔ (11) نیز حکومت کی یک طرفہ غیر ملکی پالیسی کے باعث ہندوستان کی عوام میں ان کے لئے مقبولیت گھٹتی جارہی تھی، کیونکہ وہ لوگ اس ملک کو کبھی اپنا ملک نہیں سمجھتے تھے اور نہ یہاں کی عوام سے کسی قسم کا سماجی رشتہ یا میل جول رکھتے تھے، سابقہ فاتحین کے برعکس بالائی طبقے کے

ہندوستانیوں سے بھی ان کا کوئی ربط وضبط نہیں تھا بلکہ نسلی تفاخر کے احساس میں وہ ملوث تھے اور ہندوستانیوں کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ سے پیش آتے تھے۔ اس حوالہ سے سرسید احمد خاں نے ''اسباب بغاوتِ ہند'' میں لکھا ہے:

> ''ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یوروپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یوروپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے، یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے۔'' (12)

علاوہ ازیں ایک بڑا اور اہم سبب یہ بھی تھا کہ انگریز کبھی بھی ہندوستان میں بسنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے پیش نظر صرف یہاں کی دولت تھی جسے وہ انگلستان منتقل کرتے تھے۔ ہندوستانی بھی ان کے اس غیر ملکی کردار کو بہ خوبی سمجھتے تھے، جس کے باعث ان میں غیر محسوس طور پر ان سے دشمنی کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا اور اس کا اظہار انقلاب سے پہلے وہ کئی شورشوں میں کر چکے تھے۔ بہر حال یہ اور ان جیسے دیگر اسباب (جو حکومت کی جارحانہ اور عدم انصاف کاروائیوں پر مبنی انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں مثلاً سیاسی، مذہبی اور اقتصادی وغیرہ میں پنپ رہے تھے) نے حکومت کے خلاف ایک بڑی مہم کا سامان مہیا کر دیا، اب اسے آگ دینے کے لئے ایک چنگاری کی ضرورت تھی جو 1857ء میں فوج کی ایک ٹکری کی بغاوت سے حاصل ہوئی۔

10 مئی 1857ء کو دہلی سے 36 میل کے فاصلہ پر میرٹھ میں بغاوت کی شکل میں اس انقلاب کا آغاز ہوا اور اس کی وجہ جدید قسم کی ایک رائفل بنی جس میں استعمال ہونے والی کارتوس میں گائے یا سور کی چربی سے تیار شدہ کاغذ کی جھلی لگی ہوئی تھی اور دانتوں سے اسے ہٹایا جاتا تھا۔ اس فعل نے فوج میں بھرتی ہندو اور مسلم سپاہیوں کے مذہبی جذبات مجروح کئے، لہٰذا 24 اپریل کو فوج کے 90 شہ سواروں نے چربی چڑھے کارسوتوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا، جس کی پاداش میں انہیں 9 مئی کو دس سال کی سزا سنائی گئی۔ اس واقعہ نے میرٹھ میں متعین دوسرے سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ انہوں نے اگلے روز اپنے افسروں کو قتل کر کے مقید ساتھیوں کو آزاد کرایا اور علمِ بغاوت بلند کر کے شام کے وقت دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ دوسرے دن صبح تڑکے جب یہ باغی سپاہی دہلی پہنچے تو وہاں کی مقامی فوج بھی ان کے ساتھ ہوگئیں اور شہر پر قبضہ کرلیا، ساتھ ہی سلطنت مغلیہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کو اس کی ضعیف العمری کے باوجود ''شہنشاہ ہند'' کا لقب دیکر اس انقلاب کا مرکزی کردار بنا دیا۔ بہادر شاہ ظفر کے قیادت سنبھالتے ہی انقلاب کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ شمالی ہند کا پورا علاقہ اس کی زد میں آ گیا۔ ویسے تو اس پورے علاقہ میں فوج اور مقامی عوام نے حکومت کے خلاف انقلاب میں حصہ لیا، مگر بریلی میں بخت

خاں اور خان بہادر خان، کانپور میں نانا صاحب، اودھ میں بیگم حضرت محل، جھانسی میں رانی لکشمی بائی، گوالیار میں تانتیا ٹوپے اور آرہ میں کنور سنگھ نے بغاوت کو مرکزی کردار ادا کیا۔ جنگ میں انقلابیوں کی سب سے اہم خوبی رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق کئے بغیر انگریزوں کے خلاف اتحاد تھا جو استعماری دور میں اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔

ابتدا میں یہ بغاوت انقلابیوں کے حق میں بہت کامیاب ثابت ہوئی، اس میں انہوں نے انگریزوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور بیشتر علاقے ان سے چھین لئے، مگر پوری طرح ان پر فتح پانے میں ناکام رہے، البتہ بعد میں موقع پاتے ہی انگریز حرکت میں آئے اور اپنی وفادار منظّم فوج کے ذریعہ دو سال کی قلیل مدت میں پے در پے ان بغاوتوں کو کچل دیا۔ انقلابیوں کو پہلا دھکا 20 ستمبر 1857ء کو دہلی میں لگا جب ایک طویل اور شدید جنگ کے بعد انگریزوں نے شہر پر قبضہ کرلیا، ہمایوں کے مقبرہ سے بہادر شاہ کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا اور اس کی پاداش میں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا، جہاں پانچ سال بعد 1862ء میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کے بعد دوسرے رہنماؤں کا حشر بھی کچھ ایسا ہی ہوا، انہوں نے جنگ میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا یا پڑوسی ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، حتیٰ کہ 1859ء تک انگریزوں نے بغاوت پر پوری طرح قابو پالیا۔ بعد ازاں انہوں نے انقلابیوں پر بڑے ظلم ڈھائے اور سخت سزائے دیں۔ انقلابیوں پر ان کے مظالم کی روداد لارڈ الفسٹن نامی انگریز نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''محاصرہ ختم ہو جانے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں، انھیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے دوست دشمن کی تمیز کئے بغیر سب سے یکساں بدلہ لیا گیا، لوٹ میں تو ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے تھے۔''(13)

انقلابیوں کی فتح کے شکست میں تبدیل ہونے کی متعدد وجوہ تھیں، جن میں سب سے اہم وجہ ان کا ہر اس قسم کے نظم و نسق سے عاری ہونا تھا جس کی اس طرح کے انقلاب میں سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ کم تعداد والی منظّم فوج اپنے سے کئی گنا زیادہ منتشر فوج پر غالب آئی ہے۔ ان کے برعکس ان کا دشمن پورے انتظام کے ساتھ میدان میں اترا تھا، چنانچہ ایسے قوی دشمن کے مقابلے میں جو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہو، صرف ہمت (جس کا گرچہ انگریزوں میں فقدان تھا) ہی کے بل پر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔

تاہم یہ انقلاب بے فائدہ نہیں رہا بلکہ جدید ہندوستان کی تاریخ میں اسے ایک شاندار سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے جو قدیم طریقوں سے روایتی قیادت کے تحت جان پر کھیل کر اس ملک کو آزاد کرانے کی پہلی عظیم کوشش تھی۔ 1857ء کی اس قوم پرستانہ اور بہادرانہ جدوجہد نے آئندہ جدید قومی تحریکات کے لئے راہ ہموار کی، نیز یہاں کی

عوام کے ذہنوں پر ناقابل فراموش نقوش چھوڑے۔ گھر گھر انقلابی سورماؤں کے گن گائے جانے لگے، حالانکہ ان کا نام لینا بھی حکمرانوں کے نزدیک ارتکاب جرم تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس

1857ء کے انقلاب کے بعد برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ (م 1901ء) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی سیاست سے برطرف کر کے براہ راست انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اگلی چھ دہائیوں تک یہاں کے سیاسی اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں مرکوز رہے، نتیجتاً سارے ملک میں ایک بار پھر نظم وضبط قائم ہوگیا، ملک اور بیرون ملک کے رسل ورسائل میں بہتری آئی اور برطانوی تجارت کو وسعت ملی۔

بغاوت کی ناکامی کے نتیجہ میں حکومت کی جانب سے انقلابیوں (خصوصاً مسلمان) پر مظالم توڑے جانے کے بعد ملک میں کچھ عرصہ تک ناامیدی، خوف، پژمردگی اور گھٹن چھائی رہی، حکومت کو بھی اس کا احساس تھا اس لئے عوام سے اب وہ کوشاں ہوگئی، نیز اپنی بقا اور ملک پر طویل عرصہ تک اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے اس نے کچھ تدابیر بھی اختیار کیں، جن کے تحت اس نے ملک کے الگ الگ حصوں میں بہت سی علاقائی انجمنیں مثلاً بمبئی ایسوسی ایشین، مدراس ایسوسی ایشن، الہ آباد پیپلس ایسوسی ایشن وغیرہ اس مقصد سے قائم کیں کہ ان کے توسط سے ہندوستانی عوام کے انفرادی واجتماعی مسائل سے اسے واقفیت حاصل ہو، لیکن ان میں سے کوئی انجمن یا تنظیم ملکی سطح پر قومی کردار کی حامل نہیں تھی، چنانچہ اس ارادہ کی تکمیل کے لئے 1885ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن (م 1902ء) کے ایماء پر مسٹر ایلن آکٹیوین ہیوم نے جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی رہنماؤں پر مشتمل ایک جماعت تشکیل دی اور ان کے توسط سے ''انڈین نیشنل کانگریس'' کی بنیاد رکھی۔ (14)

اس انجمن کا پہلا اجلاس 28 تا 30 دسمبر 1885ء کو بیرسٹر ومیش چند بنرجی کی صدارت میں گوکل داس کالج ممبئی میں منعقد ہوا، جس میں نسلی اور مذہبی تفریق کئے بغیر 72 مندوبین نے شرکت کی، ان میں دادا بھائی نوروجی، ایس سبرامنیم آئیر، رحمت اللہ سیانی اور فیروز شاہ مہتہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد میں سال درسال اس کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے ان افراد کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو مغربی تعلیم سے بہرہ مند اور پیشہ کے اعتبار سے وکیل، صحافی، تاجر، اساتذہ اور زمیندار تھے۔ (15) ہندوستانیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے فروغ، علاقائی، نسلی اور مذہبی اختلافات سے قطع نظر قومی اتحاد کے ارتقاء، ملکی مسائل پر تعلیم یافتہ طبقوں کی رایوں کا علم اور قومی مفاد سے متعلق آئندہ لائحہ عمل کا تعین وغیرہ نکات اس انجمن

کے مقاصد شمار کیے گئے۔ پہلے اجلاس میں انجمن نے حکومت سے جو مطالبات پیش کیے وہ درج ذیل ہیں:

1۔ ہندوستانی معاملات میں تحقیقات کرنے کی غرض سے ایک رائل کمیشن کا تقرر کرے جس میں خاصی تعداد ہندوستانی نمائندوں کی ہو۔

2۔ وزیر ہند کی انڈیا کونسل کو ختم کر دیا جائے۔

3۔ برما کے الحاق کو رد کر دیا جائے۔

4۔ مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی ہو۔

5۔ انڈین سول سروس کے امتحانات برطانیہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ہوں اور فوجی اخراجات میں کمی کی جائے۔

آگے چل کر کم و بیش یہی مطالبات کانگریس کے تقریباً ہر اجلاس (جو سال میں ایک مرتبہ ملک کے الگ الگ شہروں میں منعقد ہوتا تھا) میں دہرائے گئے۔ اپنے ابتدائی دور میں انڈین نیشنل کانگریس کا یہ کارواں اعتدال پسندی کے ساتھ ایک قومی جماعت اور سیکولر انجمن کی حیثیت سے آگے بڑھتا رہا۔ یہ سلسلہ 1905ء تک قائم رہا اور اس جماعت کی تاریخ میں ''اعتدال پسندوں کے عہد'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس عرصہ میں انجمن نے حکومت کے ساتھ معاون دوست کا کردار ادا کیا، کیونکہ اس کے اراکین کو حکومت کی انصاف پسندی پر پورا اعتماد تھا، جس کا اظہار اس کے ممبران اپنے اجلاس میں ان کی تعریف کر کے کیا کرتے تھے۔ ایک مصری عالم اور محقق ڈاکٹر عبدالمنعم النمر، جو بعد میں کئی سال ہندوستان میں مقیم رہے، اس کی تائید میں لکھتے ہیں:

> ''1885ء میں جب بمبئی میں پہلی بار کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو اس کے لیڈروں میں سے ایک مسٹر بنرجی نے یہ اعلان کیا: ''برطانیہ نے بہت سے کام ہندوستان کی بھلائی اور اس کی اچھائی کے لئے کیے ہیں''۔ نظم و نسق قائم کرنے، مواصلات کا نظام بہتر بنانے اور ملک میں مغربی تعلیم کے نفاذ پر انہوں نے تحسین و آفرین کے مبالغہ آمیز کلمات کہے۔ کانگریس کے ایک اور لیڈر مسٹر گوپال کرشن گوکھلے نے بھی صاف لفظوں میں کہا: ''ہندوستان کے لئے بھلائی اسی میں ہے کہ وہ انگریز حکومت سے ہمیشہ منسلک رہے۔'' (16)

ساتھ ہی انہوں نے اپنے مطالبات کو قراردادوں کی شکل میں حکومت کے سامنے پیش کیا، نیز مزید تشہیر کے لئے انگلستان میں 1889ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی برٹش کمیٹی قائم کر کے اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں کامیابی حاصل کی اور آئندہ سال اس کمیٹی کے ترجمان ''انڈیا'' کا اجرا کیا۔ (17)

حکومت سے تعلقات استوار کرنے کے علاوہ کانگریس نے ملک کے باشندوں سے بھی روابط قائم کئے، چنانچہ ہندوستانیوں کے دلوں میں قومی جذبات پیدا کر کے انہیں قوم پرور سیاست سے واقف کرایا، ان کی سیاسی تربیت کی، سیاسی احتجاج کے ڈھنگ بتائے، غرض یہ کہ مذہب، علاقہ اور ذات پات کے محدود نظریہ کی حمایت سے نکال کر ملکی سطح پر کام کرنے کے لئے انہیں ایک ہندوستانی قوم بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس ابتدائی دور میں کانگریس نے حکومت کے سامنے وہ تمام مطالبات پیش کئے جو ملک کی ترقی اور اس کے مفاد کے لئے ضروری تھے، ساتھ ہی ان کے نفاذ کے لئے آئینی احتجاج کا راستہ اپنایا۔ انہیں حکومت سے امید تھی کہ وہ ان کے مطالبات تسلیم کر لے، لیکن حکومت نے ان کی طرف قابل لحاظ توجہ نہیں دی اور چند غیر اطمینان بخش قوانین پاس کر کے اپنا پلّو سیدھا کر لیا۔

حکومت نے کانگریس کی بنیاد در اصل اپنے مفادات کی تکمیل اور ملک میں سیاست کو تقویت دینے کے لئے رکھی تھی، لیکن جلد ہی اسے کانگریسی ممبران کے طرزِ عمل سے اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا اس لئے تین سال کے بعد ہی اس کی حمایت سے دست بردار ہو گئی، نیز اس کی جانب سے اس کی مخالفت میں ہر وہ فعل سرزد ہوا جس کی ایک تاناشاہی حکومت سے امید کی جاسکتی ہے۔ کانگریس مخالف اور ملک دشمن حکومت کے ان اقدامات سے انجمن کے رہنماؤں کے طرز عمل اور انداز فکر میں تبدیلی آئی، جس کی بنا پر انہوں نے یہ نتائج اخذ کئے کہ محض اپیلوں، عرضداشتوں، قراردادوں اور اجلاسوں ہی سے کام نہیں چلے گا، اس کے لئے منظّم کوشش اور تحریک کی ضرورت ہے، چنانچہ انہوں نے کانگریس کے دائرہ کو متوسط طبقوں اور عوام کی رسائی تک وسیع کیا، نیز 1905ء میں اس کے ممبران نے ہندوستان میں خود مختار حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا اور اگلے سال 1906ء میں اس کے ایک اہم رکن دادا بھائی نوروجی نے حصولِ آزادی کو کانگریس کا نصب العین قرار دیا۔ (18)

حکومت کے خلاف احتجاج کا سبب بھی خود حکومت ہی تھی کیونکہ جن ہندوستانیوں کا اس نے کانگریس میں انتخاب کیا تھا انہوں نے ملک میں اس کے زیرِ اثر کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی تکمیل انگلستان کے اداروں میں کی تھی، جہاں اس ملک اور دیگر مغربی ممالک میں جاری دستوری امور سے واقفیت کے بعد انہیں وہاں انگریزوں کے طرز حکومت اور ہندوستان میں ان کے ظلم وستم اور ناانصافیوں کا موازنہ کرنے کا موقع فراہم ہوا، جسے یہ تعلیم یافتہ نوجوان ضبط میں نہ لا سکے اور انگریزی ثقافت سے ان کا اعتماد کم ہوتا چلا گیا۔ (19)

1905ء کے بعد کانگریس انتہا پسند جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی، اب اس نے ملک مخالف حکومت کی ہر پالیسی پر علی الاعلان احتجاج کیا۔ اس وقت تک کانگریس ملک کی مقبول ترین جماعت بن چکی تھی،

اس لئے حکومت کے لئے اسے یک سر ختم کرنا مشکل تھا، لہٰذا اس نے اپنی قدیم ترین پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا استعمال کیا، جس کے تحت وائسرائے لارڈ کرزن (م 1925ء) نے 1905ء میں مذہبی بنیاد پر صوبۂ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بعد ازاں اس کے جانشین لارڈ منٹو نے اسی طرز کو اپناتے ہوئے کانگریس کے بالمقابل ہندوستانی مسلمانوں پر مشتمل ''مسلم لیگ'' کو لا کھڑا کیا اور اس طرح اس نے برصغیر کی سیاست کو ایک نیا رخ دیا، جس کا پہیہ آئندہ نصف صدی تک انہی دونوں جماعتوں کے گرد گھومتا رہا۔

مسلم لیگ

حکومت کے خلاف کانگریس کے لائحہ عمل میں سختی اور روز بروز ملک کے باشندوں میں اس کی مقبولیت میں اضافہ کے سبب انگریزوں کو اپنی مسند اقتدار کے زوال پزیر ہونے کا خطرہ لاحق ہونے لگا، چناچہ اس کے سد باب کے لئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی۔ اس پالیسی کے تحت وائسرائے لارڈ کرزن نے 1905ء میں صوبۂ بنگال کو مذہبی بنیاد پر آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، کانگریس نے حکومت کے اس اقدام کو غلط ٹھہراتے ہوئے ملک گیر پیمانہ پر اس کے خلاف شدید احتجاج کیا اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک مثال قائم کی۔ جب حکومت کا یہ سیاسی حربہ کمزور پڑ گیا تو وائسرائے لارڈ منٹو نے 1906ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے پرنسپل مسٹر مارسن کے توسط سے کانگریس سے نالاں مسلم زعماء کے سامنے اپنی آزاد انجمن تشکیل دینے کی تجویز پیش کی، تاکہ وہ مسلمانانِ ہند کے مطالبات عرضداشتوں کی شکل میں حکومت کے سامنے پیش کریں اور قوم کی سیاسی حیثیت کو برقرار رکھنے کی جدو جہد میں حصہ لیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حکومت کے مذکورہ بالا نظریات سے متفق مسلم رہنماؤں نے 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہونے والی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر نواب وقار الملک کی صدارت میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کی بنیاد رکھی۔ (20) اور درج ذیل نکات کو اس کے مقاصد میں شامل کیا:

1۔ مسلمانوں اور استعمار کے نقطہ ہائے نظر کو ایک دوسرے سے قریب کرنا اور اس بدسلوکی کا ازالہ کرنا جو اس سے پہلے جاری تھی، تاکہ مسلمان اپنے حقوق کو حاصل کر سکیں۔

2۔ دوسری قوموں کے معاند نہ ہونا بلکہ ان سے محبت کرنا اور بہتر طور پر آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنا۔

3۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا، انہیں آگے بڑھانا اور ان کی ضروریات وتمناؤں کو ادب واحترام کے ساتھ حکومت کی خدمت میں پیش کرنا۔ (21)

کانگریس کی طرح مسلم لیگ بھی انگریزوں کے زیرِ سایہ وجود میں آئی ۔ ابتدائی دور میں اس نے ملکی سیاست میں سابقہ پارٹی کے حریف کا کردار ادا کیا اور نتیجتاً نظریاتی طور پر ہندوستان کے باشندوں کو ہندو مسلم دو علیحدہ اقوام میں تقسیم کر دیا۔ خود مسلمانوں پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا اور وہ کانگریسی و لیگی کہلائے۔ کانگریس کے مسلم لیڈران میں مسلمانوں کے مذہبی ادارہ دار العلوم دیوبند کے علماء بھی شامل تھے، ہندوستانی مسلمانوں پر لیگی رہنماؤں کے بالمقابل ان کے اثرات زیادہ مرتب ہوئے۔ ان علماء، قوم پرور مسلم رہنماؤں اور کانگریس کے دیگر غیر مسلم لیڈران نے مسلم لیگ کی پر جوش مخالفت کی، ساتھ ہی اس کی پالیسیوں پر کھل کر تنقیدیں کی، اس مخالفت میں ممبئی کے بیرسٹر محمد علی جناح نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس وقت وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اور کانگریسی تھے اور اس سے قبل تقسیم بنگال کی مخالفت میں بھی انہوں نے سخت موقف اختیار کیا تھا، جس کے عوض میں قوم نے انہیں ''سفیر اتحاد'' کے لقب سے نوازا تھا، نیز اتحاد کی راہ میں ان کی مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے ہندوؤں نے اسی خطاب سے موسوم ممبئی میں ایک ہال تعمیر کر کے اس کے سنگِ بنیاد پر یہ تحریر کندہ کی تھی:

> ''مسٹر جناح کے اعزاز میں ان کی ہمیشہ باقی رہنے والی خدمات کے اعتراف میں جو انہوں نے ہندوستان کے مسائل کے سلسلہ میں انجام دیں۔'' (22)

مگر کسے معلوم تھا کہ تقسیم بنگال اور مسلم لیگ کا یہ سب سے بڑا مخالف چار دہائیوں کے بعد لیگ کے صدر کی حیثیت سے تقسیم ہند کا سب سے بڑا حامی ہوگا، حالانکہ کانگریس نے بھی اس سمت میں غیر معمولی رول ادا کیا تھا۔ بہر حال محمد علی جناح کے علاوہ بعض مسلم رہنماؤں نے اپنے اخبارات کے صفحات پر مسلم لیگ اور اس کی پالیسیوں پر تنقیدیں کیں۔ (23) اس کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد ان لوگوں نے بھی جن کا شمار لیگ کے بانیوں میں تھا مثلاً حکیم اجمل خاں اور حسن امام وغیرہ نے اس کی پالیسیوں سے اختلاف کیا۔ اس خارجی اور داخلی مخالفت نے مسلم لیگ کے اراکین کو کانگریس مخالف روش تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں اس تبدیلی کی ایک اہم وجہ اس دور میں رونما ہونے والے بعض وہ واقعات بھی ہیں جن سے مسلمانانِ ہند میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا تھا، مثلاً 1911ء میں تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کا فیصلہ، 1912ء کی جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس، علاوہ ازیں 1913ء میں کانپور کی مچھلی والا بازار کی مسجد کے انہدام کے واقعات اس کڑی کا حصہ ہیں۔ اس سیاسی ماحول نے انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں قرابت پیدا کی اور دونوں ہی تنظیموں کے ممبران نے محسوس کیا کہ باہمی اتحاد و تعاون ہی سے انگریزوں کو ملک بدر کر کے آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس

اتحاد کی شروعات 1916ء میں لکھنؤ میں ہوئی جہاں دونوں تنظیموں کا اجتماعی اجلاس ہوا اور ''میثاق لکھنؤ'' کے نام سے کچھ قراردادیں اس سلسلہ میں طے ہوئیں، مگر چند سالوں کے بعد یہ اتحاد ان تنگ نظر اور متعصب رہنماؤں کے باعث کمزور پڑ گیا جو ہر دو جانب کارفرماں تھے، لہٰذا ایک مرتبہ پھر دونوں کے مابین فسادات شروع ہوگئے اور انگریزوں سے مکمل آزادی کا جذبہ پس پشت رہ گیا۔ بالآخر اس کا نتیجہ اگست 1947ء میں تقسیم ہندوستان اور قیامِ پاکستان کی شکل میں سامنے آیا۔(24)

انیسویں صدی کے نصف اول میں برطانوی حکومت کے بعد ملک کی سیاست میں ان دونوں تنظیموں کا مرکزی کردار رہا، مزید برآں اس عرصہ میں ملک میں متعدد تنظیمیں قائم ہوئیں، کئی قوانین بنے، مختلف قسم کے مسائل حل کرنے کی غرض سے حکومت کی جانب سے کئی برطانوی وفود ہندوستان آئے اور ہندوستانیوں کے کئی وفود حکومت کے اراکین سے ملنے برطانیہ پہنچے، ساتھ ہی کچھ دل دہلا دینے والے حادثات بھی وقوع پزیر ہوئے، ان تمام واقعات کو اجمالی طور پر (چہ جائے کہ تفصیل کے ساتھ) بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس لئے ذیل کی سطور میں ان میں سے چند اہم سیاسی واقعات ذکر کئے جا رہے ہیں جو اس دور میں پیش آئے اور کہیں نہ کہیں مذکورہ دونوں سیاسی تنظیموں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

اس سلسلہ کا پہلا اہم واقعہ بال گنگا دھر تلک کی قیادت میں ''ہوم رول'' تحریک کی شکل میں 1916ء میں ظاہر ہوا، جن کی سرپرستی میں کانگریس اور مسلم لیگ نے متحد ہوکر ملک کی آزادی کے لئے آواز بلند کی، 1919ء تک گرچہ اس کا اثر باقی رہا مگر اس کے نتیجہ میں ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہوئے اور اس کا اثر 1918ء میں اس وقت دیکھنے کو ملا جبکہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو چیمسفورڈ کی جانب سے نظامِ حکومت میں ہندوستانیوں کو کچھ حقوق حاصل ہوئے۔

برطانیہ اور جرمنی کے مابین 1914ء میں ایک جنگ کی شروعات ہوئی، لیکن جلد ہی اس کی زد میں پوری دنیا آ گئی اور تاریخ میں عالمی جنگ اول کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس جنگ میں ہندوستانی لیڈران نے برطانیہ کا اس خیال سے ساتھ دیا کہ امن قائم ہونے کے بعد حکومت کی جانب سے انہیں کچھ مراعات حاصل ہوں گی، مگر 1918ء میں جب جنگ اپنے اختتام پر پہنچی تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔

1919ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ملک گیر سطح پر ''ستیہ گرہ'' کا آغاز ہوا، الگ الگ شہروں میں حکومت کے خلاف پرامن طریقہ سے احتجاجی جلسے ہوئے، اسی قسم کا ایک جلسہ 13 اپریل 1919ء کو شہر امرتسر کے جلیان والا باغ میں منعقد ہوا، جہاں انڈین آرمی کے بریگیڈیر جنرل ڈائر نے احتجاجیوں پر فائرنگ کر کے ان کا قتل

عام کیا، کم وبیش ایک ہزار ہندوستانی اس حادثہ میں ہلاک اور پندرہ سو زخمی ہوئے اور جن کی گرفتاریاں ہوئی وہ ان کے علاوہ تھے۔ 13 اپریل 2019ء کو اس حادثہ کو اس کی ایک صدی کی تکمیل پر پورے ملک میں غم کے ساتھ یاد کیا گیا اور اس میں شہید ہونے والے لوگوں کے ساتھ یگانگت کا اظہار کیا گیا۔

1919ء کے انہی ایام میں عالمی جنگ اول میں ترکوں کی شکست کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت اور خلافت کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ''خلافت تحریک'' شروع کی، تاکہ حکومت پر زور ڈال کر خلافت کے ادارہ کو از سر نو زندہ کیا جائے، کیونکہ یہاں کے مسلمان سلاطین عثمانیہ کو اپنا خلیفہ اور روحانی پیشوا سمجھتے تھے۔ علی برادران کے علاوہ حکیم اجمل خاں، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ اس کے قائدین میں شامل تھے اور گاندھی جی کی سرپرستی میں ہندوؤں کی اکثریت کا تعاون اس تحریک کو حاصل تھا، مگر تھوڑے دن متحرک وفعال رہنے کے بعد یہ تحریک پھیکی پڑ گئی اور 1924ء میں اسے اس وقت منسوخ کر دیا گیا جب مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ترکی میں جمہوری نظام نافذ کیا۔ (25)

خلافت تحریک ابھی جاری ہی تھی کہ اسی درمیان 1920ء میں گاندھی جی کی قیادت میں حکومت کے خلاف ایک نئی تحریک نے جنم لیا، جسے ''عدم تعاون یا ترک موالات تحریک'' کا نام دیا گیا۔ اسی نوعیت کی ایک ''سودیشی تحریک'' بھی تھی جو 1905ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ملک گیر پیمانہ پر کانگریس نے چلائی تھی۔ بہرکیف پورے ملک میں عدم تشدد کی فضا برقرار رکھتے ہوئے حکومت کا بائیکاٹ کیا گیا، دو سال تک ملک میں یہ فضا قائم رہی لیکن 4 فروری 1922ء کو گاندھی جی نے بذات خود اس کی تنسیخ کا اس وقت اعلان کر دیا جبکہ چوری چورا (واقع گورکھپور) میں احتجاجیوں نے تھانہ میں آگ زنی کر کے 23 پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔ مسلمانوں کی مکمل حمایت اس تحریک کو حاصل رہی اور اس کے زیرِ سایہ انہوں نے 1920ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا۔

1927ء میں آئینی اصلاحات پیش کرنے کے لئے حکومت نے سائمن کمیشن کا تقرر کیا، لیکن چونکہ کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے اس لئے ہندوستانی اس سے سخت برہم ہوئے اور اس کا بائیکاٹ کیا جس سے کمیشن برطانیہ واپس لوٹ گیا۔ پھر 1930ء تا 1932ء میں آئینی اصلاحات ہی کی غرض سے برطانیہ میں حکومت اور مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی رہنماؤں کے درمیان بڑی اہم مگر بے فائدہ تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ 1935ء میں ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ'' نافذ ہوا۔ 1937ء میں کانگریس کو آٹھ ریاستوں میں اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی جسے 1939ء میں مسلم لیگ کے احتجاج نے ناکام بنا دیا۔ 1940ء میں

لیگ نے اپنے اجلاسِ لاہور میں "قرارداد پاکستان" پیش کی جس کی رو سے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ اقوام قرار دیا گیا اور اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سات برس بعد 1947ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے "قانون آزادیٔ ہند" کا مسودہ پاس کر کے برصغیر کو دو آزاد ملکوں میں تقسیم کر دیا۔

ریشمی رومال تحریک

ریشمی رومال تحریک بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی حیثیت کی حامل تحریک ہے جس نے عموماً ملک کے سیاسی رہنماؤں اور خصوصاً علماء کی صف سے منسلک مسلم سماج پر دوررس اثرات مرتب کئے۔ سابقہ دونوں تحریکات (جن کی بنیاد اور نشو نما انگریزوں کے زیر سایہ ان کے رحم و کرم کی مرہون منت تھی) کے برعکس اس کا اندازِ فکر عاجزی و گریہ وزاری سے پاک تھا اور غاصب حکمرانوں کے دروازے پر دستک دینا یا خندہ جبیں ہو کر ان سے ملنا اس کے قائدین کو قطعاً ناپسند تھا۔

اس تحریک کے سربراہ دارالعلوم دیوبند کے اولین طالب علم مولانا محمود حسن تھے، ساتھ ہی ہزاروں کی تعداد میں وہ وطن پرست بھی اس تحریک کا حصہ تھے جنہوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں اس مقصد سے عسکری مراکز قائم کئے کہ برطانوی استعماری طاقت کا قلع قمع کر کے اسے اکھاڑ پھینکیں اور ہندوستان میں ایک متحدہ آزاد جمہوری نظام قائم کریں۔(26)

تحریک کے کل امور حکومت کی نگاہ سے دور خفیہ طور پر طے پا رہے تھے اور کام بخوبی انجام دیا جا رہا تھا، مگر اس سے منسلک بعض ضمیر فروش وطن پرستوں کی دغابازی اور منافقت کے سبب اس کے راز 1913ء میں اس وقت فاش ہو گئے جب ریشمی رومال پر تحریر شدہ مولانا عبیداللہ سندھی کا ایک خط حکومت کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ خط موصوف نے افغانستان کے سرحدی علاقہ سے سرزمین حجاز میں قیام پذیر اپنے استاذ مولانا محمود حسن کے نام ارسال کیا تھا۔ حکومت کے مطابق اس خط میں بغاوت پر آمادہ امور مذکور تھے، حالانکہ اس سلسلہ میں مولانا محمود حسن سے جب پوچھ تاچھ ہوئی تو انہوں نے قطعی طور پر اس سے انکار کر دیا۔(27)

راز فاش ہونے کے بعد مولانا محمود حسن اور ان کے چند ساتھیوں کو، جو حکومت کی دسترس سے باہر نہیں تھے، اس کی پاداش میں مکہ مکرمہ سے گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ چلانے کے بعد مالٹا کی جیل بھیج دیا گیا۔ ریشمی رومال کی بہ نسبت آزادیٔ ہند کی ان کی یہ جدو جہد "ریشمی رومال تحریک" کہلائی۔ تحریک گرچہ بظاہر ناکام رہی لیکن اس نے حریت پسند قومی رہنماؤں میں آزادی کی لہر تیز کر دی اور ان میں ایسے دیرپا نقوش چھوڑے جو اگلوں کے لئے کارآمد

ثابت ہوئے۔ پروفیسر عبدالمنعم النمر کے بقول:

''اس کے اثرات اور اس کی گونج اس وقت بھی محسوس کی جارہی تھی جب استعمار کے چہرے پر عاجزی وانکساری کی علامتیں ظاہر اور واضح ہونے لگی تھیں۔ دوسری جانب تمام حریت پسند افراد و جماعتیں اپنے اپنے صلح پسندانہ مواقف میں فرق وتفاوت کے باوجود ان ٹکڑوں اور ذرات کو اکھٹا کرنے کی کوشش کرنے لگیں جنہیں یہ تحریک ان کے لئے ڈال رہی تھی۔'' (28)

برطانوی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی و مذہبی صورتحال

ہندوستان میں مسلمان جس وقت باہر سے آکر آباد ہوئے تو ان کی نو آبادیاں عربوں، ایرانیوں، افغانیوں اور ترکوں پر مشتمل تھیں اور یہ لوگ اسلام کی اعلیٰ و خالص صفات سے آراستہ تھے، ان کے انہی اعلیٰ اخلاق و عادات کی جاذبیت نے مختلف مذاہب کے ماننے والے اس ملک کے قدیم باشندوں کو اپنے آبائی مذہب سے بغاوت کرنے پر مجبور کیا، ساتھ ہی قبولِ اسلام کی طرف رغبت دلائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر دائرہ اسلام میں ان کی تعداد کے ایک بڑے حصے کی شمولیت کے بعد ملک میں مسلم معاشرے کا ظہور عمل میں آیا۔ لیکن یہ نومولود معاشرہ مقامی تہذیب کے بہت سے ایسے اجزاء کے امتزاج سے ترتیب پایا تھا جو حقیقتاً غیر اسلامی تھے اس لئے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس مسلم معاشرے میں مختلف النوع قسم کے بگاڑ پیدا ہونے لگے، تبدیلی کے اس اثر سے اب جو معاشرہ وجود میں آیا وہ نہ تو اسلامی تھا اور نہ ہندوستانی۔ اس حوالہ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی کتاب ''تحریکِ آزادیٔ ہند اور ہندوستان'' میں رقم طراز ہیں:

> ''جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دنیا ان کو مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا۔ وہ یہاں آکر بہت جلد عام باشندوں میں گھل مل گئے، کچھ ان کو متاثر کیا اور کچھ خود ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا۔'' (29)

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ اور اس سے قبل جو مسلم حکومتیں قائم ہوئی تھیں، ان کے حکمرانوں میں بھی عموماً ان خوبیوں کی کمی تھی جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان میں موجود ہونی چاہیے، بلکہ اکثر حکمرانوں نے مسندِ اقتدار کو مستحکم رکھنے کے لئے ایسے اقدامات کئے جو اس میں پھیلنے والی برائیوں کو تقویت دیں، اس جانب بادشاہ اکبر سب سے بازی لے گیا تھا، گرچہ اورنگ زیب اور اس جیسے ان خوبیوں کے حامل چند حکمراں ضرور گزرے اور انہوں نے معاشرے میں پھیلی برائیوں کی اصلاح کی کوششیں بھی کی، لیکن وہ زیادہ اثر دار ثابت نہ ہو سکیں، البتہ ان کے مقابلہ

صوفیاء(جنہوں نے ہر دور میں ملک کے الگ الگ خطوں میں اپنی خانقاہیں قائم کی تھیں) نے اس سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ان کی اصلاح کے اثرات بھی زائل ہوتے چلے گئے، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جاہ پسند اور مفاد پرست افراد نے ان کا دامن بھی اسی کیچڑ میں ملیامیٹ کر دیا جس میں کہ مسلم معاشرہ پہلے سے ملوث تھا اور ان کے نام کا استعمال کر کے بدعات وخرافات معاشرہ میں عام کیں۔

برطانوی عہد کے ہندوستانی مسلم سماج میں بہت سی ایسی معاشرتی برائیاں، غلط رسم ورواج پیدا ہو چکے تھے، جن میں عوام کے ساتھ ساتھ امراء اور بادشاہوں کا طبقہ برابر کا شریک تھا۔شراب نوشی عام ہوگئی تھی، فسق ومعصیت لازمہ حیات بن چکے تھے، جوان عورتوں کے رقص سے امراء اپنا دل بہلاتے تھے اور طوائفوں کے کوٹھوں پر جا کر ان سے لطف اندوز ہوتے تھے، بازاری عورتیں مجالس کی زینت بن چکی تھیں اور ان کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ بعض شرفاء اپنے لڑکوں کو زبان وآدابِ مجلس سکھانے کے لئے ان کے پاس بھیجتے تھے۔(30) یہ گندگی شہروں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ قصبات وقریات بھی اس کی زد میں آچکے تھے۔اخلاقی زوال کی یہ کیفیت برّصغیر کے ساتھ ساتھ پورے عالمِ اسلام پر طاری تھی۔ایک امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹارڈو نے مسلمانوں کی اس عام اخلاقی ودینی ابتری کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں اس طرح کھینچا ہے:

> ’’اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کے انتہا کو پہنچ چکی تھی، صحیح قوت کے آثار کسی جگہ پائے نہیں جاتے تھے، ہر جگہ جمود وتنزل نمایاں تھے۔آداب واخلاق قابل نفرت تھے۔۔۔۔فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔اگر محمد (ﷺ) پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔‘‘(31)

انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں میں اخلاقی بگاڑ کے علاوہ خالص مذہبی تعلیمات بھی مسخ ہو چکی تھیں اور معاشرے میں ان کی جگہ ایسی رسومات وخرافات نے لے لی تھیں، جن کا مذہبِ اسلام سے کسی طرح کا کوئی ربط وتعلق نہ تھا، مثلاً شرک وبت پرستی مختلف ناموں سے مسلم سماج میں گھر کر چکی تھی، قبروں اور مزاروں کا ایک مستقل جہانِ شریعت تھا، جس میں ان پر سجدہ کرنا، نذریں ماننا، چادریں چڑھانا اور عورتوں کا وہاں جمع ہونا اس شریعت کے خاص اجزا تھے، غرض یہ کہ مذہب کے نام پر وہ ساری چیزیں جو دیگر مذاہب کا خاصہ تھیں ہندوستان کے مسلم معاشرہ کا حصہ بن چکی تھیں۔شیخ محمد اکرام ’’موجِ کوثر‘‘ میں مسلمانوں کی اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’لیکن عوام کی مذہبی حالت نہایت گری ہوئی تھی، انھوں نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام تو اختیار کر لیا تھا، لیکن اس سے ان کی روحانی حالت میں کوئی اہم تبدیلی نہ ہوئی تھی۔اگر پہلے وہ مندروں میں

مورتیوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے تو اب مسلمان پیروں اور قبروں کے سامنے سجدہ کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے۔ پجاریوں اور برہمنوں کی جگہ مسلمان پیروں نے لے لی تھی، جن کے نزدیک انسان کی روحانی تربیت کے لئے احکام اسلام کی پابندی، اعمال حسنہ اور سنت نبوی کی پیروی ضروری نہ تھی، بلکہ یہی مدعا مراقبوں، وظیفوں اور مرشد کی توجہ سے حاصل ہو جاتا تھا۔ تعویزوں اور گنڈوں کا بہت زور تھا۔ بیماریاں دور کرنے یا دوسرے مقاصد کے لیے سب سے زیادہ کوشش تعویزوں کی تلاش میں کی جاتی، ہندو جوگی اور مسلمان پیر کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر خوش اعتقادوں کو دیتے اور یوں انھیں حصولِ مقصد کے صحیح اسلامی طریقوں سے باز رکھتے۔" (32)

الغرض معاشرتی رسموں کے معاملہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں سوائے ان کے ناموں کے کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، لیکن بھوت پریت کے ڈر اور دوسرے وہموں سے زندگی کا سکون اب تلف ہو رہا تھا، نکاح بیوگان جو صدیوں سے ہندوؤں میں گناہ سمجھا جاتا تھا، مسلمانوں نے بھی اسے گناہ تصور کیا اور اسی کے مثل نکاحِ ثانی کو بھی برا سمجھنے لگے۔ شادی بیاہ اور تجہیز و تکفین کے متعلق نہایت سادہ، معقول اور دینی و دنیاوی بھلائی پر مبنی اسلامی احکامات کی جگہ ایسی خلافِ شرع رسموں نے لے لی تھی، جن میں فضول خرچی، وقت کی بربادی اور ان جیسی بیسیوں قباحتیں رائج ہو گئی تھیں۔ (33) چنانچہ مسلم معاشرے میں پھیلی ہر طرح کی سماجی و مذہبی بدعات و خرافات کے ازالہ اور ان میں اصلاح کی غرض سے اولوالعزم اور روشن خیال مسلم علماء نے ملک میں کچھ تحریکات (جن میں سے بعض کا اجمالی تعارف ذیل کے صفحات میں کیا گیا ہے) چلائیں جن کے زیرِ اثر کسی حد تک ان برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

تحریکِ مجاہدین

موجودہ زمانہ میں برِّصغیر اور اس کے اطراف و جوانب میں ہزاروں کی تعداد میں علومِ اسلامی کے جو قائم شدہ مراکز ہیں وہ دراصل امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م 1762ء) کی تعلیمات کا فیض ہے۔ اٹھارویں صدی سے تعلق رکھنے والے اس ہند نژاد عالم نے اپنے مصلح یا مجدد ہونے کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا، حالانکہ قوم کی اخلاقی و روحانی قباحتوں کو اپنی گرانقدر تصانیف میں بے نقاب کر کے ان کی تجدید و اصلاح کا پورا سامان ضرور مہیّا کر دیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں میں قرآن فہمی کا رجحان پیدا کیا، نصابِ تعلیم میں درسِ حدیث کو فروغ دیا اور سب سے اہم یہ کہ اپنی اصلاحی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے طلبہ کی ایک صالح جماعت تشکیل دی۔ شاہ صاحب

کے جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م 1824ء) نے ان کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا، جس کا سب سے مؤثر اظہار انہوں نے سید احمد رائے بریلوی کی زیرِ قیادت مجاہدین کی ایک منظم جماعت تشکیل دیکر کیا۔ تاریخ دعوت وعزیمت میں ہے:

''شاہ صاحب (شاہ عبدالعزیز) کے ذریعہ اللہ تعالی نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت و عزیمت رکھنے والے صاحبِ تاثیر نفوس کی تربیت کا کام کیا، جنھوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا اور ایک پوری صدی سنبھالی۔'' (34)

انیسویں صدی عیسوی میں مسلم حکومت کے دورِ انحطاط میں اتباعِ سنت کو مدِّ نظر رکھ کر مسلمانوں کی اخلاقی زبوں حالی کی اصلاح کے لئے غلام ہندوستان میں تحریک مجاہدین کا قیام عمل میں آیا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلی تحریک تھی جس کے سربراہ سید احمد رائے بریلوی تھے۔ نومبر 1786ء میں رائے بریلی میں پیدا ہونے والے سید احمد نے عہدِ شباب میں شاہ عبدالقادر (م 1814ء) سے دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں چار سال تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد بائیس برس کی عمر میں وہ اپنے وطن رائے بریلی واپس آئے اور قریب دو سال وہاں قیام کے بعد ٹونک چلے گئے، جہاں والی ٹونک نواب امیر علی خاں کی فوج میں چھ سات سال رہ کر فن سپہ گری میں رسوخ پیدا کیا، بعد ازاں ایک مرتبہ پھر دہلی تشریف لائے اور رشد و ہدایت سے اس تحریک کا آغاز کیا۔ (35)

ابتدا میں سید صاحب نے مسلم معاشرے کی اصلاح پر توجہ دی اور اس میں موجود غیر اسلامی رسم و رواج کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ خالص اسلام کی دعوت دی۔ ان کی بات میں بڑی تاثیر تھی، سیدھی سادی مثالوں پر مشتمل تکلف و تصنع سے پاک کلام ہوتا تھا جنہیں سامعین بڑی آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ طبیعت میں خلوص تھا اس لئے جلد ہی شہر دہلی میں ان کا چرچہ ہونے لگا اور لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ شاہ عبدالعزیز کے داماد شاہ محمد اسحٰق اور بھتیجے شاہ اسمٰعیل ان کے اولین مریدین میں سے تھے۔ دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد تبلیغ دین اور احیائے سنت کی غرض سے اپنے بعض مریدین کی رفاقت میں سید صاحب نے برّصغیر کے دوسرے علاقوں کا قصد کیا اور شمالی ہند کے اکثر شہروں میں دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے اس کام کو بخوبی انجام تک پہنچایا۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں پر بھی ان کی اصلاح کا اثر ہوا اور نتیجتاً ان کی بڑی تعداد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئی، بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

''حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ روئے

زمین پر جاری ہے،اس سلسلہ میں کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔'' (36)

اثنائے سفر جب سید احمد رائے بریلوی وعظ و ہدایت کے سلسلہ میں رامپور تشریف لے گئے تو وہاں پر مقیم ولایتی افغانوں سے ان کی ملاقات ہوئی، جنہوں نے انہیں بتایا کہ پنجاب کے سکھ حکمرانوں نے آس پاس کے مسلمانوں کا جینا دشوار کر رکھا ہے،اس پر آپ نے ان کی معاونت اور سکھوں سے جہاد کرنے کی نیت کی۔ 1824ء میں سید صاحب نے حج کیا اور دو سال بعد 1826ء میں سات ہزار مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے ارادہ سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔راستہ میں گوالیار،ٹونک،اجمیر،مارواڑ،حیدرآباد (سندھ)،شکارپور،درّہ بولان اور قندھار وکابل وغیرہ علاقوں سے مجاہدین کا گزر ہوا، چار سال مجاہدین نے بڑی پامردی سے سکھوں کا مقابلہ کیا اور کئی معرکوں میں انھیں شکست دیکر پشاور کے علاقہ میں اپنی آزاد وخود مختار حکومت قائم کی، جو ان کے لئے عارضی کامیابی تھی۔سکھوں کے راجہ رنجیت کی فوج سے مجاہدین کا سب سے پہلا معرکہ 21 دسمبر 1826ء میں نوشہرہ سے سات میل دور ''اکوڑہ'' کے مقام پر ہوا،اس کے بعد شبخون حضرو کا واقعہ پیش آیا،اول الذکر میں مجاہدین کی فتح ہوئی اور آخر الذکر میں بہت سامالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا،اس کے بعد 1830ء کے اخیر میں پشاور فتح ہوا۔مجاہدین کئی سال تک سرحدی علاقہ میں ڈیرہ ڈالے رہے،اس دوران فتوحات کے باوجود انہیں معاشی،سیاسی اور موسمی پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا،بعض دفعہ قاصدوں کے توسط سے راجہ رنجیت سنگھ سے معاہدے بھی ہوئے،مگر معاملہ حل نہ ہوسکا، چنانچہ ان کے اور سکھوں کے مابین جھڑپوں کا یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔

سید احمد شہیدؒ کی زیرِ قیادت سکھوں سے مجاہدین کا آخری معرکہ ذی قعدہ 1246ھ/1831ء میں بالاکوٹ کے پہاڑی درّہ میں ہوا، جہاں افغان پٹھانوں کی غداری اور کچھ بشری غلطی کی بناء پر مجاہدین کو شکست ہوئی اور چند ایک کو چھوڑ کر سید صاحب اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ معرکۂ بالاکوٹ میں شہید ہوگئے۔اس طرح سید صاحب اور ان کے جانثاروں کی شہادت سے یہ خالص دینی واصلاحی تحریک روبۂ زوال ہوگئی،البتہ ہندوستان کے مسلم معاشرہ پر اس نے بڑے نتیجہ خیز اثرات مرتب کئے، جو ''1857ء کے انقلاب'' اور ''ریشمی رومال تحریک'' کی شکل میں کئی دفعہ رونما ہوئے،اسی وجہ سے یہ برصغیر کی اسلامی تاریخ میں ایک کامیاب تحریک کہلائی۔

قادیانی جماعت

انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں پھیلی برائیوں اور قوم کی خستہ حالت کی اصلاح کے لئے ہمدردانِ ملت نے انفرادی واجتماعی ہر دو سطح پر مختلف طریقوں سے متعدد قسم کی تجاویز اختیار کیں،اس سلسلہ میں ہر

طبقہ کے لوگ شامل تھے مگر سبقت طبقۂ علماء کو حاصل تھی اور وہی اکثر و بیشتر تحریکات کے سر براہ تھے۔اس دور میں علمائے دین نے ذاتی مفاد اور عیش وعشرت کی ماڈی زندگی کو بالائے طاق رکھ کر دین کے مطابق امت کی رہنمائی میں بڑی کوششیں کیں اور اس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی رہے،البتہ ان کی کوششوں کا ایک نتیجہ اسلام کے فروعی مسائل میں باہمی اختلافات کی بدولت معاشرہ کو اہلِ حدیث ،دیوبندی اور اہلِ سنت والجماعت(سنی بریلوی جماعت)وغیرہ ذیلی فرقوں میں تقسیم کرنے کی شکل میں سامنے آیا،حالانکہ اس سے قبل ملک میں قوم مسلم کی تقسیم سنی وشیعہ کے نام سے دو بڑے فرقوں تک ہی محدود تھی۔

تاہم اس دور میں کچھ ایسے علماء بھی ہوئے جنہوں نے فروع کے بجائے اصول پر مبنی مذہبی امور کی ترجمانی میں علماء کے عام طبقہ سے اختلاف کیا اور اسلامی عقائد ونظریات کو جدید فلسفہ ومنطق کے مطابق ثابت کرنے کے وہی طریقے اختیار کئے جو عباسی عہد میں معتزلین یا متکلمین نے اختیار کئے تھے۔اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں اور سید امیر علی وغیرہ وہ قابلِ ذکر شخصیات ہیں جن کے طریقِ کار کو نومعتزلہ اور جدید علمِ کلام سے تعبیر کیا گیا،اپنی فہم و فراست کے مطابق عام مسلمانوں کی اصلاح ان کا مقصد تھا اور اسی لئے انہوں نے اپنے خیالات قوم کے سامنے پیش کئے،ان کے بعض خیالات قوم پر اثر انداز بھی ہوئے،مگر اس بنا پر ان میں سے کوئی بھی مجددیت یا نبوت کا دعویدار نہ ہوا اور نہ کسی نے علیحدہ جماعت بنانے کی کوشش کی بلکہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے عام گروہ ہی میں شمار کیا۔البتہ ان کے برعکس انہیں کے ایک ہمعصر مرزا غلام احمد قادیانی نے جدید متکلمین کی بعض باتوں کو اخذ کیا اور اپنی شخصی تعلیمات کو بنیاد بنا کر ایک جدید فرقہ کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر برّصغیر کی اسلامی تاریخ میں قادیانی مذہب کہلایا۔(37)

پنجاب کے ضلع گورداسپور (موجودہ پاکستان) میں قادیان نامی ایک گاؤں ہے جہاں 1837ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدائش ہوئی ۔حصولِ تعلیم کے بعد والد کے وساطت سے انہوں نے سیالکوٹ میں ملازمت اختیار کی ،لیکن چند سال بعد اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے ۔سیالکوٹ میں دورانِ قیام مرزا کو مذہبی امور سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ ''اسکاٹ لینڈ چرچ'' کے مشنریوں کے ساتھ بحث ومباحثہ میں حصہ لینے لگے۔1876ء میں والد کی وفات کے بعد انہیں اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی مل گئی اور نیم مجذوبانہ طرزِ زندگی اختیار کر لی۔ عربی ، فارسی اور اردو پڑھنے لکھنے کی مسلسل مشق کے ذریعہ ان زبانوں پر کافی حد تک عبور حاصل کرنے کے بعد 1880ء میں انہوں نے اپنی کتاب ''براہینِ احمدیہ'' شائع کی جس سے معاشرہ میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ،لیکن گیارہ سال بعد 1891ء میں جب انہوں نے مہدیٔ منتظر،مسیح موعود اور کرشن اوتار ہونے کا دعویٰ کر کے

باضابطہ ایک نئے فرقے (قادیانی مذہب) کی بنیاد رکھی تو یہ مقبولیت مخالفت میں تبدیل ہوگئی۔ علمائے اسلام، آریہ سماج اور عیسائی پادری سب ان کے خلاف ہوگئے۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے انہوں نے آئندہ سال قادیان سے ''ریویو آف ریلیجنز'' کا آغاز کیا اور زندگی کا بقیہ حصہ مباحثوں، پیشین گوئیوں اور تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ اسی دوران انہوں نے جماعت کے اصول وضوابط بھی متعین کئے، چنانچہ 26 مئی 1908ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو ترکہ میں اپنے پیچھے ایک منظم جماعت چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں ان کے پیروکاروں کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زائد نہ تھی، البتہ وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے ان کے خیالات کو پوری مستعدی کے ساتھ فروغ دیا اور تبلیغ کے دائرہ کار کو وسعت دیکر جماعت کی ترقی میں دن رات محنت کی۔

اس مذہب کے دو مرکزی دفاتر ہیں، ایک قادیان میں جہاں اس مذہب کا اشاعتی لٹریچر تیار ہونے کے بعد پورے ملک میں بھیج دیا جاتا ہے اور دوسرا مرکزی دفتر پاکستان کے ایک دوسرے شہر ''ربوہ'' میں واقع ہے جہاں سے عالمی سطح پر قادیانیت کی نشر و اشاعت کے پروگرام تیار کئے جاتے ہیں، اور یہیں کے تربیت یافتہ قادیانی مشنری مختلف ملکوں میں جا کر اس مذہب کی تبلیغ کا کام انجام دیتے ہیں۔ (38)

قادیانی مذہب دو بڑے فرقوں میں منقسم ہے، اول قادیانی احمدی اور دوم لاہوری احمدی۔ اول الذکر مرزا غلام احمد کو مسیح موعود اور نبی مانتے ہیں اور عام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں، جبکہ مؤخر الذکر انہیں مصلح یا مجدد شمار کرتے تھے، جیسا کہ شیخ احمد سرہندیؒ اور دوسرے بزرگوں کے بارے عام مسلمانوں کا نظریہ ہے، ساتھ ہی یہ لوگ اپنے آپ کو حتی الامکان عام مسلمانوں ہی کا حصہ سمجھتے تھے، انہیں کافر نہیں سمجھتے بلکہ ان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔

اس مذہب کے پیروکار موجودہ زمانہ میں دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں اور اپنے افکار ونظریات کی اشاعت و تبلیغ میں مکمل طور پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ مختلف زبانوں میں شائع شدہ تراجم قرآن کی نشر و اشاعت ہے جنہیں یہ دنیا بھر میں تقسیم کرتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام کے بقول انگریزی زبان میں قرآن کا قدیم ترین ترجمہ اسی مذہب کے ایک پیروکار محمد علی لاہوری احمدی کا کیا ہوا ہے۔ (39) جس کی بابت مولانا عبد الماجد دریا بادی ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

> ''اکتوبر 1920ء میں سفر دکن میں ایک عزیز ناظر یار جنگ جج کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے

انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن مجید پر پڑگئی، بے خود ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا الحمد اللہ ایمان بڑھتا گیا۔ جس ''صاحبانہ'' ذہنیت میں اس وقت تک تھا، اس کا عین مقتضاء یہ تھا کہ جو مطالب اردو میں بے اثر رہتے اور سپاٹ معلوم ہوتے، وہی انگریزی کے قالب میں جا کر مؤثر و جاندار بن جاتے، یہ کوئی مغالطۂ نفس ہو یا نہ ہو، بہر حال میرے حق میں حقیقت واقعہ تو بن کر رہا اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔''(40)

عام مسلمانوں کے نزدیک یہ کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اسلام سے مختلف ایک مذہب ہے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ مذہب وجود میں آیا تو علماء نے اس کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف فتوے جاری کئے۔ دورِ جدید میں اس مذہب کے ظہور نے عام مسلمانوں کے طبقۂ علماء کو فکری نقطۂ نظر سے سوچنے پر مجبور کیا، جس کے نتیجے میں جدید طرزِ فکر کے ساتھ اسلامی عقائد و نظریات پر مبنی لٹریچر کثیر تعداد میں تیار ہوا۔

جمعیۃ علماء ہند

جن جماعتوں نے پچھلی دو صدیوں میں ہندوستانی مسلم معاشرے کی اصلاح اور اس میں تحفظِ اسلام کے لئے بہترین خدمات انجام دیں، جمعیۃ علماء ہند ان میں سے ایک منظم جماعت ہے۔ اس تنظیم کے روح رواں علمائے دیوبند تھے جن کی کوششوں سے نومبر 1919ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ آریہ سماج کی شدھی تحریک کے بالمقابل علمائے دیوبند نے دین کی حفاظت کے لئے اپنی زندگیوں کو مکمل طور پر وقف کر دیا اور اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ہر کارگر طریقہ اختیار کیا۔ جمعیۃ کے اراکین نے اس فتنہ کی زد میں شامل مسلمانوں کی تمام بستیوں میں جا کر وہاں کا جائزہ لیا اور ان کی فہرست تیار کرنے کے بعد وہاں اپنے دفاتر قائم کر کے ہمہ وقتی کارکنان اور مبلغین فراہم کئے۔ ابتدائی دور میں فتنہ ارتداد سے متاثر جن علاقوں میں یہ تنظیم کام کر رہی تھی ان کی تعداد ڈاکٹر محمد اسامہ کی تحقیق کے مطابق 76 تھی۔(41)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبد الباری فرنگی محل اور مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ وغیرہ اس تحریک کے وہ نمایاں چہرے ہیں جنہوں نے شدھی تحریک کے سدّ باب کے لئے اہم کردار ادا کیا، نیز اس کام میں دار العلوم دیوبند کے بیشتر علماء نے ان کا ساتھ دیا، بعد ازاں ان تمام لوگوں کی کوششوں سے جو نتیجہ سامنے آیا اس کا نقشہ مولانا اسیر ادروی نے حسب ذیل پیرایہ میں اس طرح کھینچا ہے:

''اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار سالوں میں کڑی مدافعت و مقابلہ کے بعد اس فتنہ (شدھی تحریک)

نے دم توڑ دیا، جتنے لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو پھر سے مشرف بہ اسلام کیا اور ان کو مستقبل میں دین پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان علاقوں میں دینی تعلیم کو عام کیا جائے اور دین کی ضروری معلومات سے ان کو واقف کرایا جائے، اس کے لیے ان کے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے بہت سے دینی مکاتب قائم کیے گئے اور ان مکاتب میں کام کرنے والے معلمین کو تاکید کی گئی کہ وہ گھر گھر جا کر بچوں کے والدین کو متوجہ کریں کہ وہ اپنے بچوں کو ان مکتبوں میں پابندی سے بھیجیں اس طرح چالیس پینتالیس دینی مکاتب ان مخدوش علاقوں میں جمعیۃ علماء ہند نے اپنی سرپرستی میں قائم کیے۔" (42)

شدھی تحریک سے متاثرہ علاقوں میں مکاتب و مساجد قائم کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ وہاں کے مسلمان نہ صرف دین دار ہو گئے بلکہ ان کو اپنے مسلمان ہونے کا صحیح احساس پیدا ہوا، نیز اسلام کے تقاضوں اور اس کی تعلیمات کو انہوں نے سمجھنا شروع کیا۔ اس مذہبی ذمہ داری سے وقتی فراغت کے بعد جمعیۃ نے اپنا سفر جاری رکھا اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ طے شدہ مقاصد میں وسعت پیدا کرتی رہی۔

موجودہ دور میں جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی میدانوں میں خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس وقت آزاد ہندوستان میں جیلوں میں بند ہزاروں بے قصور مسلمانوں کی رہائی کے اسباب مہیا کرنا اس تنظیم کا سب سے اہم فریضہ ہے جس میں اس کے اراکین کچھ مشکلات کے ساتھ پوری طرح کوشاں ہیں۔

تبلیغی جماعت

دنیا کی موجودہ مؤثر ترین تحریکات میں سے ایک تحریک تبلیغی جماعت ہے جس کا ظہور اب سے ایک صدی قبل دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر واقع علاقہ میوات ہوا، جہاں مسلمانوں کی اصلاحی تربیت کے لئے بڑے سادہ مگر پر اثر انداز میں اس تحریک کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے پہلے برصغیر اور پھر دنیا کے مسلم و غیر مسلم طبقات پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ یہ نتیجہ تھا تحریک کے بانی مولانا محمد الیاس، ان کے والد مولانا محمد اسمٰعیل اور بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کی کاوشوں کا، جنہوں نے فی سبیل اللہ میواتیوں میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو، کہ جسے یہ لوگ اور ان کے آباء و اجداد بھلا چکے تھے، از سر نو زندہ کیا۔ اس وقت میواتیوں کی جو مذہبی و معاشرتی صورتحال تھی مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کی بابت الور گزیٹیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"میو اب تمام تر مسلمان ہیں، لیکن برائے نام، ان کے گاؤں کے دیوتا وہی ہیں جو ہندو زمینداروں کے ہیں، وہ ہندوؤں کے کئی ایک تہوار مناتے ہیں، ہولی میواتیوں میں مذاق اور کھیل کھیلنے کا زمانہ ہے اور اتنا ہی اہم اور ضروری تہوار سمجھا جاتا ہے جتنا محرم، عید اور شب برات۔ اسی طرح وہ جنم اشٹمی، دسہرا اور

دیوالی بھی مناتے ہیں۔ان کے یہاں ''پیلی چٹھی'' لکھنے کے لئے یا شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے برہمن پنڈت بھی ہوتے ہیں، ایک رام کے لفظ کو چھوڑ کر وہ ہندوانہ نام بھی رکھتے ہیں، اگر چہ خان جتنا ان کے ناموں کے اخیر میں ہوتا ہے اتنا نہیں لیکن پھر بھی بکثرت سنگھ ان کے ناموں کا اخیر جزو بھی ہوتا ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

''میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں اور ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجدیں ہوتی ہیں۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون گاؤں میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں، البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں بنی ہوتی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں مثلاً پانچ پیرا بھپسا اور چاہنڈ یا کھیڑا دیوا اور مہادیوی کے نام پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔شب برات میں سید سالار مسعود غازیؒ کا جھنڈا بھی ہر میو گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔'' (43)

اسلامی تعلیمات سے بہت دور صرف نام کے ان مسلمانوں کے حالات کو دیکھ کر جب مولوی محمد الیاس کو بے چینی لاحق ہوئی تو ان کی اخلاقی زبوحالی اور تعلیم کی اس کمی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے میوات کے علاقہ میں مکاتب کی شکل میں درسگاہیں قائم کیں مگر جلد ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ مکاتب خاطر خواہ نتائج کی تکمیل کے لئے ناکافی ہیں، کیونکہ تعلیمی اوقات کے علاوہ باقی وقت بچے اپنے اردگرد کے برے ماحول میں گزارتے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے انہوں نے ایک دینی تحریک کی تجویز اختیار کی اور اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہاں کے صاحبِ اثر مسلمانوں کے ساتھ قصبہ نوح میں اگست 1934ء میں ایک پنچایت کی، جس میں طے کیا گیا کہ اسلام کے ارکان کی پوری طرح پابندی کی جائے اور دین کی دعوت و اشاعت کا کام اجتماعی طور سے کیا جائے جس کے لئے لوگ اپنے گھر، اپنے علاقہ کو چھوڑ کر آس پاس کے دوسرے علاقوں میں کچھ وقت کے لئے جائے، وہاں گشت کریں، لوگوں سے ملے، ان کو نماز سکھائیں اور اس کی تلقین کریں، نیز اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرا کر تبلیغِ دین کے لئے انہیں آمادہ کریں۔(44) چنانچہ اس طرح گاؤں کی ایک پنچایت میں اس تبلیغی جماعت کا قیام عمل میں آیا، جس میں ان امور کی انجام دہی کے لئے مولانا الیاس نے چھ نکات بھی پیش کئے جو آگے چل کر اس عظیم تحریک کے اصول کہلائے۔یہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ایمان

2۔نماز

3۔علم وذکر

4۔اکرام مسلم

5۔اخلاص نیت

6۔دعوت وتبلیغ اورلایعنی امور سے اجتناب

ان اصولوں کو سامنے رکھ کراور مسجد کو ان کا محور بنا کر مولوی محمد الیاس نے میواتیوں میں تجدید دین کی یہ تحریک چلائی اوران کو دینِ اسلام کی طرف واپس لانے کی دعوت دی۔اس کا مؤثر نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعدان میں حقیقی اسلام کو جاننے، سمجھنے اوراس پرعمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔جو ہندوانہ وضع قطع،رسوم ورواج ان میں رائج تھے اب وہ ان سے نفرت کرنے لگے تھے اوراسلامی آداب وشعائر کی طرف ان کی رغبت بڑھنے لگی۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی اس جماعت کی بدولت میواتیوں کے طرزِفکروعمل کی اس تبدیلی پراظہارخیال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''مولانا الیاس کی کوششوں سے میوقوم کے عادات وخصائل اوران کے اخلاق میں بھی مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہوگیا ہے۔اب وہ متمدن اورمہذب طرزِزندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ جرائم میں حیرت انگیز کمی ہوگئی ہے،لڑائیاں،فسادات اورمقدمات بہت کم ہوگئے ہیں۔ان کا علاقہ ایک پرامن علاقہ ہے،جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کررہے ہیں۔ان کی معاشرت،ان کالین دین،ان کا برتاؤ غرض ہر چیز میں عظیم تغیر ہوگیا ہے،جس کی وجہ سے گردوپیش کی آبادی پران کا اچھا اخلاقی اثر مرتب ہورہا ہے۔اب وہ ذلت اور بےاعتباری کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، بلکہ ان کی عزت قائم ہوتی جارہی ہے اوران کے کیرکٹرپراعتماد کیا جانے لگا ہے۔''(45)

میوات کے بعد ملک کے دوسرے علاقوں کی عوام نے بھی اس تحریک کے اثرات بڑی تیزی سے قبول کئے،جس سے پورے برّصغیر میں اس کی فضا مولانا محمد الیاس کی زندگی ہی میں قائم ہوگئی۔جولائی 1944ء میں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو اس کے امیر ان کے قابل صاحب زادہ مولانا محمد یوسف ہوئے،جن کی کوششوں سے اس تحریک کو کافی فروغ ملااور ہندوستان سے نکل کر دنیا کے دوسرے ممالک میں اس نے قدم جمائے اورلاکھوں انسان اس سے مستفیض ہوئے۔آج کل دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان اس جماعت سے منسلک ہیں۔

برطانوی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر سیاسی، سماجی اور تعلیمی میدانوں میں نہ صرف کمزور بلکہ تباہ و برباد کرنے کی پوری کوششیں کیں، حالات اس وقت اور بدتر ہو گئے کہ جب 1857ء کے خونیں انقلاب میں دہلی اور اس جیسے دوسرے شہروں کی سیاسی بساط اور علمی مرکزیت ختم ہو گئی، علماء اپنی مسندِ درس چھوڑ کر اور رختِ سفر باندھ کر وہاں سے دوسرے مقامات پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ دہلی جو کبھی علم و دانش کا گہوارہ تھا، اس میں علمی فضا اب بڑی حد تک مفقود ہو چکی تھی۔

البتہ ہندوستان کی سرزمین کو اس دور میں یہ افتخار حاصل رہا کہ اس نے قوم مسلم میں ایسی یگانہ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا، جنہوں نے اپنی علمی کاوشوں سے ظلمت کدہ ہند کو ایک مرتبہ پھر روشن ومنور کیا۔ اس خاک کے ریزے درِّ نایاب کی طرح پھر روشن ہوئے اور اس سرزمین میں ایسے تابناک اور درخشندہ علمی ستارے جگمگائے کہ جن کی ضیاءِ علم نے نہ صرف تاریخ کے صفحات کو روشن کیا بلکہ علم و تحقیق کی ایک نئی تاریخ بھی مرتب کی۔

انیسویں صدی میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا نظام مجموعی طور پر درہم برہم ہو گیا تھا، انگریزوں کے عائد کردہ نظام سے قوم کی اکثریت غیر مطمئن تھی، چنانچہ علمی ارتقاء اور اس کے ذریعہ قوم کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے اس دورِ فتن میں ملک کے ہر گوشہ میں کئی تعلیمی اداروں کا افتتاح ہوا، جن کی سرپرستی مندرجہ ذیل اداروں نے کی۔

دارالعلوم دیوبند

1857ء کے انقلاب کے بعد جب ہندوستان سے مسلم حکومت کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا اور ملک تاریکی کے دور سے گزرنے لگا، لال قلعہ پر اسلامی پرچم کی جگہ یونین جیک نے لے لی تھی اور ملک میں کھلے عام عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی، دہلی اجڑ چکی تھی اور مدارس ویران ہو گئے تھے، مسلمانوں کو اقتصادی و علمی پریشانیاں لاحق تھیں اور مایوسی وقنوطیت کے ماحول میں وہ ہچکولے لے رہے تھے۔ ایسے تاریک دور میں جنگِ آزادی کی ناکامی کے دس سال بعد 30 مئی 1866ء میں دہلی سے پچیانوے میل کے فاصلہ پر قصبہ دیوبند میں چھتے والی مسجد کے کھلے صحن

میں انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔(46) مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتوی، حاجی محمد عابد اور مولانا رفیع الدین اس ادارہ کے بانیان اور روح رواں تھے جنہوں نے بقاءِ اسلام اور تحفظِ علم دین کو مطمح نظر رکھ کر اس ادارہ کی بنیاد رکھی تھی۔

مدرسہ دارالعلوم درحقیقت ہندوستان میں صرف ایک تعلیمی مرکز نہیں ہے بلکہ اسے بہت سی دینی وسماجی تحریکات کا سر چشمہ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے، اس کے قیام نے وقت کی اہم ضرورتوں کو پورا کیا اور فضلاءِ دیوبند نے ایسے نازک دور میں دینی خدمات انجام دیں جب مسلم معاشرہ سے دینی تعلیم کا تصور ختم ہو رہا تھا۔ صرف انگریزوں کے قائم کردہ اسکول کالجز ہی باقی تھے، جہاں طلباء کو عیسائی بنانے اور دین سے بیزار کرنے کا رول ادا کیا جارہا تھا۔ ان حالات میں اس ادارہ نے قوم کی صحیح رہبری کر کے پورے ملک میں دینی فضا برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بقول سید ابوالحسن علی ندوی:

> ''ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے ہیں، بدعات ورسوم کی اصلاح، عقائد کی درستی، تبلیغ دین اور فرقِ ضالہ سے مناظرہ وغیرہ میں ان حضرات کی جدوجہد لائق تحسین ہے، متعدد فضلاء نے سیاسی میدان میں اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور حق گوئی وبیباکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کردی۔''(47)

حکومتِ وقت نے اس ادارہ کو بند کرنے کی کئی دفعہ کوششیں کیں، مگر وہ ہمیشہ ناکام رہی۔ ادارہ کے بانیان و فضلاء نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ ملک کے چپے چپے پر اسی کی طرز پر مدارس قائم کیے، مثلاً مرادآباد میں مدرسۃ الغرباء قاسم العلوم (مدرسہ شاہی)، دربھنگہ میں مدرسہ امدادیہ اور مئوناتھ بھنجن میں مدرسہ مفتاح العلوم وغیرہ تعمیر کئے، مبارک پور کا مدرسہ احیاء العلوم (جہاں موضوعِ مقالہ قاضی اطہر مبارکپوری نے تعلیم حاصل کی) بھی اسی کڑی کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح جو علماء براہ راست دیوبند سے وابستہ نہیں تھے انہوں نے اس کارِ خیر میں ان کی پیروی کی، اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صدی کے اندر اندر پورے برصغیر میں مدارس کا جال بچھ گیا اور کثیر تعداد میں مسلم گھرانوں کے بچے علم دین سے روشناس ہوئے۔ مدارس کے ان فضلاء اور ان سے وابستگان کی خدمات بے بہا اور عدیم النظیر ہیں۔ دورِ حاضر میں دارالعلوم دیوبند کو ''ازہرِ ہند'' کا درجہ حاصل ہے اور دنیا کے مختلف خطوں سے طالبانِ علومِ نبوت یہاں آکر آج بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں ہیں۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے 1875ء میں انہوں نے ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کے نام سے علی گڑھ میں ایک ادارہ قائم کیا، جس کا افتتاح سر ولیم میور کے ہاتھوں ہوا۔ کالج کے افتتاح کے وقت سرسید بنارس میں ملازم تھے اس لئے مولوی سمیع اللہ اس کے پہلے منتظم ہوئے، انہوں نے کالج کو فروغ دینے میں بڑی محنت کی۔ مفوضہ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سرسید نے تن من اور دھن کی بازی لگا کر اپنے خون پسینہ سے اس کالج کو سینچا، تب کہیں ان کی وفات کے بعد 1920ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ ملا۔(48)

1857ء کے انقلاب کے بعد ملک میں مسلمانوں کی حالت زیر وزبر ہونے کے باعث سرسید نے علی گڑھ تحریک کی شکل میں اس تعلیمی ادارہ کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلمانانِ ہند کو مایوسی وقنوطیت سے نکال کر نئی زندگی سے روشناس کرانا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمان سرکاری ملازمتوں سے محروم کردیئے گئے تھے جس کے سبب ان کی اقتصادی حالت کمزور ہوچکی تھی۔ سرسید نے علی گڑھ میں یہ ادارہ قائم کرکے اس میں اعلیٰ و معیاری جدید تعلیم کا انتظام کیا، ساتھ ہی یوروپین اسٹاف کو اپنی تعلیمی اسکیم کا جزو لاینفک بنا کر حکومت اور مسلمانوں کے مابین حائل دیوار کو منہدم کرنے کی سعیٔ بلیغ کی، اس کوشش سے سرسید کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی، کیونکہ اس یونیورسٹی نے پسماندگی کی طرف تیزی سے ڈھلنے والے مسلم معاشرہ کو کافی حد تک سنبھالا اور اسے حیاتِ نو عطا کی۔ کالج سے فارغ ہونے والے تقریباً تمام طلبہ کو سرکاری ملازمتیں ملنے لگیں اور مختلف مقامات پر یہ طلبہ قومی کاموں کے مرکز بھی بن گئے اور اس سے علی گڑھ کو قومی، تعلیمی، ادبی، اجتماعی اور اصلاحی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس ادارہ کی گرانقدر خدمات کا اعتراف سید ابوالحسن علی ندوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''مسلم یونیورسٹی کو اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی، پورے ملک سے مسلم طبقۂ اشراف اور کھاتے پیتے خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلباء بڑی تعداد میں یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے اور تعلیم سے فراغت کے بعد انھیں حکومت وقت کا اعتماد حاصل ہوا اور بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے، مسلم یونیورسٹی نے ملک کی سیاسی زندگی بالخصوص مسلم سیاست میں نمایاں اور ناقابل فراموش حصہ لیا۔ ہندوستانی متحدہ قومیت کی تحریک کے مقابلہ میں مسلم قومیت کی تحریک جس کی قیادت مسلم ''طبقۂ اشراف'' کے ہاتھ میں تھی یہیں سے اٹھی۔''(49)

سر سید احمد خاں کے علاوہ جن لوگوں نے اس ادارہ میں اپنی خدمات انجام دیں ان میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی سمیع اللہ اور چراغ علی وغیرہ شامل ہیں۔ پچھلی ایک صدی میں لاکھوں لوگوں نے اس یونیورسٹی سے استفادہ کیا، جن میں مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرھم اس عظیم درسگاہ کی خاص پروردہ شخصیات ہیں، ساتھ ہی یہ وہ قومی لیڈران بھی ہیں جن سے عوام اور ملک دونوں کو فائدہ ہوا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایک فکری اور تہذیبی تحریک کا مرکز بھی ہے جسے اس کے بانی نے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح کے لئے قائم کیا تھا۔ اس ادارہ نے مسلمانوں کی تنگ نظری کو ختم کرکے ان میں خود اعتمادی اور ان کے خیالات میں وسعت پیدا کی، مزید برآں قوم کی نئی نسل میں انگریزی زبان وادب اور علوم جدیدہ کو ایک ایسے وقت میں فروغ دینے کی نمایاں خدمات انجام دیں جبکہ مسلم معاشرہ سراسیمی کے عالم میں تھا اور کوئی بھی اس کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ منفرد خصوصیات کی حامل یہ یونیورسٹی آج بھی علی گڑھ میں قائم ہے اور ماضی کے مقابلے دورِ حاضر میں اپنے اندر اس نے کافی ترقی و وسعت پیدا کرلی ہے اور سب سے اہم یہ کہ اسے برّصغیر کے جدید تعلیم یافتہ مسلم معاشرے کا محور ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ میں قائم دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی ہندوستانی مسلمانوں کی ایک عظیم دینی درسگاہ اور علمی تحریک ہے، جس کا قیام 1894ء میں کانپور کے مدرسہ فیض عام میں علماءِ ہند کی ایک جماعت کے باہمی مشورہ سے عمل میں آیا۔ تعلیمی تحریک کے طور پر وجود میں آنے والے اس ادارہ کو جن علماء نے فروغ دیا، ان میں مولانا محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانی اور سید عبدالحئ حسنی کے اسماء پیش پیش ہیں۔ کانپور میں کافی غور وخوض کے بعد حسب ذیل مقاصد کے تحت لکھنؤ کی سرزمین پر ستمبر 1898ء میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی:

1۔ علومِ اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

2۔ رفع نزع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

3۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

4۔اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادرانِ وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔(50)

اس ادارہ کے قیام کا مقصد دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درمیان حائل قدیم و جدید کی دیوار کو ختم کر کے دونوں کو ملانا تھا، اس لئے قدیم صالح اور جدید نافع کے حسین امتزاج کی تکمیل اس کی دعوت تھی جسے سب سے پہلے ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالغفور نے حرکت دی، مگر اس کی تکمیل مولانا محمد علی مونگیری کے ہاتھوں ہوئی اور اسے ترقی دینے والوں میں سب سے نمایاں نام علامہ شبلی نعمانی اور مولانا عبدالحی حسنی کا ہے۔علامہ شبلی نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہندی اور سنسکرت زبانیں جاری کرائیں، تاکہ ان زبانوں سے آشنا ہو کر مدرسہ کے طلبہ ان آریوں کا مقابلہ کر سکیں، جن کا زور اس زمانہ میں ملک میں بہت بڑھا ہوا تھا اور جو اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے۔اس کے علاوہ انگریزی کو بھی یہاں داخلِ نصاب کیا گیا، تاکہ یہاں سے فراغت کے بعد علماء اپنے علمی وقار کے ساتھ ملک و بیرونِ ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فرض ادا کر سکیں۔(51)

اس ادارہ نے لٹریچر کے میدان میں بھی قابلِ غور خدمات انجام دی ہیں اور تحریر و تقریر کی بہترین صلاحیتوں سے مزین ایسے افراد پیدا کئے جنہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن پر بیدار مغز اور بیش بہا کتابیں مہیّا کیں، جن سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی۔اس کے قابلِ فخر فرزندوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، سید نجیب اشرف اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ وہ اصحاب اجلّہ ہیں جنہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں سے کامیابی و کامرانی کے منازل طے کر کے اس ادارے کا نام روشن کیا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

برصغیر کے تمام مسلم تعلیمی اداروں میں ایک اہم اور معیاری ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے، جسے اب سے ایک صدی قبل مولانا محمد علی جوہر، ان کے چند رفقاء اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کی ایک جماعت نے ساتھ مل کر علی گڑھ میں قائم کیا تھا۔اس زمانہ میں برصغیر میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں شباب پر تھیں، جن کے زیر اثر ملک گیر پیمانہ پر ہر قسم کے اداروں کو حکومت سے ملنے والے گرانٹس اور ان کی اجارہ داری سے آزاد کرانے کی کوششیں شروع ہوئی، انہی کوششوں کے نتیجہ میں 29 اکتوبر 1920ء میں علی گڑھ کی سرزمین پر یہ ادارہ وجود میں آیا۔(52) انگریزوں کے زیرِ تسلط ہندوستان کے مظلوم باشندوں نے ایک ایسے وقت میں، جبکہ قوم کا کوئی تصور ہی دنیا کے اس خطہ میں موجود نہیں تھا، ملک میں یہ پہلا قومی ادارہ قائم کیا۔

جامعہ کے قیام واستحکام میں سب سے اہم کردار اس کے بانی مولانا محمد علی جوہر کا ہے، جنھوں نے اپنی کوشش پیہم اور جہد مسلسل سے اس مشکل کام کو انجام دیا، حالانکہ کہ وہ خود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (کہ جس کے بالمقابل جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا) کے ہی پروردہ تھے، ان کا اپنا بیان ہے کہ "تقریباً جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے۔" (53)

یوں تو جامعہ کی بنیاد علی گرھ میں پڑی، مگر 1925ء میں یہ ادارہ دہلی منتقل کر دیا گیا، جہاں پہلے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے تعاون نے اور بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی انتظامی قابلیت اور حسنِ تدبیر نے اسے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ (54)

اپنے تعلیمی معیار و وقار کے علاوہ یہ ادارہ کچھ خاص صفات کا بھی متحمل ہے، مثلاً اس کی پہلی صفت اس کے اساتذہ کا ایثار و قربانی کے ساتھ ساتھ طلبہ و اساتذہ کی سادہ لوح کارفرماں تھی۔ اس کی ایک خصوصیت اس میں موجود صنعت وحرفت کی تعلیم ہے، کیونکہ اس کے بانیان نے سرکاری ملازمت ہی کو اپنے طلبہ کا نصب العین نہیں قرار دیا بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے لئے صنعت وحرفت کا بھی معقول انتظام کیا، تاکہ فراغت کے بعد ان کو کسی پر منحصر نہ ہونا پڑا۔

جامعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے ایک اشاعتی ادارہ قائم رکھا، جہاں سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور ان کے ذریعہ اس کے اربابِ اقتدار ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور سید عابد حسین وغیرہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہر حال آج کل یہ ادارہ ملک کا ایک اہم اور کامیاب ترین سرکاری ادارہ ہے جسے برسوں سے اپنی گراں قدر خدمات کے سبب ملک وقوم میں مقبولیت وشرف کا درجہ حاصل ہے۔

خلاصہ

سابقہ صفحات میں مذکوران تمام تحریکی اداروں سے ملک کے گوشے گوشے میں علمی فضا قائم ہوئی جس سے ہر مسلک وملت کے لوگ سیراب ہوئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ 1857ء کے بعد مسلمانوں میں جو مایوسی اور افسردگی چھا گئی تھی، ان اداروں کے توسط سے ان کے اندر عزم وحوصلہ کی لہر دوڑ گئی، علماء اور قوم کے خیر خواہ حضرات کے باہمی تعاون سے جگہ جگہ دینی وعصری اداروں کے قیام کا آغاز ہوا، جہاں سے دینی وعصری علوم کے ماہرینِ فن پیدا ہوئے، اور جنھوں نے اپنے خاص اسلوب ونگارش میں ان میدانوں میں بہترین خدمات دیں۔

بیسویں صدی میں ہندوستان کے ایسے حالات میں قاضی اطہر مبارکپوری نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کے شب وروز اس ماحول میں گزار کر اس کے اثرات کو قبول کیا۔ انہوں نے سیاست ومعاشرے سے دور رہ کر خالص علمی کام کے لئے کافی تگ ودو کی، بعد ازاں یہی محنت شاقہ آگے چل کر ان کے لئے علمی جلالت کی علامت بنی جو آئندہ باب میں مذکوران کی حیات کے مختلف گوشوں سے واضح طور پر نظر آئے گی۔

حواشی وحوالہ جات

(1) نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن اشاعت غیر مذکور، ص:259

(2) عرب و ہند کے قدیم تعلقات کی تفصیلات جاننے کے لئے ملاحظہ کیجیے سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' اور قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''عرب و ہند عہد رسالت میں''۔

(3) مبارکپوری، قاضی اطہر، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، فیمس بکس، لاہور، 1989ء، ص:73-80

(4) ہندوستان میں عربوں کی کب اور کتنی حکومتیں قائم ہوئیں؟ اس سے متعلق تفصیلات جاننے کے لئے قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا مطالعہ کیجئے۔

(5) بحری سفر میں احمد ابن ماجد کے ذریعہ واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تصریح سید سلیمان ندوی نے ''عربوں کی جہاز رانی'' میں اور ڈاکٹر غلام قادرلون نے ''قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'' میں کی ہے۔

(6) بپن چندرا، جدید ہندوستان، (مترجم: شری چاندرام)، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1971ء، ص:49

(7) ایضاً، ص:57

(8) اکبرآبادی، سعید احمد، مسلمانوں کا عروج وزوال، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1947ء، ص:321

(9) جدید ہندوستان، ص:92

(10) نظامی، ظفر احمد، تاریخ ہند عہد جدید، قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، 2015ء، ص:77

(11) جدید ہندوستان، ص:139

(12) خاں، سرسید احمد، اسباب بغاوتِ ہند، (مرتب: ڈاکٹر فوق کریمی)، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی، 2018ء، ص:118

(13) خاں، اقبال حسن، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حیات اور علمی کارنامے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1973ء، ص95

(14) تاریخ ہند عہدِ جدید، ص:101

(15) ایضاً، ص:102

(16) عبدالمنعم النمر، آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، (مترجم: محمد علاء الدین ندوی)، مجلس گیارہ ستارہ انڈیا، کھگڑیا، بہار، 2012ء، ص:77

(17) تاریخ ہند عہدِ جدید، ص:104

(18) ایضاً،ص:107

(19) آزادیٔ ہند کی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصہ،ص:75

(20) تاریخ ہند عہدِ جدید،ص:120

(21) آزادیٔ ہند کی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصہ،ص:103

(22) ایضاً،ص:90،91

(23) یعنی مولانا محمد علی جوہر نے ''کامریڈ'' و ''ہمدرد'' میں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں اس کی مخالفت کی۔

(24) تاریخ ہند عہد جدید،ص:121

(25) نگارافشاں،مولانا قاضی اطہر مبارکپوری حیات وخدمات،ایوروزا کاڈمی،علی گڑھ،2018ء،ص:20,19

(26) آزادیٔ ہند کی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصہ،ص:105،106

(27) تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب ''نقشِ حیات''۔

(28) آزادیٔ ہند کی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصہ،ص:107

(29) مودودی،سید ابوالاعلیٰ،تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان،اسلامک پبلیکیشنز (پرائیوٹ) لمٹیڈ،لاہور،ج1،ص:42

(30) ندوی،سید ابوالحسن علی،سیرت سید احمد شہید،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،2017ء،ج1،ص:68،69

(31) شیخ الہند محمود حسن حیات اور علمی کارنامے،ص:47،48

(32) شیخ محمد اکرام،موجِ کوثر،فرید بک ڈپو،نئی دہلی،2016،ص:14,13

(33) ایضاً،ص:14

(34) ندوی،سید ابوالحسن علی،تاریخ دعوت وعزیمت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،2008ء،ج5،ص:373

(35) سیرت سید احمد شہیدؒ،ج1،ص:146

(36) تاریخ دعوت وعزیمت،ج5،ص:376

(37) موجِ کوثر،ص:177

(38) ادروی،اسیر،دارالعلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک،دارالمؤلفین،دیوبند،2015ء،ص:196،197

(39) موجِ کوثر،ص:181

(40) دریابادی،عبدالماجد،آپ بیتی،شباب ایجوکیشنل بک ہاؤس لکھنؤ،2017ء،ص:210

(41) برصغیر ہند و پاک میں فکر اسلامی کے شارح مولانا صدرالدین اصلاحی - ایک مطالعہ (پی ایچ ڈی مقالہ)،محقق: ڈاکٹر محمد اسامہ،مشرف: ڈاکٹر محمد ارشد،جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی،2018ء،ص:48

(42) دارالعلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک،ص:187

(43) ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا محمد الیاسؒ اوران کی دینی دعوت، رحمانیہ بک ڈپو، نئی دہلی، 2012ء، ص: 66-68

(44) خان، اقتدار محمد، 1947ء کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، 1995ء، ص: 57,56

(45) مودودی، سید ابو الاعلیٰ، ایک اہم دینی تحریک، ترجمان القرآن، جلد 15، عدد 02 / اکتوبر 1939ء، ص: 142،141، بحوالہ: برصغیر ہندو پاک میں فکر اسلامی کے شارح مولانا صدرالدین اصلاحی - ایک مطالعہ، ص: 47

(46) رضوی، سید محبوب، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مکتبہ دارالعلوم، دیوبند، 2015ء، ج 1، ص: 155

(47) ندوی، سید ابوالحسن علی، ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ستمبر 2016ء، ص: 107

(48) موجِ کوثر، ص: 88

(49) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: 115

(50) ندوی، محمد اسحاق جلیس، تاریخ ندوۃ العلماء، مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 2017ء، ج 1، ص: 55،56

(51) ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2015ء، ص: 153

(52) مدہلوی، عبدالغفار، جامعہ کی کہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2004ء، ص: 20,19

(53) موجِ کوثر، ص: 153

(54) ایضاً، ص: 146

باب دوم

قاضی اطہر مبارکپوری کی سوانح: ایک جائزہ

قاضی اطہر مبارکپوری کی سوانح: ایک جائزہ

اعظم گڑھ: تاریخ وثقافت

اعظم گڑھ ہندوستان کے صوبۂ اترپردیش کے مشرقی اضلاع میں سے ایک ضلع ہے۔ یہ زمانۂ قدیم سے اپنی گوں ناگوں خصوصیات، روایات اور تصورات وانقلابات کی وجہ سے ممتاز رہا ہے۔ ضلعے کے ثقافتی آثار اور علمی و سیاسی انداز نے معاشرتی زندگی کو تاریخ کے مختلف ادوار میں متاثر کیا ہے۔ (1)

اعظم گڑھ دولفظوں ''اعظم'' اور ''گڑھ'' کا مرکب ہے۔ لفظ ''اعظم'' عربی زبان میں اسمِ تفضیل کا مصدر ہے جس کے لغوی معنی ''رتبہ میں بڑا ہونا'' ہے، لیکن اصطلاح میں یہ لفظ اس شہر کے بانی راجہ اعظم خاں کی طرف منسوب ہے جنہوں نے 1665ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ اور ''گڑھ'' ہندی کا لفظ ہے جو ''قلعہ'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ابتدا میں چونکہ راجہ اعظم خاں نے اس خطہ میں فوجی چھاؤنی کے طور پر قلعہ تعمیر کیا تھا، بعد میں اس کے اردگرد لوگ آباد ہو گئے جس سے اس قلعہ نے شہر کی شکل اختیار کر لی۔ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مقامی راجاؤں اور جاگیرداروں نے اس طرز کے متعدد قلعے تعمیر کرائے تھے جو بعد میں شہر یا قصبات میں تبدیل ہو کر اپنے معمار کے نام کی نسبت سے موسوم ہوئے، مثلاً افضل گڑھ (بجنور) تارا گڑھ (اجمیر) اسی نوعیت کے قلعے ہیں۔ اس حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں لکھا ہے:

> ''گڑھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے وہ شہر جن کے نام کا آخری جزء گڑھ ہے، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا یعنی کسی زمین دار اور رئیس نے اپنی اور اپنی رعایا کے لئے کوئی گڑھ (قلعہ) بنایا اور اسے اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا، اعظم گڑھ بھی اسی قسم کا ایک شہر ہے۔'' (2)

اعظم گڑھ کے بانی راجہ اعظم خاں کا تعلق مسلم راجپوت گھرانے سے تھا، ان کے اجداد میں ابھیمان سنگھ نامی شخص بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آگرہ جا کر مسلمان ہوئے، بادشاہ نے تألیف قلب کی غرض سے ان کی قدر ومنزلت کی اور ''دولت خاں'' کے خطاب سے سرفراز کیا، نیز انعام کے طور پر موجودہ ضلع اعظم گڑھ، جو کہ اس وقت جونپور ریاست کا حصہ تھا، کے آس پاس کے بائیس پرگنوں (موجودہ تحصیل) کی ریاست عطا کی۔ یہ ریاست نظام

آباد، گوپال پور، سگڑی، محمد آباد، گھوسی، چریا کوٹ، مئوناتھ بھنجن اور شادی آباد وغیرہ پرگنوں پر مشتمل تھی جس میں موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے علاوہ غازی پور اور مئو کے علاقے بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد دولت خاں کا انتقال ہو گیا اور مینہ نگر (اعظم گڑھ) میں وہ مدفون ہوئے۔ کوئی اولاد نہ ہونے کے سبب دولت خاں کی ریاست کے وارث ان کے ہندو بھتیجے ہربنس ہوئے اور ہربنس کے جانشین بکرماجیت نامی ایک نامور شخص ہوئے، جنہوں نے اپنے جدامجد دولت خاں (ابھیمان سنگھ) کے نقش قدم پر اسلام قبول کرلیا، پھر بکرماجیت کی جاگیر کے وارث ان کے دو بیٹے اعظم خاں اور عظمت خاں ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے نام سے اعظم گڑھ اور عظمت گڑھ کے قلعے تعمیر کرائے۔ (3)

اعظم خاں اور عظمت خاں کے بعد مہابت خاں ابن عظمت خاں ان کی اس مختصر سی ریاست کے وارث ہوئے، یہ بڑے دبدبہ کے راجہ تھے، انہوں نے اپنی حکومت کو گھورکھپور تک وسیع کرلیا تھا، انہی کے عہد میں نوابانِ اودھ کی حکومت کی بنیاد پڑی جس کے حدود جونپور تک وسیع تھے۔ آئندہ تاریخ میں دونوں ریاستوں کے مابین سالوں تک جھڑپیں ہوئیں اور انہی جھڑپوں میں سے ایک جھڑپ میں مہابت خاں نواب سعادت علی خاں کے ہاتھوں قید ہو کر اسیری کی حالت میں 1731ء میں فوت ہوئے۔ مہابت خاں کے بعد ان کے بیٹے ارادت خاں ریاستِ اعظم گڑھ کے وارث ہوئے، اپنے والد کی طرح یہ بھی ایک کامیاب حکمراں تھے، پورے دورِ حکومت میں اودھ کے نواب سے ان کی کشمکش رہی۔ 1765ء میں ان کے بیٹے جہاں خاں کے عہد میں ریاست میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، اودھ کے نوابوں نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر 1771ء میں اعظم گڑھ پر حملہ کر کے اسے اپنے علاقہ میں شامل کرلیا اور انگریزوں کے تسلط سے قبل تک یہ علاقہ ان کی تحویل میں رہا۔ (4) انیسویں صدی کے آغاز میں اس علاقہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، جنہوں نے 18 دسمبر 1832ء میں اعظم گڑھ کو ایک مستقل ضلع کی حیثیت دے دی جو 1947ء میں ملک آزاد ہونے کے بعد ماضی قریب تک باقی رہی۔ اعظم گڑھ کے جغرافیہ میں آخری مرتبہ تبدیلی نومبر 1988ء میں اس وقت ہوئی جبکہ ریاستی حکومت نے ضلع کے تقریباً نصف حصہ کو الگ کر کے صوبائی نقشہ میں مئو کے نام سے ایک نئے ضلع کا اضافہ کیا۔

ضلع مئو کے قیام سے قبل برطانوی عہد کے اعظم گڑھ کا طول البلد 26 درجہ 27 دقیقہ اور عرض البلد 82 درجہ 40 دقیقہ سے 83 درجہ 52 دقیقہ کے مابین ہے۔ اس کے شمال میں گھورکھپور اور دیوریا ضلع واقع ہیں، جنوب میں جونپور، غازی پور، مغرب میں فیض آباد، سلطان پور جبکہ مشرق میں غازی پور اور بلیا سے اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ (5) مجموعی طور پر یہ تمام اضلاع عہد وسطی میں ریاست جونپور کا حصہ ہوا کرتے تھے اور موجودہ دور میں صوبہ اتر

پردیش کے مشرقی سمت میں واقع ہونے کے سبب ''پروانچل'' کے نام سے معروف ہیں۔

رہائش کے اعتبار سے اعظم گڑھ کے مسلمان دو حصوں میں منقسم ہیں، اول وہ راجپوت جو عہد قدیم سے یہاں آباد ہیں اور یہاں کے اصل باشندے ہیں اور دوم وہ لوگ کہ جن کے آبا و اجداد دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ملک کے مختلف علاقوں کی طرح اعظم گڑھ میں بھی آباد ہو گئے۔ سید سلیمان ندوی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''اعظم گڑھ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں اکثر راج پوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آبا و اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کر کے یہاں آئے یا آباد ہوئے، اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہے۔''(6)

راج پوت گھرانوں سے تعلق رکھنے والے اعظم گڑھ کے اصل باشندے وقتاً فوقتاً جب مشرف بہ اسلام ہوئے تو ان نومسلموں میں بھی اصل و نسل کے لحاظ سے دو قومیں ظہور پزیر ہوئیں، اول وہ جنہوں نے اپنی راجپوتانہ شان کو برقرار رکھنے کے لئے حسب و نسب کو میل ملاپ کی آمیزش سے پاک رکھا، ان میں خصوصاً یہاں کا راج شاہی گھرانہ اوران کے متعلقین قابل ذکر ہیں۔ اور دوسرے وہ نومسلم راج پوت جو باہر سے آنے والے مغلوں، پٹھانوں ،شیخوں اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگے اور یہاں کی زبان میں ''روتارہ'' اور ''راوت'' کہلائے۔ یہ لوگ خالص راج پوتوں کے مقابلے تعداد میں زیادہ ہیں اور اعظم گڑھ و اس کے اطراف میں سکونت پذیر ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے اعظم گڑھ میدانی علاقہ ہے اور صوبہ اتر پردیش کے اچھے اضلاع میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ آب و ہوا یہاں کی گرم اور خشک ہے لیکن برسات کے موسم میں زیادہ بارش ہونے کے باعث سال کے کچھ ماہ یہاں کی مٹی نرم رہتی ہے حالانکہ گرمیوں میں لو خوب چلتی ہے اور بقول ڈاکٹر حبیب اللہ ''یہ علاقہ صحراء کی ہلاکت خیز تپش کا نمونہ پیش کرتا ہے۔''(7) نیز دسمبر اور جنوری کے موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اس طرح یہاں کے لوگ جہاں ایک طرف تینوں موسموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کے اثرات سے اچھی طرح واقفیت کے سبب کسی بھی جگہ اور علاقہ کی آب و ہوا میں زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آب و ہوا اور زمین کی بناوٹ میں یکسانیت کے سبب یہاں کی پیداوار ایک ہی طرح کی ہے۔ گنا، جو، گیہوں، مٹر، جوار، باجرہ، خربوزہ اور شکر قند یہاں کی خاص پیداوار ہیں، ان کے علاوہ ہر قسم کی وہ سبزیاں، جن کی پیداوار صوبہ کے دوسرے اضلاع میں ہوتی ہے، یہاں بھی اگائی جاتی ہیں۔ زراعت کا پورا نظام بارش کے پانی اور ضلع کے درمیان سے بہہ کر

گزرنے والی ٹونس ندی پر منحصر ہے۔

صنعتی میدان میں پارچہ بافی کو اعظم گڑھ کا قدیم ترین پیشہ ہونے کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ مومن انصار برادری سے تعلق رکھنے والے لوگ (جن کا یہ آبائی پیشہ ہے اور حائک، جولاہا، نورباف، اور انصاری جیسے مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں) کئی صدیوں سے اس علاقہ میں آباد ہیں اور اس پیشہ کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مغلوں کے عہد میں اس صنعت کو کافی فروغ ملا جس کے نتیجہ میں یہاں کے تیار شدہ عمدہ کپڑوں کی دنیا کے مختلف حصوں میں برآمد ہوئی، اور برطانوی دور میں اس علاقہ کے ریشمی کپڑوں کا ایشیاء اور یوروپ کے مما لک میں مطالبہ رہا۔ دور حاضر میں بھی یہاں کے دو علاقے مئوناتھ بھنجن اور مبارک پور اس صنعت کے سب سے بڑے مراکز ہیں جہاں کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے صنعتی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے بعد خیر آباد، محمد آباد گہنہ، چریا کوٹ، ولید پور اور عظمت گڑھ وغیرہ قصبات بھی ضلع میں پارچہ بافی کے مراکز ہیں اور یہاں پر تیار ہونے والا کپڑا مبارک پور و مئوناتھ بھنجن کے بازاروں میں آکر فروخت ہوتا ہے۔ (8) پارچہ بافی کے علاوہ برطانوی عہد میں نیل کا کاروبار بھی اس علاقہ میں اپنے عروج پر تھا اور لوگوں نے اس کی زراعت وتجارت سے کافی دولت کمائی تھی لیکن جلد ہی اس صنعت کا زوال ہوگیا، آج کل بطور باقیات ضلع کے بعض قریات وقصبات میں اس صنعت کے خستہ حال گودام موجود ہیں۔ غرض یہ کہ پارچہ بافی اس علاقہ کی واحد اہم صنعت ہے جو ماضی کی طرح حال میں بھی برقرار ہے، البتہ مشینی ترقیات نے اس کے سامنے بھی کئی چیلنجز کھڑے کردیے ہیں۔

اعظم گڑھ کے بارے میں اب تک جو بھی بیان کیا گیا ہے وہ عام معلومات کا ایک حصہ ہے جسے ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں، یہ سب اور ان جیسی دیگر علامات دوسرے علاقوں میں بھی پائی جاتی ہیں ، البتہ ان کے علاوہ جو خاصیت اس علاقہ کو دوسرے علاقوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کے مردم خیز قصبات ہیں جن میں پچھلی کئی صدیوں میں ہزاروں ایسے علمی اور باکمال افراد پیدا ہوئے جنھوں نے علم کی مختلف شاخوں میں اہم خدمات انجام دے کر اپنے ہم عصروں کو متاثر کیا اور علمی ذخائر کے طور پر مستقبل کی مسلم نسلوں کے لیے بیش قیمت وراثت چھوڑی۔ ان لوگوں کی گراں قدر خدمات کا اندازہ مولانا اقبال احمد خاں سہیل (م 1955ء) کے مندرجہ ذیل شعر سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے ان عظیم شخصیات کے حوالہ سے اعظم گڑھ کے بارے میں کہا تھا:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر، فیضان تجلّی ہے یکسر

جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے، وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے (9)

یہ شعر خطۂ اعظم گڑھ پر پوری طرح صادق آتا ہے، کیونکہ سابقہ دوصدیوں میں اس کے حدود اربعہ میں ایسے بے شمار باکمال افراد کا ظہور ہوا جنہوں نے اپنے علمی و دیگر کارناموں اور خدمات کے ذریعہ دنیا کو نہ صرف فائدہ پہنچایا بلکہ بعد والوں کے لئے ایک اچھی مثال قائم کی اور ایسا کر کے انہوں نے اپنے علاقہ اور قوم کا نام روشن کیا۔ اعظم گڑھ کی ان نابغہ ہائے روزگار شخصیات میں ان علما کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے جنہوں نے علوم اسلامی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، اس سلسلہ میں سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اس خطہ کے مختلف قریات وقصبات سے تعلق رکھنے والے ایسے دس افراد کا ذکر کیا ہے جن کا شمار علوم اسلامی کے ماہرین کے طور پر انیسویں صدی کی نامور ہندوستانی شخصیات میں ہوتا تھا، (10) ساتھ ہی انہوں نے یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ انیسویں صدی سے قبل خطۂ اعظم گڑھ میں پائے کے علما پیدا ہوئے لیکن چونکہ اس وقت یہ علاقہ جونپور کا حصہ تھا اس لئے وہ جونپوری مشہور ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا کتاب میں ان کے یہ الفاظ درج ہیں:

> ''اعظم گڑھ ایک نئی آبادی ہے البتہ اس کے مردم خیز قصبات پرانے ہیں اور پہلے وہ جونپور میں شمار ہوتے تھے اس لئے موجودہ اعظم گڑھ کے اکثر اگلے مشاہیر جونپوری مشہور ہوئے، اس زمانہ میں سرکار جونپور کی وسعت آج کل سے مختلف تھی۔'' (11)

انیسویں صدی کے بعد بیسویں صدی میں بھی علم و دانش کے اس گہوارے سے علمائے کبار کی نشو ونما کا تسلسل برقرار رہا، جنہوں اپنے اثر انگیز کارناموں کے سبب ملکی یا عالمی سطح پر شہرت پائی۔ ان مشاہیر علما کی صف میں علامہ شبلی نعمانی (م 1914ء) کا نام سرفہرست ہے۔ بندول نامی ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھنے والے شبلی نے اسلامی تاریخ کے موضوع پر اردو زبان میں ''الفاروق'' اور ''سیرت النبیؐ'' جیسی مدلل و مستند کتابیں تصنیف کر کے جہاں ایک طرف اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کیا، وہیں دوسری طرف ان تاریخی تصانیف کے ذریعہ اپنے زمانہ میں تحریر شدہ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں موجود مروجہ خامیوں کی تصحیح کی، اس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں قابل اور باصلاحیت تلامذہ کی ایک ایسی جماعت تشکیل دی جس نے ان کے بعد اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شبلی کے بعد اس علاقہ کی دوسری اہم شخصیت مولانا حمید الدین فراہی (م 1922ء) کی ہے۔ بندول کی طرح پھریہا بھی اعظم گڑھ ہی کا ایک گاؤں ہے جہاں مولانا فراہی پیدا ہوئے، اسلامی علوم میں علوم قرآنی سے انہیں خاص شغف تھا، عربی میں اس موضوع پر ''**نظام القرآن و تأویل الفرقان**'' کے عنوان سے ان کی تفسیر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی ضلع کے احاطہ میں بندول سے متصل ایک گاؤں جیراجپور

ہے، یہاں کے مولانا اسلم جیراجپوری (م1922ء) نے پچھلی صدی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات انجام دے کران اداروں میں اسلامی تہذیب وثقافت کو برقرار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، نیزان کی ''تاریخ الامت'' اسلامی تاریخ کے موضوع پرنہایت اہم کتاب ہے۔ان کے علاوہ بھور کے مولانا امین احسن اصلاحی (م1997ء) صاحب تدبر قرآن، مئو کے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (م1992ء) محقق ''**مصنف ابن ابی شیبه** ''اور مولانا محمد مصطفیٰ اعظمی (م2017ء) محقق'' **صحیح ابن خزیمه** ''وغیرہ اس علاقہ کی وہ ناموراوراہم شخصیات ہیں کہ جن کی مفید علمی خدمات کا لوگوں نے نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا۔علمائے کبار کی اس صف میں شامل ایک نام اسی علاقہ کے ایک عالم دین قاضی اطہر مبارکپوری (م1996ء) کا بھی ہے، جنہوں نے عرب وہندوستان کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر قابل رشک خدمات انجام دے کرعلمی دنیا سے ''مؤرخ اسلام'' کا خطاب پایا، ان کا مسکن اسی ضلع کا قصبہ مبارک پور ہے، جسے قرب وجوار کے علاقوں میں پارچہ بافی کی صنعت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اورصدیوں سے متعدد عالمی شہرت یافتہ علما کا مولدومسکن اورعلم ودانش کا گہوارہ رہا ہے۔سید سلیمان ندوی اس قصبہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محمد آباد کے قریب مبارکپور نامی بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علما پیدا ہوئے ہیں۔'' (12)

قصبہ مبارک پور

شہر اعظم گڑھ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بجانب شمال ومغرب مبارک پور ایک دینی، علمی اور صنعتی قصبہ ہے، جس کی تاریخ پانچ سوسال پرانی ہے۔اس قصبہ کے بانی راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد (م965ھ) کڑا مانک پور (الٰہ آباد) کے مشہور چشتی حامدیہ خانوادے کے روحانی بزرگ تھے۔مغل حکمراں ہمایوں (م963ھ) کے عہد میں انہوں نے قاسم آباد کے کھنڈرات پر ایک بستی کی بنیاد رکھی جو انہی کی نسبت سے مستقبل میں مبارک پور موسوم ہوئی۔راجہ صاحب نے اس بستی کو پارچہ بافوں کی ایک جماعت سے آباد کیا تھا جنہیں وہ اپنے ہمراہ کڑا مانک پور سے یہاں لائے تھے، کچھ عرصہ بعد جب وہ واپس مانک پور منتقل ہوئے تو یہاں کا نظم ونسق انہی پارچہ بافوں کے سپرد کر گئے، جنہوں نے نسل درنسل اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دے کر پانچ سوسال میں عروج وزوال کے مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد مبارک پور کو موجودہ قصبہ کی شکل میں منفرد شناخت بخشی۔(13)

ایک پختہ سڑک کے ذریعہ یہ قصبہ شہر اعظم گڑھ سے ملا ہوا ہے، اس کا طول البلد 26 درجہ 6 دقیقہ اور عرض

البلد 83 درجہ 18 دقیقہ ہے۔(14) ایک صدی قبل اس قصبہ کی آبادی دس سے بارہ ہزار تھی جو آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بڑھ کر ایک لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔28 محلوں (15) پر مشتمل اس قصبہ میں 95 فیصد لوگ مسلمان ہیں جبکہ بقیہ 5 فیصد غیر مسلم (ہندو) ہیں۔ معاشی لحاظ سے قصبہ میں آباد 80 فیصد لوگ پارچہ بافی (کپڑا بنائی) کی صنعت پر منحصر ہیں کیونکہ ابتداہی سے یہ ان کا آبائی پیشہ رہا ہے، گھر گھر کپڑا بننے کی مشینیں، جنھیں ہینڈ لوم یا پاور لوم کہا جاتا ہے، منضبط ہیں۔ مغلوں کے عہد میں یہاں کے لوگوں نے اس صنعت کو کافی فروغ دیا اور برطانوی دور میں یہاں کا تیار شدہ کپڑا دنیا کے مختلف علاقوں میں استعمال کیا گیا، آج بھی ریشم کی وہ ساڑیاں، جنھیں ملک بھر میں لوگ بنارسی ساڑی کے نام سے جانتے ہیں، بڑی تعداد میں اسی قصبہ میں تیار کی جاتی ہیں۔

پارچہ بافی کے بعد جس چیز نے اس قصبہ کو دنیا بھر میں معروف ومقبول کیا وہ عرصہ دراز سے چلی آرہی اس کی علمی روایت ہے۔ علم وفضل کے میدان میں اس قصبہ نے سابقہ دوصدیوں میں جونمایاں مقام حاصل کیا وہ اس کے بالمقابل اعظم گڑھ کے کسی خطہ کو حاصل نہ ہوسکا، اس کی وجہ یہاں پیدا ہونے والی وہ عبقری علمی شخصیات ہیں جنھوں نے اپنی محنت وقابلیت کے ذریعہ علوم اسلامی اور ان کی ضمنی شاخوں میں عظیم خدمات انجام دے کر نہ صرف ان میں قابل قبول اضافہ کیا بلکہ اس شعبہ سے منسلک طلبہ اور اساتذہ ان کے لیے اس سے استفادہ کا راستہ بھی ہموار کیا۔ اس قصبہ کی چند قابل ذکر شخصیات کے نام حسب ذیل ہیں:

1:۔ شمس العلماء مولانا ظفر حسن عینی (م 1928ء)۔

2:۔ مولانا احمد حسین رسول پوری (م 1940ء) عربی زبان کے معروف ادیب۔

3:۔ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری (م 1935ء) مصنف **تحفة الاحوذی شرح ترمذی**۔

4:۔ ملا رحمت علی اسماعیلی (م 1944ء)۔

5:۔ مولانا عبیداللہ رحمانی (م 1994ء) مصنف **مرعاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح**۔

6:۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری (م 2006ء) صاحب **الرحیق المختوم** وغیرہ۔

یہ عبقری شخصیات اس قصبہ کی علمی، دینی عظمتوں کے ستون ہیں جن کے سلسلہ میں ایک بات قلب پر ثبت کرنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق ہندوستان میں رائج مختلف مسالک سے ہے، کیونکہ یہ قصبہ ایک صدی پہلے سے ہی دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ اور بوہرہ جماعتوں کا مرکز رہا ہے اور ان میں سے ہر مسلک کے متبعین اپنے وجود اور مذہبی شناخت کے ساتھ یہاں سرگرم عمل ہیں اور قصبہ میں قائم شدہ مدارس کے ذریعہ اپنے

مسلک کی اشاعت وتبلیغ میں کوشاں ہیں۔ قصبے کی اکثریت بریلوی مکتبۂ فکر کی حامل ہے کہ جس کا مہتم بالشان ادارہ ''مدرسہ مصباح العلوم جامعہ اشرفیہ'' یہاں قائم ہے اور شمالی ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کی سی حیثیت رکھتا ہے، دوسرا ادارہ دیوبندی مکتبۂ فکر کا حامل ''مدرسہ احیاء العلوم'' ہے، اسی طرح ''مدرسہ عربیہ دارالتعلیم'' یہاں اہلحدیث مسلک کی ترجمانی کر رہا ہے اور چوتھا فقہ جعفری کے عقائد و دینی رموز کی تعلیم و تدریس کے لیے ''باب العلم'' اس قصبہ کا قدیم ترین ادارہ ہے۔ مبارک پور کے مندرجہ بالا یہ تمام مسلکی مدارس اپنی منفرد عالمانہ شان رکھتے ہیں، ان کے متعلق اسی قصبہ کے ایک شاعر و ادیب قمر الزماں مبارکپوری اپنی کتاب ''صدر رنگ'' میں لکھتے ہیں:

> ''مبارک پور کی معاشرت کے یہی اربعہ عناصر ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے نظریات وعقائد از دمِ پیدائش تا وقت مرگ انھیں چاروں محوروں کے گرد رقص کرتے رہتے ہیں۔''(16)

علاوہ ازیں بوہرہ جماعت کی تعداد گرچہ اس قصبہ میں کم ہے لیکن یہاں پر واقع ان کی واحد مسجد اور اس میں جاری مدرسہ طاہریہ ان کی دینی تعلیم کی کفالت کے لئے کافی ہے۔ اس طرح یہ قصبہ تجارت، تعلیم اور مسلکی رنگا رنگی کی ایک بے نظیر مثال ہے اور سیکڑوں علما کا مولد و مسکن ہے۔ اس قصبہ سے تعلق رکھنے والے انہی علما میں سے ایک قاضی اطہر مبارکپوری ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کے نصف ثانی میں عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر کئی تحقیقی کتابیں لکھ کر ''مؤرخ اسلام'' کا خطاب پایا۔

قاضی اطہر مبارکپوری کے خاندانی حالات

ولادت اور نام ونسب

قاضی اطہر مبارکپوری کی پیدائش مبارک پور کے محلّہ پورہ صوفی اور محلّہ حیدرآباد کے نقطۂ اتصال (17) پر حیدرآباد میں واقع موجودہ مکان (قاضی منزل) کے سامنے سڑک کی دوسری جانب گلی کے چوتھے مکان میں بروز منگل 4 رجب 1334ھ / مطابق 7 مئی 1916ء کو فجر کے وقت ہوئی۔ والد کا نام محمد حسن ابن لعل محمد (م 11 ربیع الاول 1398ھ) اور والدہ کا نام حمیدہ بنت مولانا احمد حسین رسولپوری (م 22 ذی القاعدہ 1352ھ) تھا۔ قاضی اطہر مبارکپوری والدین کی چار اولادوں میں سب سے بڑے تھے۔ (18)

نانا مولانا احمد حسین رسولپوری کو جب نواسہ کی ولادت کی خوش خبری ملی تو اس کے حق میں دعائے خیر کی اور نام ''عبدالحفیظ'' رکھا، لیکن اپنے موروثی لقب قاضی (19) اور تخلص اطہر سے شہرت پائی، چونکہ مبارک پور کے رہنے والے تھے اس لئے علاقائی نسبت بھی ان کے نام کا ایک جزء بن گئی اور اس طرح اصل نام کے برعکس موروثی لقب، تخلص اور قصبہ کی طرف منسوب نام کے مجموعے یعنی قاضی اطہر مبارکپوری سے مشہور ہوئے۔ نام کی نسبت موصوف اپنی خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں بیان کرتے ہیں:

> ''نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی 26 رجب 1359ھ نے میرا نام عبدالحفیظ رکھا، بعد میں قاضی اطہر مبارکپوری کے نام سے مشہور ہوا۔'' (20)

خاندان اور بچپن

قاضی اطہر مبارکپوری کا تعلق مبارک پور میں صدیوں سے آباد انصاری برادری سے ہے۔ ان کے آباو اجداد سولہویں صدی عیسوی میں راجہ سید مبارک ابن راجہ سید احمد چشتی مانک پوری (م 965ھ) کے ہمراہ کڑا مانک پور (الہ آباد) سے مبارک پور میں آکر آباد ہوئے۔ (21) پیشہ سے پارچہ باف اس خاندان کے افراد تعلیم سے بھی آراستہ تھے اس لئے راجہ سید مبارک نے رخصت ہوتے وقت مبارک پور کی نیابت قضاء کا عہدہ ان کے سپرد کیا، جس پر اس خاندان کے افراد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام تک فائز رہے۔ لیکن 1857ء کے ہنگامہ کے بعد جب انگریز اس ملک پر پوری طرح قابض ہوگئے اور سابقہ نظامِ حکومت کو منسوخ کر کے برطانوی نظامِ

حکومت نافذ کیا تو قاضی اطہر مبارکپوری کے خاندان میں رائج نیابتِ قضاء کا یہ عہدہ بھی ختم ہوگیا، البتہ اس سے منسلک خطاب لفظ ''قاضی'' تبرک کے طور پر باقی رہا جسے آئندہ نسلوں نے برقرار رکھا اور آج بھی بدستور اس خاندان کا ہر فرد اپنے نام کے ساتھ یہ لفظ استعمال کرتا ہے، اس کا اندازہ ذیل میں مذکور قاضی اطہر مبارکپوری کے خانوادے کے شجرہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ شجرہ ان کی متعدد موجودہ مطبوعات میں ''شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان'' کے عنوان سے درج ہے۔

شجرہ کے مطابق قاضی شیخ رجب منصب قضاء پر فائز اس خانوادے کے آخری فرد تھے جن کے زمانہ میں برطانوی قانون کے نفاذ کے بعد یہ عہدہ منسوخ ہوگیا، اس کے علاوہ اس شجرہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ شیخ رجب کے بعد ان کی اولاد و احفاد میں سے کسی نے بھی اپنے نام کے ساتھ لفظ ''قاضی'' استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کی جگہ وہ لفظ ''میاں'' لگاتے تھے، جیسا کہ شجرہ میں قاضی اطہر مبارکپوری کے والد میاں جی حاجی محمد حسن اور دادا میاں جی حاجی لعل محمد کے اسماء سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن شیخ رجب کی تین پشتوں کے بعد نام کے طور پر لفظ ''قاضی'' کا استعمال پھر سے کیا جانے لگا جس کی از سرِ نو ابتدا خود قاضی اطہر مبارکپوری نے کی اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا بچپن دوسرے عام بچّوں کی طرح بالکل فطری تھا، یہ بھی گھر اور گھر سے باہر محلے اور گلی کوچوں میں رائج الوقت ہر قسم کے کھیل کود، سیر و تفریح اور دیگر شرارتوں جیسے کھیل کود کے سامان بنانے میں دلچسپی رکھتے تھے، ان کا زیادہ تر وقت چڑیوں اور مچھلیوں کے شکار اور خاندانی بھائیوں کے ساتھ قصبے کے باہر باغوں، کھیتوں، دیہاتوں اور ندی نالوں کا چکر کاٹنے میں گزرتا تھا، البتہ ان کے اپنے بیان کے مطابق اس عمر میں ان میں ایک اچھی عادت یہ تھی کہ ہم عمر خاندانی بھائیوں اور دوستوں کو غلط اور نازیبا حرکتوں سے منع کرتے تھے جس پر وہ لوگ انہیں ''مولوی'' کہتے تھے۔ (22) اس اچھی عادت کی وجہ ان کی والدہ اور نانی رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانوی (م1378ھ) کی بہتر تعلیم و تربیت تھی جو گھر میں محلے کے چھوٹے بچّوں اور بچّیوں کو مکتب کی تعلیم دیتی تھی۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے کھیل کود کا یہ دور اردو کی تعلیم تک جاری رہا جو اس زمانہ میں عموماً دس برس کی عمر میں شروع ہوا کرتی تھی۔ (23)

تعلیمی مراحل

بیسویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کے اکثر مسلم علاقوں میں بچّوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے گھریلو مکاتب کا نظام قائم تھا، جہاں ''قاعدہ بغدادی'' یا ''نورانی قاعدہ'' سے تعلیم کا آغاز کیا جاتا تھا، اس کی تکمیل پر کچھ دشواری کے ساتھ بچّوں میں قرآن پڑھنے کا سلیقہ پیدا ہوجاتا تھا، اور مکتبی تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد مدرسہ یا اسکول میں بچّوں کا داخلہ کرا دیا جاتا تھا۔ قرآن کے علاوہ ان مکاتب میں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام بھی ہوا کرتا تھا۔ موجودہ دور میں گھریلو مکاتب کی جگہ اب مسجدوں نے لے لی ہے جہاں ائمہ ومؤذنین حضرات اس کے فرائض انجام دیتے ہیں، البتہ کہیں کہیں یہ گھریلو مکاتب اب بھی قائم ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تعلیم کا آغاز بھی ان کے گھر میں قائم شدہ مکتب سے ہوا، جہاں ان کی والدہ محلّہ کے بچّوں کو دینی تعلیم دیا کرتی تھیں، قاضی صاحب نے یہیں پر ان سے قاعدہ بغدادی پڑھا اور پھر قرآن کے تین پارے پڑھنے کے بعد مدرسہ میں داخل کرائے گئے۔ (24)

اس زمانہ میں وہ والدہ سے دینی وعلمی باتیں سیکھنے لگے تھے اور نماز پڑھنے کی عادت بھی پڑ چکی تھی۔ والدہ کے علاوہ ان کی تعلیم وتربیت میں نانی اور ماموں وغیرہ ننیہالی رشتہ داروں کا بڑا دخل تھا کیونکہ ان کے اپنے گھرانہ کا ماحول غیر علمی تھا، صرف ان کے والد، جو کہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، اور ان سے بڑے بھائی ہی معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جبکہ ننیہال میں نانا مولانا احمد حسین رسولپوری اور ماموں مولانا محمد یحییٰ (م 1967ء) جید عالم تھے، والدہ اور نانی صاحبہ بھی اس وقت کے ماحول کے لحاظ سے دین کی بنیادی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھیں، چنانچہ تعلیم کی یہ وراثت، جس کے ذریعہ معاشرے میں انہیں بلند مقام حاصل کرنا تھا، ننیہال ہی سے ملی۔

مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ

گھریلو مکتب میں جب قاضی اطہر مبارکپوری کو قرآن اور اردو پڑھنے کی شد بد ہوگئی تو ان کا داخلہ مدرسہ احیاء العلوم میں کرا دیا گیا۔ یہ مدرسہ محلّہ پورہ صوفی ہی میں ان کے مکان سے شمالی سمت میں چند منٹ کی پیدل مسافت پر واقع ہے اور مبارک پور میں دیوبندی مکتبۂ فکر سے وابستہ مسلمانوں کا علمی سرچشمہ ہے، اسے مبارک پور کے ایک عالم دین حکیم الٰہی بخش (م 1937ء) نے 1317ھ / مطابق 1899ء میں ایک مکتب کے طور پر قائم کیا

تھا جس کے پہلے مدرس مولانا حکیم محمد محمود تھے۔(25)

مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے ناظرۂ قرآن استاذ حافظ علی حسن سے پڑھا، منشی عبدالوحید سے اردو اور ریاضی اخلاق احمد صاحب سے پڑھی، جبکہ اردو۔عربی خوش نویسی اور فارسی زبان مولانا نعمت اللہ مبارکپوری سے سیکھی۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی اردو و فارسی کی تعلیم کا یہ زمانہ 1346ھ / مطابق 1927ء سے 1349ھ / مطابق 1931ء تک چار سال پر محیط ہے، اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی اور تعلیم کی بہ نسبت کھیل کود میں زیادہ مرغوب رہتے تھے۔کھیل کود اور پڑھائی سے غافل رہنے کا ایک واقعہ، جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی سوانح حیات میں کیا ہے، ذیل میں مذکور ہے:

> ''اس زمانہ میں مجھے رنگین کاغزات، نقشہ جات، مختلف قسم کے پیسے اور سکے جمع کرنے کا شوق ہوا، ماچس کی ڈبیاں بھی جمع کرتا تھا، گھر کے صحن میں مختلف قسم کے پودے اور پھول بویا کرتا تھا، دوسرے کھیلوں کے ساتھ کبوتر بازی کا شوق ہوا تو کئی سال تک یہ مشغلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے مدرسہ میں ناغہ ہوتا تھا۔ایک مرتبہ والد مرحوم نے کھوب مارا اور گھسیٹتے ہوئے مدرسہ لے گئے۔''

چند سطور کے بعد لکھتے ہیں:

> ''الغرض تقریباً پندرہ سال کی عمر تک کھیل کود کر اردو و فارسی کی تعلیم مکمل کی، اسی کے بعد عربی تعلیم کا دور آیا۔''(26)

اردو و فارسی کے بعد اسی مدرسہ میں 1350ھ / مطابق 1931ء میں ان کی عربی زبان و ادب کی تعلیم بھی شروع ہوئی اور دس سال کے بعد 1359ھ / مطابق 1940ء میں وہ اس سے فارغ ہوئے۔اس عرصہ میں درس نظامی کی جو کتابیں مدرسہ کے نصاب میں شامل تھیں، قاضی اطہر مبارکپوری نے انہیں بڑی محنت سے پڑھا۔اسی زمانہ میں ان میں مطالعہ کا ذوق بھی پیدا ہوا جس کے باعث ایک دن پہلے ہی وہ اگلے سبق کا مطالعہ کرلیا کرتے تھے، اس سے انہیں دو فائدے ہوتے، اول استاد کے پڑھانے کے دوران سبق جلدی سمجھ لیتے تھے اور دوسرا یہ کہ امتحان میں کبھی اول اور کبھی ممتاز آیا کرتے تھے۔

ابتدائی تین سال تک ان کی تعلیم کا یہ سلسلہ کافی بہتر رہا، لیکن 1352ھ / مطابق 1943ء میں، جبکہ وہ عربی کی تیسری جماعت میں تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، اس سے ان کی پڑھائی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے اسے دوبارہ جاری کیا۔زمانۂ طالب علمی کے ان پریشان کن حالات سے دوچار ہونے کی

کیفیت وہ حسب ذیل الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

''1352ھ میں جب کہ میں کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا جس کے صدمہ سے میری اٹھتی جوانی خاک میں ملنے لگی، سالوں غم واندوہ کی وادی میں بھٹکتا رہا، معلوم ہوتا تھا کہ والدہ مرحومہ کی یاد میں اپنے کو بھول جاؤنگا، والد مرحوم بہ سلسلہ معاش ومعیشت باہر آنے جانے لگے، تین بھائی اور ایک بہن میں سب سے بڑا میں ہی تھا، تعلیم کے لئے نکلنا مشکل تھا، نیز بعض دوسرے خانگی معاملات پریشان کن تھے حتی کہ تعلیم بند کردینے کی بات ہونے لگی، مگر میں نے گھر کے کام کاج کے ساتھ بڑے صبر واستقامت اور شوق ومحنت سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور مدرسہ احیاء العلوم میں پوری تعلیم حاصل کی۔'' (27)

مدرسہ شاہی مرادآباد سے تعلیم کی تکمیل

قاضی اطہر مبارکپوری کے زمانہ میں مدرسہ احیاء العلوم میں موقوف علیہ (موجودہ عربی نصاب کا چھٹا یا ساتواں سال) تک کی تعلیم کا انتظام تھا اور اس سے آگے کی تعلیم کے لئے طلبہ کو بڑے مدارس کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا تا کہ وہاں سے فراغت کے بعد تکمیل علم کی سند حاصل کرسکیں۔ نصاب تعلیم کا یہ نظام ہندوستان کے بیشتر مدارس اسلامیہ میں آج بھی رائج ہے۔

1358ھ / مطابق 1939ء میں مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیم کی تکمیل کے بعد سندِ فراغت کے حصول کے واسطے اور دورۂ حدیث شریف (برصغیر کے عربی مدارس میں رائج نصاب تعلیم کا آخری سال جس میں طلبہ کو حدیث کی امہات الکتب پڑھائی جاتی ہیں) میں داخلہ کے لئے قاضی اطہر مبارکپوری نے بڑے مدرسہ کا ارادہ کیا اور اساتذہ سے صلاح ومشورہ کے بعد جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں آئے۔

مدرسہ شاہی برصغیر میں قائم شدہ دیوبندی مکتبۂ فکر کے قدیم ترین اور معروف اداروں میں سے ایک ہے جو مغربی اتر پردیش کے مرادآباد ضلع میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد خود دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (م 1880ء) نے 1296ھ / مطابق 1878ء میں شاہی مسجد مرادآباد میں رکھی تھی۔ ابتدا میں اس ادارہ کا نام ''مدرسۃ الغرباء قاسم العلوم'' تھا، بعد میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے نام سے مشہور ہوا۔ (28) پچھلے 152 سال میں کئی ہزار طلبہ نے اس ادارہ سے فراغت کے بعد برصغیر میں علومِ اسلامیہ کی نشر واشاعت کی، ان میں سب سے مشہور نام مفتی کفایۃ اللہ دہلوی (م 1875ء) کا ہے جن کی شہرہ آفاق کتاب ''تعلیم الاسلام'' برصغیر کے لاکھوں بچوں کو آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری دورۂ حدیث میں داخلہ لینے سے چند سال پہلے بھی یہاں آئے تھے لیکن معاشی حالات کی تنگی اور دیگر وجوہات کی بنا پر کچھ دنوں بعد درمیان سال میں ہی واپس چلے گئے۔(29) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیوبند میں دار العلوم جیسا مرکزی ادارہ ہونے کے باوجود انہوں نے مراد آباد کے مدرسہ شاہی ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کی وجہ غالباً یہاں پر مقرر دو اساتذہ تھے، ایک مولانا سید محمد میاں (م 1975ء)، کہ جن سے ان کے دیرینہ تعلقات استوار تھے، اور دوسرے مولانا سید فخر الدین احمد (م 1972ء) کہ جن کا ''درسِ بخاری شریف'' اس زمانہ میں دبستان دیوبند کے علمی حلقوں میں امتیازی شان رکھتا تھا اور یہ مقولہ زبان زد تھا:

> ''اگر ترمذی شریف پڑھنی ہے تو مولانا حسین احمد مدنی کے درس میں دیوبند جائیے، ابوداؤد شریف پڑھنی ہے تو سہارنپور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے درس میں شرکت کیجئے اور اگر بخاری شریف پڑھنی ہے تو مرادآباد فروکش ہو کر فخر الاسلام مولانا فخر الدین احمد صاحب کے درس میں حصہ لیجئے۔''(30)

بہر حال مدرسہ شاہی میں داخل ہونے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے یہاں ایک سال تعلیم حاصل کی اور پھر پچیس برس کی عمر میں 1358ھ/1940ء میں رسمی تعلیم سے فراغت کی سند پائی۔

اساتذہ

حصولِ تعلیم کے دوران قاضی اطہر مبارکپوری نے مدرسہ احیاء العلوم میں دس سال صرف کئے، جہاں اس عرصہ میں انہیں تربیت یافتہ اور مخلص اساتذہ میسر آئے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق مدرسہ احیاء العلوم میں طالب علمی کا یہ دور عہد زریں تھا، اس زمانہ میں اس کی تعلیم کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور مدرسہ کا ہر طالب علم اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا تھا، یہ سب مدرسہ کے ان اساتذہ کے خلوص وایثار کا نتیجہ تھا جو اس زمانہ میں دس بیس روپے کے قلیل مشاہرے پر صبر وقناعت کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ شب وروز درس وتدریس میں مصروف رہتے تھے اور تعلیمی اوقات کے علاوہ فارغ اوقات میں بھی طلبہ کو گھر پر بلا کر تعلیم دیتے تھے تاکہ انہیں علم حاصل ہو جائے۔(31) قاضی اطہر مبارکپوری کو جب ایسے مخلص اساتذہ سے تحصیل علم کا موقع ملا تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ مدرسہ احیاء العلوم کے ان ذی وقار اساتذہ کے اسمائے گرامی ذیل کی سطور میں مذکور ہیں:

1۔ مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوری (م 1404ھ): قاضی اطہر مبارکپوری کے یہ پہلے استاذ تھے جن سے انہوں نے اکثر وبیشتر درسی کتابیں پڑھیں، فطرتاً سادہ مزاج، نیک سیرت اور مخلص ومشفق آدمی تھے۔(32)

2۔ مولانا شکر اللہ مبارکپوری (م 1361ھ): ان سے قاضی صاحب نے منطق وفلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھی تھیں، یہ مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم بھی تھے اور اس کی تعلیم وترقی کا خاص خیال رکھتے تھے۔

3۔ مولانا بشیر احمد مبارکپوری (م 1404ھ): قاضی صاحب نے ان سے منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔

4۔ مولانا محمد عمر مظاہری مبارکپوری: انہوں نے قاضی صاحب کو ''جلالین شریف'' پڑھائی۔

5۔ مولانا محمد یحییٰ رسولپوری (م 1387ھ): یہ قاضی اطہر مبارکپوری کے حقیقی ماموں تھے جنہوں نے انہیں عروض وقوافی اور علمِ ہیئت کے بعض اسباق پڑھائے، ساتھ ہی اچھی تربیت بھی کی، مزید برآں اپنے خواہر زادہ کے مطالعہ کے واسطے ہر ممکن طریقہ سے عربی کی نادر اور امہات الکتب مہیا کرتے تھے۔ (33)

ان کے علاوہ جن اساتذہ سے انہوں نے مدرسہ شاہی مراد آباد میں استفادہ کیا، ان کے اسماء حسب ذیل ہیں:

1۔ مولانا سید فخر الدین احمد: یہ مدرسہ شاہی میں شیخ الحدیث تھے، قاضی صاحب نے ان سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور ابوداؤد پڑھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مدرسہ شاہی کے درس وتدریس میں صرف ہوا، 1957ء میں مولانا حسین احمد مدنی کی وفات کے بعد دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہوئے، جہاں اتفاقاً قاضی صاحب کے تین لڑکوں (قاضی خالد کمال، قاضی سلمان مبشر اور قاضی ظفر مسعود) نے ان سے پڑھ کر شرف تلمذ حاصل کیا۔

2۔ مولانا سید محمد میاں: اردو کے ادیب اور اسلامی تاریخ کی کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے۔ ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''، ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے''، اور ''ریشمی رومال تحریک'' ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ قاضی صاحب نے ان سے سنن ترمذی مکمل پڑھی، نیز دیوان حماسہ اور مقامات زمخشری کے بعض اسباق بھی پڑھے۔

3۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی (م 1398ھ): یہ ان کے صحیح مسلم کے استاذ تھے۔ (34)

مذکورہ اساتذہ کے علاوہ دوران تعلیم قاضی صاحب نے مبارک پور میں دیگر مسالک کے ان علما سے بھی استفادہ کیا جن کا علم میں بڑا مقام تھا، چنانچہ اپنی خودنوشت میں انہوں نے علمائے اہلحدیث میں مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارکپوری اور مولانا عبید اللہ رحمانی کا تذکرہ بڑی شان سے کیا ہے۔ اسی طرح بوہرہ فرقہ کے ایک عالم ملا رحمت علی اسماعیلی مبارکپوری کو بھی انہوں نے اپنے اساتذہ کی فہرست میں شامل کیا ہے، مبارک پور کے بازار میں ان کی بساطے کی دکان تھی جہاں ملاقات کے دوران قاضی صاحب ان سے استفادہ کرتے تھے۔ (35)

طالبِ علمی کے دور پر ایک نظر

انسان کی زندگی کے سنورنے یا بگڑنے کے لحاظ سے اس کا تعلیمی دور بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ طالب

علم میں اگر مستقبل میں کچھ بننے یا کچھ کرنے کی چاہت ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ان خوبیوں اور عادتوں کو اختیار کرے جو اس کے مقصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتی ہیں، اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو منزلِ مقصود کو پانے کی اس کی خواہش خواہش ہی رہ جاتی ہے، اگر کسی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے تو اسے بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور خاصا وقت ضائع ہوتا ہے، نیز کامیاب ہونے کے بعد ماضی کے اپنے غلط فیصلوں اور کاہلی وکوتاہیوں کو یاد کر کے زندگی بھر پشیمان ہوتا رہتا ہے۔

ان سطور سے قاضی اطہر مبارکپوری کا گہرا تعلق ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر تاریخ وتحقیق کے میدان میں شہرت پائی، جس کی وجہ عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر مبنی وہ کتابیں ہیں جو ممبئی میں قیام کے دوران انہوں نے تحریر کیں اور دو سو سے زائد علمی، دینی اور تاریخی نوعیت کے وہ مضامین ہیں جو ملک کے مختلف مجلّات و رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ سب محض چند سال کی محنت نہیں ہے بلکہ ان کی پوری زندگی کا ثمرہ ہے۔ اس کی ابتدا طالب علمی کے اسی دور میں ہوئی، جس میں موصوف نے ان تمام صفات کو اختیار کر لیا جن کی مستقبل میں انہیں ضرورت پیش آنی تھی اور جن سے اپنی صلاحیت وقابلیت کے مطابق انہیں کام لینا تھا۔ ذیل کے چند صفحات میں ان خصوصی صفات کا جائزہ لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے بہتر مستقبل کے لئے طالب علمی کے زمانہ میں اختیار کیں:

1۔ مطالعہ کا ذوق:۔ ایک اچھا طالب علم بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان مطالعۂ کتب کا ذوق اپنے اندر پیدا کرے، اسی کے ساتھ اچھی کتابوں کو اپنا دوست بنائے، تاکہ یہ بہترین کتابیں زندگی کے مختلف مراحل میں اس کے لئے مفید ثابت ہوں۔

کتابوں کے مطالعہ کا ذوق قاضی اطہر مبارکپوری میں زمانۂ طالب علمی ہی میں پیدا ہو گیا تھا، اس کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی کہ ان کے اساتذہ مطالعہ کئے بغیر سبق نہیں پڑھاتے تھے، اس کے لئے وہ خود رات میں مطالعہ کرتے اور طلبہ کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے تاکہ وہ آسانی سے سبق کے معانی ومطالب سمجھ سکیں اور پڑھنے پڑھانے کا ذوق ان میں پیدا ہو۔ چنانچہ اساتذہ کے اس حکم کی تعمیل میں انہوں نے بھی درسی کتابوں کے مطالعہ کی عادت ڈالی اور پابندی کے ساتھ رات میں کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے، شروع شروع میں عربی زبان سے لگاؤ نہ ہونے کے سبب اس میں انہیں بڑی دشواری ہوئی جو آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ مطالعہ کے دوران متن میں جو بات یا لفظ انہیں سمجھ میں نہیں آتا اسے استاذ کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس طرح کچھ ہی دنوں میں مطالعہ کا ذوق ان میں پیدا ہو گیا۔

قاضی صاحب میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طالب علمی کے زمانہ میں ان پر دو ایک

درسی کتابیں پڑھانے کی ذمہ داری عائد کردی گئی تھی، جنہیں وہ مطالعہ کر کے پڑھاتے تھے اور ان کے ہمعصر مدرسہ کے طلبہ ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔(39)

اس طرح مذکورہ دونوں طریقوں سے مطالعۂ کتب کا ذوق پیدا ہو جانے کے بعد ان کا یہ حال ہوگیا کہ فارغ اوقات میں ہمیشہ کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک رہتے، بسا اوقات یہ انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا تھا، جیسا کہ وہ خود اس کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''درسی کتابوں کے مقابلہ میں غیر درسی کتابوں کے مطالعہ سے شغف بہت رکھتا تھا، چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی تھی، حتی کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب دیکھتا تھا، راتوں کو درسی کتاب کے مطالعہ کے بعد غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کئی گھنٹے تک کرتا تھا، گرمی کی رات میں لالٹین کے سامنے کتاب لئے پڑا رہتا تھا، بسا اوقات زبردستی اٹھایا جاتا تھا حالانکہ بچپن سے نگاہ کمزور تھی عربی شروع کرنے کے بعد عینک کا استعمال شروع کر دیا تھا بعض اساتذہ از راہ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر نہ پڑھو، ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تو میں کہتا کہ اگر ایسا ہوا تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا، کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی تھی، دانے نکل آتے تھے اور چکر آنے لگتا تھا جس کی وجہ سے دیر تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔''(40)

کتابوں کے مطالعہ کا یہ شوق اس قدر زیادہ تھا کہ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی سیکڑوں کتابوں کو انہوں نے پوری طرح کھنگال ڈالا تھا۔ ان کے مطالعہ میں زیادہ تر مسدس حالی، علمائے سلف، وفیات الاعیان اور فہرست ابن ندیم جیسی ذہن ساز کتابیں ہوتیں، جن کے مطالعہ سے ان میں اسلاف کے علمی کارناموں اور ان کے احوال وسوانح کی اتباع وتقلید کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔(41) ابتدا میں ان کتابوں کا انتخاب ان کے ماموں مولانا محمد یحییٰ کیا کرتے تھے جو قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں دارالمبلغین سے مولانا عبدالشکور فاروقی کی کتابیں ان کے پاس بھیجتے تھے، بعد ازاں جب مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے تو وہاں کی لائبریری سے کتابیں مہیا کرانے لگے، اس کے علاوہ قاضی صاحب نے کتابیں دیگر ذرائع سے حاصل کر کے بھی پڑھیں۔ اسی زمانہ میں ان کے مدرسہ میں ''جمعیۃ الطلبہ'' کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا، جس کے زیر اہتمام کتب خانہ میں تاریخ وطبقات کی بہت سی کتابیں جمع کی گئیں، قاضی صاحب نے اس کتب خانہ کی تمام کتابوں کا مطالعہ کر لیا۔

تعلیمی دور میں کثرت مطالعہ کے اس ذوق سے قاضی اطہر مبارکپوری کو مستقبل میں اپنے علمی کاموں میں بڑی مدد ملی، ان کی حوالے کی کتب اکثر عربی میں ہوا کرتی تھیں اس لئے عربی کے مشکل مفہوم کو سمجھنے میں آسانی پیدا

ہوئی، ساتھ ہی اس زبان میں موجود فنِ تاریخ کی امہات الکتب کے مطالعہ کا جذبہ جب ان میں پیدا ہوا تو اس سلسلہ کی کئی کتابیں انہوں نے بڑے شوق سے مطالعہ کیں۔ اس حوالہ سے زمانۂ طالب علمی کے ان کے ایک دوست مولانا نظام الدین اسیر ادروی لکھتے ہیں:

> ''قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے اردو اور عربی کی کتابوں میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے، جبکہ ہم لوگ اپنی عمر کے طبعی تقاضوں کے زیر اثر اردو ادب، شعر و شاعری، ناولوں اور ادبی رسالوں کی گلریز وادیوں کی سیر کو ہی حاصل زندگی سمجھتے تھے، مگر قاضی صاحب اس عمر میں تذکرۃ الحفاظ، فتوح البلدان، المسالک والممالک، تقویم البلدان، کتاب الذخائر والتحف جیسی خشک کتابوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔'' (42)

تعلیمی دور میں کتابوں کے مطالعہ کی یہ عادت جب قاضی صاحب کو پڑ گئی تو عمر بھر اس کا اثر ان پر باقی رہا، اور جب کبھی انہیں موقع ملتا کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے، حتیٰ کہ محفلوں، مجلسوں اور سفر و حضر کے فارغ اوقات میں بھی کوئی نہ کوئی کتاب شامل مطالعہ ضرور رہتی، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایک بار اگر کسی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے تو جب تک اس میں موجود اپنے موضوع سے متعلق مواد پر نظر نہیں ڈال لیتے، کتاب کو نہیں رکھتے تھے، اس حوالہ سے محمد زبیر اعظمی اپنے مضمون میں ان کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ مذکورہ دونوں حضرات (قاضی صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی) مالیگاؤں میں حاجی مصطفیٰ صاحب کے یہاں مکی منزل میں دو تین دن کے لئے فروکش تھے، کمتر علما مالیگاؤں میں ایسے ہوں گے جن کو حاجی صاحب مذکور موصوف کے یہاں رہنے اور کھانے کا موقع نہ ملا ہو اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ حاجی صاحب بڑے دریا دل آدمی تھے اور مکی منزل مہمان علما کے لئے ہی انہوں نے تعمیر کرائی ہے۔ اتفاق سے قاضی صاحب کو کہیں سے کوئی نئی یا پرانی کتاب مل گئی جس کو وہ آنکھ سے قریب کر کے پڑھنے لگے اور اس میں غرق ہو گئے۔ وہ کتاب کبھی ان کے مطالعہ میں نہیں آئی تھی لوگ محدث کبیر سے باتیں کرتے رہے اور یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے مطالعہ میں مستغرق رہے۔ کسی نے کہا کہ قاضی صاحب مطالعہ چھوڑ کر کچھ بولیں گے بھی یا پڑھتے ہی رہیں گے، محدث کبیر نے فرمایا کہ ''وہ ماننے والے نہیں کتاب ختم کر کے ہی دم لیں گے'' چنانچہ ختم کرنے کے بعد ہی لوگوں میں آ کر بیٹھے۔'' (43)

2۔ کتابوں کی خرید و فروخت اور ایک نادر و نایاب کتب خانہ کا قیام:۔ زمانۂ طالب علمی میں قاضی اطہر مبارکپوری میں ایک ذوق کتابیں جمع کرنے کا بھی پیدا ہوا۔ اس کی شروعات انہوں نے تعلیم کے ابتدائی ایام میں لکڑی کے اس صندوق میں کتابیں جمع کرنے سے کی جسے ان کی والدہ جہیز میں اپنے میکے سے لائی تھیں۔ ابتدا میں

وہ اس صندوق میں مقامات مقدسہ کے نقشے اور مختلف قسم کے سکے جمع کرتے تھے، بعد میں خرید کر یا ساتھیوں سے مانگ کر کتابیں اس میں جمع کرنے لگے۔ یہ نقشے اور چند چھوٹی موٹی کتابیں ان کا پہلا کتب خانہ تھا جسے وہ ہر دوسرے تیسرے دن قرینہ سے سجاتے تھے۔(44)

ابتدائی تعلیم کے بعد جب عربی تعلیم کا دور شروع ہوا تو کتابیں جمع کرنے کی یہ دلچسپی ان میں بڑھنے لگی، شہ اس سمت میں انہیں اپنے نانا سے ملی، ان کے پاس منظم شکل میں کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا، جسے دیکھ کر میں بھی کتابیں جمع کرنے کی حرص پیدا ہوئی اور عربی کی درسی کتابیں مثلاً میزان، منشعب، علم الصیغہ، کافیہ، دیوان متنبّی اور مقاماتِ حریری وغیرہ کو پہلے پہل انہوں نے اس میں جمع کیا، مزید برآں اردو کی بعض غیر درسی کتابیں مثلاً تواریخ حبیب الہ، الکلام المبین، حدائق البیان اور الفاروق وغیرہ بھی خرید کر جمع کیں۔ آگے چل کر جب ان میں عربی زبان سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی اور کتابوں کے مطالعہ کا ذوق ابھرا تو ادھر ادھر سے کتابیں تلاش کر کے پڑھنے لگے۔ اسی زمانہ میں ان کے پتے پر ماموں مولانا محمد یحیٰی نے ممبئی، گجرات اور دہلی کے بعض کتب خانوں سے وہاں کی فہرستِ کتب منگوائیں، جن میں فن وار کتابوں کے نام، مصنفین کے نام، سن وفات، کتابوں کے اجزاء اور قیمت وغیرہ درج ہوتیں، نیز بعض کتابوں کا تفصیلی تعارف ہوتا، قاضی صاحب ان فہرستوں کو بار بار دیکھ کر پڑھتے اور وسعت کے مطابق ان سے اپنے ذوق کی کتابوں کا انتخاب کرتے تھے۔(45)

روز بروز کتابوں سے دلچسپی میں اضافہ اور ذوق مطالعہ کے سبب قاضی اطہر مبارکپوری کو مذکورہ فہرستوں کی اکثر کتابیں حاصل کرنے کی خواہش ہوئی، لیکن معاشی حالات تنگ ہونے کے سبب ان کے حصول سے قاصر تھے، لیکن جلد ہی اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے دو طریقے اختیار کیے، اول جلد سازی (46) کا کام شروع کیا، جس کے لئے چھٹی کے دن آٹھ میل کی مسافت پیدل طے کر کے شہر اعظم گڑھ سے سامان لاتے، اور دوم کتب خانہ رشیدیہ دہلی (یہ دہلی کی جامع مسجد کے سامنے عربی، اردو اور فارسی کی درسی وغیر درسی کتابوں کا ایک بڑا کتب خانہ تھا جو غالباً 2015ء میں بند ہوگیا) سے تاجرانہ نرخ پر اس طرح کتابیں منگوانے لگے کہ عام کتابوں پر روپے میں چار آنے، مصری کتابوں پر دو آنے اور قرآن مجید پر ان کو اس سے زیادہ کمیشن ملتا تھا، ان کے علاوہ مدرسہ کے طلبہ اور قصبہ کے لوگوں کی فرمائش پر جو کتابیں منگواتے انہیں درج شدہ قیمت پر دیتے تھے، پھر دونوں ذرائع سے مطلوبہ رقم جب ان کے پاس جمع ہو جاتی تو اپنی پسندیدہ کوئی کتاب خرید لیتے تھے۔ اس طرح طالب علمی کے دس سالہ دور میں انہوں نے متعدد جلدوں پر مشتمل 34 کتابیں سو روپے سے بھی کم قیمت پر خریدیں، جنہیں خریدنے کے لئے آج

بیس ہزار بھی شاید کم پڑیں۔اپریل 2019ء میں قاضی اطہر مبارکپوری کے گھر پر چھ دن قیام کے دوران جب ان کے کتب خانہ کا جائزہ لیا گیا تو طالب علمی کے دوران خریدی گئی اکثر کتابوں کو وہاں پایا اور جب ان کتابوں کی فہرست تیار کی تو ان کی مجموعی تعداد 155 تھی جن میں سے کئی کتابیں 2، 3، 4، 8 اور 12 جلدوں پر مشتمل تھیں، یہ تعداد ان کتابوں سے علیحدہ ہے جو کتب خانہ کے علاوہ گھر کے دوسرے حصوں میں رکھی ہوئی تھیں، فن کے لحاظ سے ان میں سے اکثر کا موضوع تاریخ تھا۔مطبوعات کے علاوہ اس کتب خانہ میں قاضی صاحب نے کچھ ایسے مخطوطات بھی جمع کئے تھے جو انہیں قصبہ ہی میں کہیں سے مل گئے تھے یا پھر ایسی کتابیں جو ان کے ذوق کی ہوتی تھیں مگر ان کے حصول کی کوئی صورت نہ ہوتی تو موٹے کاغذ پر وہ اسے نقل کرلیا کرتے تھے، اس قسم کے دس مخطوطات کا اپنی خود نوشت میں انہوں نے تذکرہ کیا ہے،(47) حالانکہ ان کے کتب خانہ کا جائزہ لینے کے دوران ایسا کوئی بھی نسخہ مقالہ نگار کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ بہر حال قاضی اطہر مبارکپوری نے طالب علمی کے زمانہ میں مطبوعات ومخطوطات کا ایک نہایت وقیع اور قابلِ قدر کتب خانہ جمع کرلیا تھا، ساتھ ہی موصوف نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی حفاظت کی اور اس میں موجود ہر کتاب سے بھر پور استفادہ بھی کیا۔ آج عربی زبان میں نادر ونایاب مطبوعات پر مشتمل فن تاریخ سے متعلق امہات الکتب کا یہ ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے، جسے علمی ورثے کے طور پر ان کی اولاد سنبھالے ہوئے ہے۔

3۔مضمون نگاری:۔ کتابوں کی خرید وفروخت اور مطالعہ کے علاوہ طالبِ علمی کے ایام میں قاضی اطہر مبارکپوری میں مضمون نگاری کا ذوق بھی پیدا ہوا جس کا سبب ان کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری اور ان کا ذاتی کتب خانہ بنا ۔ان کے نانا کے کتب خانہ میں عربی ، فارسی اور اردو زبان کی مختلف موضوعات پر مشتمل مخطوطات ومطبوعات تین بڑی الماریوں میں نہایت قرینہ سے رکھی رہتی تھیں، ایامِ تعطیل میں جب وہ ڈھاکہ (جہاں وہ مدرس تھے) سے اپنے گھر رسول پور واپس آتے تو کتب بنی اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں مصروف رہتے ، اس عرصہ میں قاضی صاحب، جن کی عمر اس وقت دس بارہ سال رہی ہوگی ، ان سے ملنے جاتے تو دیکھتے کہ کتابیں چٹائی پر پڑی ہیں اور نانا ان سے اخذ واقتباس کررہے ہیں، اس دوران جب نانا کہیں چلے جاتے تو یہ جناب کمرے میں جاکر ان کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتے اور پھر واپس اپنی جگہ رکھ دیتے ، اسی طرح بسلسلہ تدریس وتعلیم نانا اور ماموں کی عدم موجودگی میں جب کبھی قاضی صاحب کا اپنے نانیہال جانا ہوتا تو کتب خانہ میں بیٹھ کر ان کی کتابیں الماری سے نکال کر دیکھتے ، حالانکہ اس عمر میں ان میں نہ کتاب پڑھنے کی صلاحیت تھی اور نہ سمجھنے کی ۔ اکثر کتابوں میں حواشی و تعلیقات اور بعض میں مضامین کی شکل میں نانا کی تحریریں ہوا کرتی تھیں جنہیں قاضی صاحب غور سے دیکھتے تھے،

لاشعوری طور پر ان کی تحریروں کو دیکھنے کے اس عمل نے ان میں اخذ و اقتباس کا ذوق پیدا کیا، جس سے شہ پاکر اپنی استعداد کے مطابق وہ ان کے کاموں کی نقل کرنے لگے اور جب عربی درجات میں پہنچ کر کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق بڑھا تو یہی روشنی کام آئی جس نے ان میں مضمون نگاری کا رجحان پیدا کیا۔(48)

قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنے اندر مضمون نگاری کا ذوق پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ زمانہ طالب علمی میں بزم احباب احمد آباد نامی ایک تنظیم نے مدرسہ احیاء العلوم کے طلبہ سے ائمہ اربعہ کی سوانح حیات پر مضامین طلب کیے، جنہیں بعض اساتذہ نے تصنیف وتالیف کا ذوق نہ ہونے کے سبب بڑی مشکل سے ترتیب دیا، اس واقعہ کے بعد اراکین مدرسہ کو طلبہ میں تحریری ذوق پیدا کرنے کا احساس ہوا جس کے تحت مدرسہ میں ''جمعیۃ الطلبہ'' کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لئے تاریخ وادب کی متعدد کتابیں خریدی گئیں، نیز معارف (49)، برہان (50) اور جامعہ (51) جیسے علمی وادبی رسالے منگائے گئے، ساتھ ہی ''الاحیاء'' کے عنوان سے ایک رسالہ جاری کیا گیا جو چند شماروں کی اشاعت کے بعد بند ہوگیا۔ مدرسہ میں فوری طور پر قائم ہونے والا یہ جدید ماحول ان کے حق میں مفید ثابت ہوا۔(52)

پڑھنے کے ساتھ ساتھ جب لکھنے کی صلاحیت بھی قاضی اطہر مبارکپوری میں پیدا ہوگئی تو مضمون نگاری کا شوق ابھرا، یہ 1934ء کا دور تھا اور اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس زمانہ میں برصغیر کے مختلف شہروں سے اردو زبان میں مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''برہان'' دہلی، رسالہ ''جامعہ'' دہلی اور سہ روزہ ''زمزم'' لاہور جیسے دینی، علمی، ادبی اور سیاسی نوعیت کے متعدد رسائل وجرائد نکلتے تھے جن میں سے بعض اپنے اعلیٰ معیار کے لئے ملک بھر میں مخصوص شناخت قائم کر چکے تھے اور ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ انہیں اہتمام کے ساتھ پڑھتا تھا کیونکہ اس وقت یہ رسالے اور ان میں شائع ہونے والے مضامین معاشرے میں ویسے ہی مروج تھے جیسا کہ آج کل دنیا بھر میں سوشل میڈیا پر مختلف قسم کی خبریں موضوع سخن بنی رہتی ہیں۔ ایسے دور میں قاضی صاحب نے مضمون نگاری کی ابتدا کی اور باقاعدہ اپنا پہلا مضمون بعنوان ''مسافت'' تحریر کیا جو 1353ھ / مطابق دسمبر 1934ء میں رسالہ ''مومن'' بدایوں میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس مضمون کا تعارف ان الفاظ کے ساتھ کرایا ہے:

''یہ جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب اعظمی متعلم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کا پہلا مضمون تھا۔''

اور پھر اصل مضمون نقل کردیا جو کہ حسب ذیل ہے:

''بنی نوع انسان میں مساوات ویکسانیت کا حد اعتدال پر قائم رہنا اتنا ضروری اور لازمی ہے کہ جس

کے بغیر نہ کسی سلطنت کا نظام اچھی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی جماعت فروغ پا سکتی ہے، جو مذہب یا قانون مساوات و یکسانیت سے خالی ہے سمجھ لو کہ وہ بالکل ناقص ہے، اسی طرح جو جماعت یا سوسائٹی اپنے افراد میں مساوات و یکسانیت بدرجہ اتم قائم و برقرار نہ رکھ سکتی ہو یقین کر لو کہ وہ آج نہیں تو کل دنیا سے فنا ہو جائے گی ۔ اس طرح ہر نظام اور ہر سوسائٹی کی روح رواں حقیقت میں مساوات اور صرف مساوات ہے، آج کل دنیا کی کوئی قوم اور مذہب ایسا نہیں جو مساوات کا دعویدار نہ بنتا ہو۔ لیکن جب ایک انصاف پسند انسان صحیح طریقہ پر اس کی جانچ کرنے بیٹھتا ہے تو اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اس امتحان میں پورا نہیں اترتا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلام نے اس دور میں دنیا کے اندر مساوات کی بنیاد ڈالی جبکہ سارے عالم پر خودنمائی اور خود پسندی کا بھوت سوار تھا۔ کہا جاتا ہے اسلام دنیا سے بت پرستی مٹانے آیا تھا بیشک اس نے ظاہری بت پرستی کو بھی دنیا سے مٹایا اور غرور و پندار کے بتوں کو بھی سارے جہاں سے نیست و نابود کر دیا، عرب جہاں پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کی پرستش میں مبتلا تھا وہاں اس میں خود ساختہ خاندانی بت اور نسلی شرافت کی دیویاں بھی بکثرت پوجی جاتی تھی ۔ اور اکثر غریب اور کمزور جماعتوں کے حقوق نہایت بے دردی کے ساتھ پامال کر دیے جاتے تھے۔ اسلام نے آ کر اہل عرب سے اس لعنت کو دور کیا، غریبوں کو نوازا اور غلاموں کی دلجوئی کی، جس کی برکت سے اہل عرب میں ایک اجتماعی طاقت پیدا ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آن واحد میں سارے جہاں پر چھا گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اسلام ایک عالمگیر مذہب بن گیا۔ فروغِ اسلام کے لیے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے اس قابلِ رشک فروغ میں صرف ایک باہمی مساوات و یکسانیت کا راز پنہا تھا جس کو اسلام نے کبھی اور کسی حالت میں نظر انداز کر دینا روا نہ سمجھا اور اب تک بھی تمام اسلامی کتابیں اس یکسانیت و مساوات کی پاک تعلیم سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں اور قانون اسلام کی ساری دفعات و احکامات میں اس وقت تک پوری پوری مساوات و یکسانیت موجود ہے۔ چنانچہ آپ کو ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں پوری پوری مساوات نہ پائی جاتی ہو۔'' (53)

اس مختصر مضمون کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد ان کے دو اور مضامین بعنوان ''رہا دین باقی نہ اسلام باقی'' اور ''بلا کشانِ اسلام'' بالترتیب رسالہ ''مومن'' بدایوں اور ''العدل'' گوجرانوالہ پنجاب (موجودہ پاکستان) میں شائع ہوئے ۔ ان چند مضامین کے شائع ہونے کے بعد مضمون نگاری کا سودا ان میں یوں سمایا کہ گھر میں اسٹول، میز، قلم، کاپی اور کاغذات وغیرہ کا انتظام کیا اور اپنے تعلیمی اوقات میں سے کچھ وقت اس کے لئے فارغ کر کے مخصوص کر لیا۔ (54)

اسی زمانہ (1357ھ/1937ء) میں ان کی ملاقات مولانا سید محمد میاں سے ہوئی، جو مدرسہ احیاء العلوم کے ایک جلسہ کی صدارت کے لئے مبارک پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہاں قاضی صاحب سے انہوں نے کچھ اشعار سنے اور پسند آنے کے بعد حال ہی میں جاری کردہ اپنے رسالہ ماہنامہ ''قائد'' میں شائع کردیئے۔(55) ساتھ ہی انہیں اس رسالہ کے لیے مضامین لکھنے کا مشورہ بھی دیا، جسے قاضی صاحب نے قبول کرلیا اور ائمہ اربعہ کے مختصر حالات پر چند مضامین لکھ کر انہیں بھیج دیئے، مولانا نے ان مضامین کو نہ صرف ماہنامہ ''قائد'' میں شائع کیا بلکہ آئندہ کے لئے قاضی صاحب کو اس کے مستقل مضمون نگاروں کی فہرست میں شامل کرلیا اور جب تک یہ رسالہ جاری رہا، اس میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔(56)

مولانا محمد میاں اور ان کے رسالہ نے مضمون نویسی کے میدان میں قاضی اطہر مبارکپوری کی کافی رہنمائی کی ، نیز انہیں ایک اچھا مضمون نگار بنانے میں یہ دونوں بڑے معاون ثابت ہوئے ، چنانچہ بعد میں ان کے جو علمی مقالات اور تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں وہ سب مولانا محمد میاں اور رسالہ ''قائد'' کے رہین منت ہیں، جیسا کہ اس حوالہ سے خود قاضی اطہر مبارکپوری کا بیان ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

> ''مولانا مرحوم (مولانا سید محمد میاں) اس سلسلہ میں (مضمون نگاری) میرے اولین محسن و مربی ہیں اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ قائد میں میرے مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف و تالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانی طبع نامساعد حالات کی نظر ہوگئی ہوتی۔''(57)

مضمون نگاری میں قاضی صاحب کو کسی کی شاگردی حاصل نہیں ہوئی بلکہ یہ ان کا اپنا ذوق تھا جس نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی اور خود اعتمادی نے ان کی ہمت بڑھائی۔ اس سلسلہ میں ان کا طرزِ تحریر یہ تھا کہ ایک مضمون کئی مرتبہ لکھنے کے بعد پھاڑ دیتے اور کافی محنت کے بعد جب وہ ذوق کے مطابق ہوجاتا اور انہیں لگتا کہ اب اشاعت کے قابل ہوگیا ہے تو اسے چھپنے کے لئے کسی رسالے میں بھیج دیتے اور جب وہ چھپ کر آجاتا تو دوسرے مضمون کی تیاری میں لگ جاتے۔ اس طرح چند سال کی مشق کے بعد وہ ایک اچھے مضمون نگار بن گئے اور تقریباً پوری زندگی اسی میدان میں مصروف رہے۔

4۔شعر و شاعری:۔ شعراء کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ طویل مضامین اور قصے کہانیوں کو چند اشعار کے اندر بیان کردیتے ہیں جس سے عوام میں انہیں بڑی مقبولیت ملتی ہے، یہ روایت آج بھی ویسے ہی برقرار ہے جیسے سابقہ زمانہ میں قائم تھی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے نقطۂ اتصال پر برصغیر کا شمالی حصہ اردو شعر و شاعری کی بزم گاہ بنا ہوا تھا

جہاں ہر طرف اکبرالہ آبادی (م 1921ء) اور اقبال (م 1938ء) جیسے مصلح شعراء کا شہرہ تھا اور مسدس حالی جیسی فکر انگیز نظمیں ہر قسم کی مذہبی، سماجی رسموں اور جلسے جلوسوں کے موقعوں پر پڑھی جاتی تھیں، اور اسکول و مدارس کے طلباء اس فن کو سیکھنے کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔ فن شعر و شاعری کے اس سازگار ماحول سے جب قاضی اطہر مبارکپوری کا سابقہ پڑا تو وہ بھی اس کے گرویدہ ہو گئے اور اس فن کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ چودہ برس تھی اور اردو زبان کی تعلیم اپنے اختتام تک نہیں پہنچی تھی۔

مضمون نگاری کی طرح اس فن میں بھی انہیں کسی کی اصلاح یا مشورہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ یہاں بھی اپنے ذوق اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے، البتہ غزل گوئی میں اصغر گونڈوی (م 1936ء) اور نظم میں احسان دانش (م 1982ء) کے مطبوعہ دیوانوں سے اصلاح ضرور لی، اور اس فن میں وہ اس قدر منہمک ہوئے کہ طالب علمی کے پورے دوران پر اس کا خمار چھایا رہا، جس میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دن میں کئی کئی نظمیں اور غزلیں کہتے تھے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں وقت اور ماحول کے لحاظ سے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں جنہیں وہ قصبہ میں منعقد ہونے والے جلسوں، عوامی مجمعوں اور دوستوں کی محفلوں میں پڑھتے تھے۔ اس فن سے انہیں مبارک پور میں بڑی شہرت ملی اور جب ان کے اشعار ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تو دور دراز کے علاقوں میں بھی متعارف ہوئے۔ ان کی پہلی نظم ''مسلم کی دعا'' رسالہ ''الفرقان'' بریلی (بعد میں لکھنؤ) کے جمادی الثانیہ 1357ھ/1938ء کے شمارہ میں شائع ہوئی، بعد ازاں روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی، سہ روزہ ''زمزم'' لاہور اور ماہنامہ ''دار العلوم'' دیوبند جیسے اخبار و رسائل میں ان کی نظمیں اور غزلیں چھپنے لگیں، جس سے بہ حیثیت شاعر وہ عوام میں مشہور ہوئے۔ (58)

قاضی اطہر مبارکپوری کے تابناک مستقبل کے لئے یہ فن بہت مفید ثابت ہوا، کیونکہ اس سے انہیں زندگی میں دو چیزیں حاصل ہوئیں، اول آئندہ زندگی کے لئے وہ راستہ ہموار ہوا جو انہیں طے کرنا تھا۔ اس حوالہ سے ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میری خورد (معمولی) شاعری نے مجھے آگے بڑھانے میں بڑی مدد کی، لاہور کے اخبار ''زمزم'' اور اخبار ''مسلمان'' (بعد میں کوثر) میں میرے اشعار کثرت سے چھپتے تھے، جس سے میں بہ حیثیت شاعر متعارف ہوا اور یہی تعارف مرکز اہل سنت امرتسر اور اخبار زمزم لاہور جانے کا سبب بنا اور یہی بمبئی جانے کا سبب بنا، اس طرح میری شاعری نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ (59)

اور دوم اس فن نے انہیں ایک نیا نام دیا جس کی نسبت سے وہ دنیا میں مشہور ہوئے۔ ان کا اصل نام عبد الحفیظ تھا، لیکن شاعری کی بزم میں جب انہوں نے قدم رکھا تو اپنے لئے ''اطہر'' تخلص اختیار کیا اور جب اس فن میں انہیں شہرت ملی تو یہ نام عوام میں اس قدر معروف ہوا کہ اصل نام پس پشت رہ گیا۔ اس تعلق سے ایوب مبارکپوری نے ان کے مرثیہ میں کہا ہے:

شاعری کی بزم میں آکر سخن ور ہوگئے
تھے کبھی عبد الحفیظ اب قاضی اطہر ہوگئے (60)

لیکن اس فن سے تا حیات ان کا تعلق قائم نہ رہ سکا اور جلد ہی انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی، چنانچہ زندگی کے اس موڑ کی بابت تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اب اس سے (شعر و شاعری) میرا تعلق نہیں رہا، معلوم نہیں میں نے اس سے بے وفائی کی یا اس نے مجھے اچھی راہ پر لگا کر کنارہ کشی اختیار کر لی۔''(61)

حمد، نعت، نظم اور غزل کی شکل میں قاضی اطہر مبارکپوری نے عہد شباب میں جو اشعار کہے، بعد میں ان کے بیٹوں کے تعاون سے مولانا قمر الزماں مبارکپوری نے انہیں ترتیب دے کر'' مئے طہور'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس دیوان پر تفصیلی بحث اگلے باب میں آئے گی، البتہ یہاں مشہور شاعر جناب احسان دانش کے دو مختصر مگر جامع جملے قابل ذکر ہیں جن میں موصوف قاضی صاحب اور ان کی شاعری پر تبصرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' قاضی اطہر مبارکپوری شاعر بھی ہیں اور بہت ہی سنبھلا ہوا شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ابتذال نہیں ملتا اور انسانی اقدار ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔''(62)

یہ تھے وہ اوصاف جو طالب علمی کے زمانہ میں قاضی اطہر مبارکپوری نے اختیار کئے، آگے چل کر انہوں نے اس میں مزید اضافہ کیا اور ان کے ذریعہ مختلف موضوعات پر بیش قیمت مقالات و تصانیف لکھ کر علمی میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

نکاح

مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیم کے دوران 1936ء میں قاضی اطہر مبارکپوری ازدواجی زندگی سے منسلک ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر 20 برس تھی، ان کے والد نے ان کے ایک استاذ مولانا نعمت اللہ صاحب کی بیٹی سے ان کا نکاح کرادیا، مگر یہ ازدواجی رشتہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور جلد ہی میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہوگئی۔ (36)

پھر ایک سال کے بعد 1937ء میں ان کا دوسرا نکاح قصبہ ولید پور (موجودہ ضلع مئو) کے محمد یعقوب صاحب کی بیٹی سائرہ خاتون سے ہوا۔ پہلی بیوی کے بالمقابل یہ اپنے شوہر کے حق میں بہتر ثابت ہوئیں، بڑی نیک اور خداترس خاتون تھیں، قاضی اطہر مبارکپوری کی کل اولاد (چھ بیٹے اور دو بیٹیاں) انہی کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ (37) سائرہ خاتون نے ان کے بچوں کی اچھی تربیت کی اور سبھی کو اعلیٰ تعلیم دلائی، حالانکہ نکاح کے بعد ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور میں معاشی تنگی کی بنا پر یہ متعدد قسم کی خانگی پریشانیوں سے بھی دوچار ہوئیں لیکن ہمیشہ صبر کیا اور کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ صوم وصلوٰۃ کی نہایت پابند تھیں اور امور خانہ داری کے علاوہ قاضی صاحب کی والدہ کی طرح گھریلو مکتب چلاتی تھیں۔ (38) غرض یہ کہ مستقبل میں شوہر کی زندگی کو کامیاب بنانے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔

قاضی اطہر مبارکپوری میدان عمل میں

1940ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے ملازمت کی تلاش شروع کی، اس کے لئے پہلے مولانا عبیداللہ سندھی (م 1944ء) سے، جو کہ اس زمانہ میں دہلی میں مقیم تھے، خط وکتاب کی، لیکن کوئی صورت نہ نکلی، بعد ازاں اپنے استاذ مولانا شکر اللہ صاحب کے مشورہ سے لکھنؤ جاکر مولانا محمد منظور نعمانی (م 1997ء) سے رابطہ کیا، یہاں سے بھی اطمینان نہ ہوا تو لکھنؤ ہی میں واقع جمعیۃ علماء ہند صوبہ اترپردیش کے دفتر چلے گئے لیکن وہاں بھی کوئی موافق کام نہ مل سکا، بالآخر نامراد ہوکر وطن لوٹ آئے۔ انہی ایام میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے توسط سے انہیں برطانوی حکومت کے زیرِ اقتدار برما کے جیل خانہ میں ایک دینی عالم کے عہدہ کی پیشکش ہوئی، جسے انہوں نے قبول کرلیا اور برما جانے کی تیاری میں لگ گئے، لیکن جیل کے افسر کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہر طرف سے ناکامی کے بعد جب کوئی راستہ نہ نکلا تو مجبوراً مذکورہ استاذ کی فرمائش پر حسبۃً للہ مدرسہ احیاء العلوم میں درس وتدریس کی خدمت قبول کی اور کسی طرح سال پورا ہونے کے بعد پندرہ روپے ماہانہ کے عوض تنخواہ دار استاذ مقرر ہوئے۔ اس طرح 1941ء میں اس قلیل مشاہرے سے انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ (63)

1940ء سے 1944ء تک تقریباً پانچ سال قاضی اطہر مبارکپوری نے مدرسہ احیاء العلوم میں تدریسی فرائض انجام دیے اور چھوٹے بڑے درجات میں عربی نصابِ تعلیم کی آٹھ کتابیں پڑھائیں، جن میں ہدیہ سعدیہ اور مقامات حریری ہمیشہ ان کے سپرد رہیں۔ اس دوران درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی انہوں نے جاری رکھا، چنانچہ اسی زمانہ میں ''**مرآت العلم**'' کے نام سے عربی زبان میں اپنی پہلی کتاب تحریر کی، مزید برآں ''اصحابِ صفہ'' کے عنوان سے دوسو پچاس اشعار پر مشتمل ایک نظم قلم بند کی، نیز طلبہ اور اساتذہ میں عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے پروفیسر محمد حسن الاعظمی، جو کہ ان دنوں مصر سے اپنے وطن مبارک پور آئے ہوئے تھے، کی سرپرستی میں ''رابطۃ الادباء'' نامی ایک انجمن قائم کی اور اس کے زیرِ اہتمام ''مجلہ رابطۃ الادباء'' کے نام سے دو تین پرچے بھی نکالے، لیکن یہ انجمن زیادہ دن نہ چل سکی اور سطورِ بالا میں مذکور منظوم کتاب بھی غیر شائع شدہ حالت میں دست برزمانہ کی نذر ہوگئی۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی مدرسی کا یہ زمانہ عالمی سطح پر بڑا نازک تھا، دنیا میں دوسری عالمی جنگ (1945ء

-1939ء)جاری تھی اور سیاسی لحاظ سے اس وقت کے ہندوستان میں ہنگامہ خیز حالات برپا تھے جس کے باعث پورا ملک فسادات اور سیاسی ہنگاموں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ایسی نازک گھڑی میں ان کے گھریلو حالات بھی کچھ بہتر نہ تھے، میاں، بیوی اور دو بچوں کو ملا کر چار افراد پر مشتمل ایک خاندان تھا جس کی پندرہ روپے ماہانہ آمدنی بسر کے لیے ناکافی تھی۔زمانہ تدریس کے اس مفلوک الحال دور کو انہوں نے ''صبر ایوب'' اور ''گریۂ یعقوب'' سے تعبیر کیا ہے۔(64)

تقریباً پانچ برس تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد قاضی صاحب نے 1944ء میں مدرسہ سے تعلق منقطع کرلیا۔سبب اس کا ان کا وہ مشاہرہ بنا جس میں کچھ عرصہ پہلے تین روپے کا اضافہ ہوا تھا۔دراصل مدرسہ کے ناظم اور ان کے استاذ مولانا شکر اللہ مبارکپوری کا انتقال تدریس کے دوسرے سال ربیع الاول 1361ھ / 1942ء میں ہو چکا تھا، ماسوا ان کے بقیہ اراکین مدرسہ سے ان کے تعلقات بہتر نہیں تھے اور جب تنخواہ میں تین روپے کا اضافہ ہوا تو تعلقات میں مزید کشیدگی بڑھ گئی، اس کے باوجود اپنے تعلیمی مزاج اور گھریلو حالات کے پیش نظر ان کا خیال تھا کہ تنخواہ اگر اٹھارہ روپے سے بڑھ کر پچیس روپے ہو جائے تو مستقل طور پر مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہوں گا، مگر اس کی توقع انہیں بالکل نہیں تھی کیونکہ تین روپے کے اضافہ پر ہی بعض اراکین طنز کرتے تھے، بالآخر چند دنوں بعد اس معاملہ نے نازک صورت اختیار کرلی اور ایک رات مدرسہ کے ذمہ داران اور مدرسین کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، جس میں اراکین مدرسہ کے ہتک آمیز رویہ پر قاضی اطہر مبارکپوری نے مدرسہ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اسی وقت مندرجہ ذیل عبارت سے ملتے جلتے الفاظ ایک کاغذ پر لکھ کر استعفیٰ دے دیا:

> ''مدرسی اور معلمی کے شریف دامن کو جب ''جہالت کے شرارے'' جلا دینا چاہتے ہوں، تو ایسی حالت میں علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے، فی الحال میری اس تحریر کو استعفیٰ سمجھا جائے، ویسے مدرسہ اپنا ہے۔آئندہ حسب قدرت خدمت سے دریغ نہیں ہوگا۔''(65)

امرتسر میں مختصر قیام

مدرسہ احیاء العلوم سے علیحدہ ہونے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے ایک مرتبہ پھر روزگار کی تلاش شروع کی، البتہ ان کا رجحان اس مرتبہ درس و تدریس کے بجائے تصنیف و تالیف اور مضمون نویسی کی طرف تھا، اس لئے انہوں نے امرتسر میں قائم شدہ ''مرکز تنظیم اہلِ سنت'' سے مراسلت کی۔اس ادارہ کے ذمہ دار دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ایک ملتانی عالم مولانا نور الحسن بخاری تھے جو طبعاً بڑے نیک اور خوش مزاج تھے۔اس زمانہ میں ان کے مضامین شیعیت اور قادیانیت کی تردید میں لاہور کے سہ روزہ ''زمزم'' میں شائع ہوتے تھے اور خوش قسمتی سے

قاضی صاحب کی نظمیں اور غزلیں بھی اسی اخبار میں ''مئے طہور'' کے عنوان سے چھپتی تھیں، اس لئے دونوں ایک دوسرے سے غائبانہ طور پر متعارف تھے۔ مولانا نور الحسن بخاری کو جب ملازمت کے حوالہ سے درخواست پر مبنی قاضی اطہر مبارکپوری کا خط ملا تو انہوں نے انشراح قلب کے ساتھ ان کی یہ درخواست قبول کی اور جواب میں لکھا:

''مرکز تنظیم میں تیس روپیہ ماہوار اگر منظور ہو تو آ جایئے۔''(66)

امید سے زیادہ تنخواہ کی اس پیشکش کو قاضی صاحب نے فوراً قبول کر لیا اور نومبر 1944ء کی کسی تاریخ میں بذریعہ ٹرین دہلی کے راستہ امرتسر پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھائیس برس تھی اور مستقبل میں حاصل ہونے والی کامیابی کی راہ پر یہ ان کا پہلا قدم تھا۔

امرتسر میں قاضی صاحب ''شریف لاج'' کٹرہ مہان سنگھ میں واقع مولانا نور الحسن کے مکان پر جا کر ٹھہرے اور ڈیڑھ ماہ یہیں ان کا قیام رہا۔ مولانا نور الحسن ان سے ردّ شیعیت اور قادیانیت پر مضامین لکھنے میں مدد لیتے تھے، اس کے علاوہ ان مضامین کو لاہور میں واقع سہ روزہ ''زمزم'' کے دفتر تک پہنچانا بھی ان کے ذمہ تھا، جس کے لئے ہفتہ میں دو مرتبہ لاہور ان کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ مولانا نور الحسن کے کام سے فارغ ہونے کے بعد قاضی صاحب بقیہ وقت مشہور اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری (م 1948ء) کی صحبت میں گزارتے تھے اور بعض دفعہ ان کی خواہش پر فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ امرتسر میں ڈیڑھ ماہ قیام کے دوران انہیں نہ شہر سے انسیت پیدا ہوئی اور نہ یہاں کے لوگوں سے، کیونکہ یہاں پنجابی زبان بولی جاتی تھی جس سے وہ بالکل نا آشنا تھے۔ بہر حال ڈیڑھ دو ماہ بعد جنوری 1945ء میں جب انہیں لاہور میں امرتسر سے بہتر کام کرنے کا موقع ملا تو وہ وہاں منتقل ہو گئے۔

لاہور کے ایّام

لاہور، امرتسر سے تیس میل کے فاصلہ پر بجانب مغرب ایک تاریخی شہر ہے جسے برصغیر کی تقسیم سے قبل میدانِ سیاست میں غیر معمولی حیثیت حاصل تھی، اس کے علاوہ اس وقت یہ شہر دہلی اور حیدر آباد کے بعد اردو زبان و ادب کا تیسرا اہم علمی مرکز تھا جہاں اس زبان کے ماہرین جمع ہوتے تھے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے لئے یہ شہر ان کے خوابوں کی تعبیر تھا، کیونکہ طالب علمی کے زمانہ سے ان کی نظمیں اور غزلیں یہاں کے اخباروں میں شائع ہوتی تھیں، بقول ان کے:

''میری غزلیں اور نظمیں لاہور کے سہ روزہ ''زمزم'' اور سہ روزہ ''مسلمان'' بعد میں ''کوثر'' میں زیادہ

شائع ہوتی تھیں۔'' (67)

امرتسر میں قیام کے دوران قاضی صاحب مرکز تنظیم اہل سنت کے مضامین نشر کرنے کی غرض سے لاہور لے جاتے اور ہفتہ میں دو دفعہ رات اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں گزارتے تھے۔ اس دوران دفتر کے تمام عملہ سے ان کے اچھے مراسم استوار ہوگئے۔ حسب سابق اس عرصہ میں بھی ان کی کئی نظمیں سہ روزہ ''زمزم'' میں شائع ہوئیں، مگر ان کے حوالہ سے ابھی بھی مابین پردہ حائل رہا کیونکہ نظمیں قاضی اطہر کی ہوتی تھیں اور موضوع تحریر یہاں اپنے اصل نام عبدالحفیظ سے متعارف تھے۔ غلط فہمی یا ناقص تعارف کا یہ خیالی ڈرامہ مہینہ بھر چلا اور پھر پنجاب کے کسی کالج کے پروفیسر کے توسط سے، جنہوں نے ایک رات قاضی صاحب کے ہمراہ زمزم کے دفتر ہی میں گزاری تھی، یہ راز فاش ہوا، اس پر مدیر مسئول منشی عبدالرحیم اور مدیر تحریر مولانا محمد عثمان فارقلیط نے پہلے انہیں خوب ڈانٹا اور پھر دفتر میں کام کرنے والے کل عملہ سے یہ کہہ کر ان کا مکمل تعارف کرایا کہ یہ نوجوان وہی قاضی اطہر ہیں جن کی نظمیں ہم سالوں سے اپنے اخبار میں چھاپ رہے ہیں۔ (68)

حقیقی واقفیت کے بعد ایک روز مذکورہ دونوں افراد نے قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریری صلاحیتوں کو مدنظر رکھ کر انہیں امرتسر سے لاہور منتقل ہونے کا مشورہ دیا، ساتھ ہی ان پر یہ واضح بھی کیا کہ زمزم کمپنی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی نگرانی میں ایک تفسیر شائع کرنے والی ہے، جس کی جمع وتدوین کا کام آپ کے سپرد ہوگا اور معاوضہ کے طور پر ماہانہ ساٹھ روپے آپ کو دیے جائیں گے۔ قاضی صاحب کو ان کی یہ پیشکش پسند آئی، لیکن چونکہ مولانا نورالحسن بخاری کے ملازم کی حیثیت سے وہاں گئے تھے اس لئے اخلاقی طور پر ان سے مشورہ کئے بغیر اسے قبول کرنا غیر مناسب سمجھا، لہٰذا چند روز کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں مولانا نورالحسن سے بات کی، جسے انہوں نے بغیر کسی اعتراض کے نہ صرف پسند کیا بلکہ خود زمزم کے دفتر جا کر اس حوالہ سے مزید گفتگو کی۔ اس طرح قاضی صاحب مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر کو خیرآباد کہہ کر زمزم لمٹیڈ کمپنی لاہور سے منسلک ہوگئے۔ (69)

امرتسر سے لاہور منتقل ہونے کے بعد جنوری 1945ء سے جون 1947ء تک قاضی اطہر مبارکپوری نے ڈھائی برس زمزم کمپنی لمٹیڈ میں ملازمت کی۔ یہاں ان کے کام کی شروعات تفسیر قرآن سے ہوئی، جس کی تالیف کے لئے مولانا اشرف علی تھانوی (م1943ء) کے ترجمۂ قرآن کے علاوہ تفاسیر میں تفسیر بیان القرآن، تفسیر حقانی تفسیر ثنائی، ترجمان القرآن، تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی کے مطبوعہ نسخے جمع کئے گئے۔ ابتدا میں اس کام کے لئے ان کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ طے ہوئی، لیکن کام کی اہمیت اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے جلد ہی اس میں اضافہ کر دیا

گیااور ساٹھ روپے سے پہلے سو روپے پھر چند ماہ بعد ایک سو ساٹھ روپے کر دی گئی، تنخواہ میں بلا طلب اس اضافہ سے قاضی صاحب کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔

تقریباً ڈیڑھ سال اس کام میں صرف کرنے کے بعد جون 1946ء میں قاضی صاحب نے مذکورہ تفاسیر کا خلاصہ ''منتخب التفاسیر'' کے عنوان سے تیار کیا۔ ترتیب کے بعد اس کی کتابت کا کام بھی انہی کی زیرنگرانی شروع ہو کر تیرہ پاروں تک پورا ہو گیا، مگر اسی دوران 3 جون 1947ء کو تقسیم ملک کی تاریخ کا وہ اعلان بھی ہو گیا جس کی جد وجہد برسوں سے قومی سیاسی پارٹیاں کر رہی تھی اور جب تقسیم کا وقت قریب آیا تو ملک بھر میں فسادات برپا ہو گئے۔ دوسرے صوبوں کی بہ نسبت پنجاب اور بنگال میں حالات زیادہ کشیدہ تھے اس لئے قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ اہم تالیف طباعت واشاعت سے پہلے ہی اس پر آشوب ہنگامہ کی نذر ہو گئی۔(70) اس زمانہ میں مولانا نظام الدین اسیر ادروی کام کے سلسلہ میں لاہور میں مقیم تھے اور اس تفسیر کا انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، وہ اپنے ایک مضمون میں اس کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تفسیر کا نام ''منتخب التفاسیر'' تجویز ہو چکا تھا، کام کا خاکہ یہ تھا کہ سات تفسیروں کے خلاصے ہر ہر آیت کے تحت جمع کر دیئے جائیں، ساتوں تفسیریں دفتر میں فراہم کر دی گئیں، کچھ تفسیروں میں ایک ایک آیت کے تحت مصنف نے کئی کئی صفحات لکھے ہیں، ان عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کرنا پھر لمبی لمبی بحثوں کی تلخیص اس انداز سے کرنی کہ مفسر کی رائے کا خلاصہ آجائے اور اتنی ہی سطروں میں آئے جتنی جگہ ہر صفحہ میں ایک تفسیر کے لئے مقرر ہے۔''(71)

منتخب التفاسیر کی تکمیل کے بعد قاضی صاحب والد کے سفر حج پر جانے کے سبب اکتوبر 1946ء تا جنوری 1947ء گھر پر مقیم رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر مدرسہ احیاء العلوم میں عارضی طور پر تدریسی خدمات انجام دیں، اور جب والد صاحب مکہ مکرمہ سے لوٹ آئے تو لاہور واپس چلے گئے۔ اس دفعہ ان کا تقرر سہ روزہ ''زمزم'' میں، جواب روزنامہ ہونے جارہا تھا، نائب مدیر کی حیثیت سے ہوا، جہاں مولانا محمد عثمان فارقلیط کی سرپرستی میں بطور صحافی انہوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ بدلتی زندگی کے ان لمحات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

> ''اسی درمیان مولانا فارقلیط نے مجھے لکھا کہ جلدی آجایئے، سہ روزہ ''زمزم'' کو روزنامہ کرنے کا پروگرام بن رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ رہ کر میرا ہاتھ بٹائیں، چنانچہ میں لاہور چلا گیا اور 28 جنوری 1947ء سے مولانا مرحوم (مولانا عثمان فارقلیط) کی زیرنگرانی بلکہ زیرتربیت صحافت کے میدان میں قدم رکھا، مولانا میری صحافت کے استاذ ہیں اور اخبار نویسی میں نے انہی سے سیکھی ہے۔''(72)

تقرر کے بعد قاضی صاحب نے چھ ماہ روزنامہ ''زمزم'' میں کام کیا، اس عرصہ میں وہ مستقل طور پر اخبار کے لئے دو سیاسی نوٹ اور ایک مذہبی و اخلاقی مضمون لکھتے تھے، اس کے علاوہ اکثر اوقات مشرقی ترکستان کے ایک عالم علامہ محمد روحی کے عربی و فارسی مضامین کا ترجمہ زمزم کے لئے اردو میں کرتے تھے، نیز بعض دفعہ خود بھی مستقل مضامین لکھتے تھے، اس حوالہ سے انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی (م 1977ء) کے مضمون ''نصیحت ہے یا فتنہ انگیزی'' کے جواب میں ''جدید فلسفۂ خیر وشر'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون کا ذکر خود نوشت میں کیا ہے۔(73)

لاہور میں ملازمت شروع کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد جب اس شہر کی ادبی فضا سے قاضی صاحب پوری طرح مانوس ہو گئے تو آہستہ آہستہ یہاں پر موجود صحافیوں، ادیبوں اور شعراء سے ان کے تعلقات بڑھنے لگے، نتیجتاً اخبار نویسی کے بعد شعر و شاعری ان کا مشغلہ بن گیا اور احباب کا ایک ایسا حلقہ قائم ہو گیا جس میں تمام شعراء اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ قاضی صاحب کے علاوہ اس حلقہ کے چار شعراء یعنی عشرت کرتپوری، اظہار کرتپوری، سردار ہربنس سنگھ باغی اور شیو پرساد بہار لکھنوی کا تذکرہ ''کاروان حیات'' کے صفحہ 87 اور 88 پر مذکور ہے۔(74) یہ لوگ شہر میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ایک ساتھ شرکت کرتے تھے اور پروگرام ختم ہونے کے بعد واپسی میں ایک دوسرے کو اس کی قیام گاہ تک چھوڑ کر آتے تھے۔

لاہور میں قیام کے دوران شعراء، ادباء، صحافی اور علماء وغیرہ مختلف حلقوں کے بیسیوں لوگوں سے قاضی صاحب کی مصاحبت رہی، البتہ دو شخصیات ان میں ایسی تھیں جن سے انہیں بہت زیادہ فائدہ پہنچا، اول اردو کے نامور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط ہیں۔ قاضی صاحب نے انہی کے مشورہ پر صحافت کے میدان میں قدم رکھا، یہ انہیں ایسے مشورے دیتے تھے جو ان کے حق میں مفید ثابت ہوں، چنانچہ ان کا ایک اہم مشورہ، جو قاضی صاحب کو زندگی بھر یاد رہا اور ہمیشہ وہ اس سے مستفید ہوتے رہے، ذیل میں مذکور ہے :

> ''مولانا فارقلیط صاحب مجھ کو کتابیں لکھنے کی بار بار تاکید کرتے تھے اور میں کہتا تھا کہ فرصت ملے تو اس کی طرف توجہ دوں، ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ اگر آپ فرصت کے انتظار میں رہیں گے تو کبھی فرصت نہیں ملے گی، کاموں کے ہجوم میں کام ہوتے ہیں۔''(75)

اور دوسرے اس دور کے ایک بڑے شاعر جناب احسان دانش ہیں جنہیں ''مزدوروں کا شاعر'' بھی کہا جاتا تھا، ان کا آبائی وطن کاندھلہ (موجودہ ضلع شاملی، اتر پردیش) تھا لیکن عہد شباب میں تلاشِ معاش کی خاطر لاہور منتقل ہو کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے ان سے واقف تھے اور اپنے پسندیدہ

شعراء میں انہیں شمار کرتے تھے، لاہور میں بڑی عمر کے ایک پرانے دوست علامہ انور صابری (م 1985ء) کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی، جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی اور پھر وہ ان کے ساتھ ہر قسم کی ادبی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے لگے، ان کی صحبت سے قاضی صاحب کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ادبی محفلوں کے علاوہ جناب احسان دانش کو تاریخی کتابوں سے بھی بڑی انسیت تھی، تصنیف وتالیف کا ذوق رکھتے تھے اور کتابوں کی نشر واشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کے خواہش مند تھے جس کے لئے اپنے بعض رفقاء سے اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کروا چکے تھے، قاضی صاحب سے بھی انہوں نے اس سلسلہ میں 450 صفحات کی ایک کتاب بعنوان ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں''، لکھوائی تھی، اس کی کتابت بھی ہوچکی تھی لیکن ''منتخب التفاسیر'' کی طرح یہ بھی طباعت شدہ شکل میں منظرِ عام پر نہ آسکی، البتہ اس کی تالیف سے مصنف کے ارادوں میں وہ پختگی ضرور پیدا ہوئی جس کے ذریعہ مستقبل میں انہیں تحریری میدان میں نمایاں خدمات انجام دینی تھیں۔

لاہور میں دو سالہ قیام کے دوران قاضی اطہر مبارکپوری کو اس شہر کے علمی وادبی ماحول سے اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو نکھارنے میں بڑی مدد ملی۔اس شہر کی پرکیف زندگی سے وہ پوری طرح مطمئن تھے، لیکن ان کا یہ اطمینان عارضی تھا کیونکہ آئندہ کچھ وقت انہیں مزید مشکلات کا انہیں سامنا کرنا تھا، اس لئے کہ تقسیم ملک کے مسئلہ کے تحت پورا ملک ہیجانی دور سے گزر رہا تھا اور صوبۂ پنجاب (جس کے مرکزی شہر میں وہ مقیم تھے) میں اس کے بہت برے اثرات مرتب ہونے والے تھے، اس لئے جون 1947ء کی ابتدائی تاریخوں میں تقسیم ملک کا جب اعلان ہوا تو پنجاب میں برپا ماحول کو پیش نظر رکھ کر مولانا محمد عثمان فارقلیط کے مشورہ پر قاضی صاحب اس شرط کے ساتھ گھر واپس آگئے کہ تقسیم کے بعد حالات سازگار ہوتے ہی لوٹ آئیں گے، لیکن ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ لاہور خود تقسیم ملک کی نذر ہوجائے گا اور دنیا کے نقشہ پر وجود میں آنے والے نئے ملک ''پاکستان'' کا حصہ ہوگا۔عہدِ شباب میں پیش آنے والے ان حالات کو صفحۂ قرطاس پر انہوں نے ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

> ''قیام لاہور کا پورا دور ملک میں سخت انتشار، بے چینی اور فتنہ وفساد سے پر تھا، ملک کی تقسیم طے ہوچکی تھی، تفصیلات طے ہورہی تھیں، بلکہ 15 اگست 1947ء کی تاریخ بھی مقرر ہوچکی تھی، مولانا فارقلیط نے کہا کہ تقسیم کے وقت امرتسر اور لاہور میں فسادات کا خطرہ ہے، اس لئے ہم لوگوں کو یہاں سے وطن چلا جانا چاہئے، جب سکون ہوگا تو واپس آجائیں گے، چنانچہ پہلے میں چلا، بعد میں فارقلیط صاحب بھی آگئے۔'' (76)

اس طرح 16 ماہ ''منتخب التفاسیر'' کی جمع وتدوین اور اس کے بعد 6 ماہ روزنامہ ''زمزم'' کے نائب مدیر کی

حیثیت سے لاہور میں زندگی بسر کرنے کے بعد قاضی صاحب ہمیشہ کے لئے اس شہر سے رخصت ہو گئے۔

اخبار ''انصار'' کی ادارت اور قیام بہرائچ

لاہور سے واپسی اور تقسیم ملک کی شکل میں ہندوستان کو برطانوی اقتدار سے آزادی ملنے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری کو ایک مرتبہ پھر تلاش معاش کی ضرورت محسوس ہوئی، لہٰذا قصبہ اور اس کے اطراف کے مدارس میں تعلیم و تدریس کے لئے جگہ تلاش کی، لیکن کہیں بات نہ بنی۔ کسمپرسی کے اس عالم میں کچھ وقت ایسے ہی گزر جانے کے بعد ایک روز مولانا محفوظ الرحمٰن نامی (م 1963ء) ان سے ملاقات کے لئے مبارک پور آئے۔ یہ بلیا کے رہنے والے تھے اور ملک کی آزادی کے بعد اتر پردیش میں کانگریسی حکومت کے پارلیمنٹری سیکریٹری بنائے گئے تھے۔ انہوں نے پسماندہ مسلم طبقات (خصوصاً انصاری برادری) کے احوال و کوائف سے حکومت کو آگاہ کرنے کے لئے بہرائچ سے بعنوان ''انصار'' ہفت روزہ اخبار جاری کرنے کا پروگرام بنایا، جس کا پہلا شمارہ تقسیم ہند کے پندرہ روز بعد 15 شوال 1366ھ / 1 ستمبر 1947ء کو شائع ہوا۔ مولانا نامی نے اخبار کی ادارت کی ذمہ داری 75 روپے مشاہرے پر قاضی صاحب کو پیش کی جسے بلا تامل انہوں نے قبول کر لیا اور بہرائچ چلے گئے۔

قاضی صاحب نے اخبار ''انصار'' کے مدیر کی حیثیت سے نومبر 1947ء تا مئی 1948ء بہرائچ میں کام کیا اور نائب مدیر کے طور پر انہی کے ہم نام مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (جنہوں نے بعد میں معروف عربی اردو لغت ''مصباح اللغات'' کی تالیف کی) نے ان کا تعاون کیا۔ اخبار چونکہ سیاسی تھا اس لئے حکومت کی پالیسی اور نظریات سے میل نہ کھانے کے سبب اس کے عتاب کا شکار ہو کر سات ماہ بعد بند ہو گیا۔ (77) اس کے بند ہونے کی محدود معلومات ''کاروان حیات'' سے ماخوذ مندرجہ ذیل اقتباس میں مذکور ہیں:

> ''یہ زمانہ شمالی ہند خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے حق میں بڑا پر آشوب تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے گا، قتل و غارت گری، آتش زنی اور دوسرے طرح طرح کے فسادات تھے اور میں ''انصار'' میں ان فرقہ پرستوں، قاتلوں اور مسلمان دشمن جماعتوں کے خلاف تیز و تند انداز میں لکھتا تھا اور یو پی حکومت کی طرف سے بار بار تنبیہ اور نوٹس آتی تھی حتیٰ کہ گرفتاری اور سزا کی باری آ گئی مگر مولانا نامی نے حکومت کو اطمینان دلایا کہ وہ اخبار پر کنٹرول کریں گے اور مجھ سے کہا کہ آپ یو پی میں پنجاب کا انداز تحریر اختیار نہ کریں ورنہ اخبار بند ہو جائیگا، میں نے مولانا فارقلیط صاحب کو اس سلسلہ میں لکھا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ دہلی کا معاملہ اور ہے یو پی کا اور! قلم سنبھال کر لکھئے! اسی دوران یو پی حکومت کا سرکلر تمام عدالتوں میں پہنچا کہ اخبار ''انصار'' کو کوئی اشتہار نہ دیا جائے، وہ حکومت کے نزدیک

غیر مقبول اخبار ہے، اس لئے کسی طرح سات ماہ جاری رکھ کر اسے بند کر دینا پڑا۔'' (78)

لیکن ایک دوسرے شخص مولانا افضال الحق قاسمی، جو کہ اس زمانہ میں بہرائچ کے مدرسہ نور العلوم میں مدرس تھے ، نے اخبار ''انصار'' کے بند ہونے کی وجہ خود مالکِ اخبار مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کو بتایا ہے اور اس حوالہ سے لکھا ہے:

''چند مہینوں کے بعد مولانا نامی پر فرقہ پرستی کا الزام لگا کہ وہ ہندوؤں کو مسلمان کرتے ہیں ، کیونکہ جامع مسجد بہرائچ میں جمعہ کے بعد کسی نے خواہش کی تھی اور غالباً مولانا نے اسے کلمہ توحید پڑھایا تھا ۔۔۔۔۔۔ یہ خبر اخباروں میں آئی اور اچھل گئی ۔ حتیٰ کہ اتر پردیش محکمہ تعلیم کے لئے ایک مسئلہ بن گئی تو سمپورنانند جی مہاراج نے مولانا کو ان کی ممبری پر واپس کر دیا ۔ چند مہینوں کے بعد مولانا کی سرگرمیاں کم ہوگئیں، آخر انصار بے چارہ گم ہوگیا۔'' (79)

البتہ مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے اخبار بند ہونے کا سبب مالی مشکلات کو بتایا ہے، اس مناسبت سے قاضی صاحب کی زندگی کے علمی پہلوؤں پر مبنی اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''لاہور سے واپسی کے بعد کچھ دن بہرائچ میں قیام رہا، مشہور عالم مولانا محفوظ الرحمٰن نامی نے الانصار کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا، قاضی صاحب کو اس کا مدیر بنایا تھا، قاضی صاحب نے بہرائچ جا کر ذمہ داری سنبھال لی لیکن ویکلی اخبار کے لئے جو وسائل چاہئے وہ بہرائچ میں عنقا تھے، پھر بھی کچھ دنوں تک اس کی اشاعت ہوتی رہی لیکن آخر میں مالی کمزوری کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا۔'' (80)

بہر حال لاہور جیسی بارونق اور پر بہار جگہ کے مقابلہ بہرائچ قاضی صاحب کے لئے ایک سنسان اور بے کیف و کم مقام تھا، جہاں وہ کام سے فارغ ہونے کے بعد تسکین قلب اور پرسکون زندگی کا لطف لینے کی خاطر بقیہ وقت مدرسہ نور العلوم میں گزارتے اور شروع ہی سے مطالعۂ کتب سے شغف رکھنے کے سبب یہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کرتے تھے۔ اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' کی جمع و تدوین کی ابتدا انہوں نے یہیں سے کی تھی۔ (81)

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مدرسی

ڈابھیل سورت سے قریب گجرات کا ایک معروف شہر ہے ۔ وہاں ایک عالم دین مولانا احمد حسن نے 1908ء میں مدرسہ تعلیم الدین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کے جملہ اخراجات افریقہ میں سکونت پذیر گجراتی تاجروں اور مالداروں کے مالی تعاون سے پورے کیے جاتے تھے ۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں دار العلوم دیوبند میں اراکین مدرسہ کے مابین وقتی طور پر نظریاتی اختلافات رونما ہوئے جو ڈابھیل کے اس ادارہ کے حق میں خوش گوار ثابت ہوئے ، کیونکہ ان اختلافات کے سبب دار العلوم کے بعض مشہور اساطین علم مثلاً مولانا انور شاہ

کشمیری (م 1933ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (م 1949ء) اور حافظ عبدالرحمٰن امروہوی وغیرہ وہاں سے نکل کر اس مدرسہ میں چلے آئے اور اپنے بلند ارادوں و علمی کاوشوں سے اسے مدرسہ تعلیم الدین سے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کی شکل دے کر اس زمانہ میں گجرات کا مرکزی اسلامی ادارہ بنا دیا۔

مئی 1948ء میں اخبار ''انصار'' بند کر کے بہرائچ سے وطن واپس آنے کے بعد قاضی صاحب پھر کام کی تلاش میں لگ گئے، اس مرتبہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (م 1984ء) کے حوالہ سے انہوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ (82) کے مہتمم مولانا سعید احمد اکبرآبادی (م 1985ء) کو درخواست لکھی کہ وہاں اگر تدریس کے لیے کوئی جگہ خالی ہو تو مجھے رکھ لیں، لیکن وہاں اس وقت کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ انہی ایام میں ان کے پاس خبر پہنچی کہ مذکورہ بالا مدرسہ میں باصلاحیت خواہش مند حضرات کے لئے معقول تنخواہ پر مدرسین کی جگہ خالی ہے اور سفر کا خرچ بھی دیا جاتا ہے البتہ مدرسہ کے اندرونی نظام کی حالت اتنی خراب ہے کہ اکثر مدرسین درمیان سال ہی میں نکال دیے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کے پاس اس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اس لئے تمام تفصیلات جاننے کے باوجود بادل ناخواستہ اسے منظور کر لیا اور ممبئی جانے والے ہم وطن حاجیوں کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں جامعہ ڈابھیل کے لئے طلبہ اور مدرسین کی تلاش تھی اور سفر خرچ بھی دیا جاتا تھا، تنخواہ بھی اس وقت کے لحاظ سے اچھی ہوتی تھی، مگر اکثر درمیان سال میں مدرسین کو کسی نہ کسی بہانہ سے رخصت کر دیا جاتا تھا اور یہ بے چارے کسی طرف کے نہیں ہوتے تھے، اس لئے وہاں جانے میں پس و پیش تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا سو روپے کے مشاہرہ پر چلا گیا۔'' (83)

قاضی صاحب شوال 1367ھ / 1948ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں داخل ہوئے اور شعبان 1368ھ / 1949ء تک مسند درس پر متمکن رہ کر شرح جامی، مقامات حریری، مختصر المعانی، سفینۃ البلغاء اور النحو الواضح جیسی کتابوں کے درس دیئے۔ ان کے قیام کے دوران اس دفعہ بھی تعلیمی سال کے درمیان کئی اساتذہ کو نکالا گیا، اس کی وجہ وہ گجراتی طلبہ تھے جن کا اثر و رسوخ مدرسہ کے انتظامی امور میں حد سے بڑھ کر تھا اور محض ناپسندیدگی کی بنا پر وہ محنتی اور مخلص اساتذہ کو یہاں ٹکنے نہیں دیتے تھے۔ قاضی صاحب کو یہاں کے اس ماحول سے یقین ہو گیا تھا کہ اس سے ان کا بھی سابقہ پڑنے والا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تعطیل میں جب وہ گھر آئے تو چند روز کے بعد علیحدگی کا رجسٹری لفافہ بھی پہنچ گیا۔ کاروان حیات میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد انہوں نے گجراتیوں سے اپنی خفگی

کا اظہار مندرجہ ذیل شعر میں اس طرح کیا ہے:

خلوص سکنۂ گجرات تاجرانہ

یہاں کے لوگ عموماً وفا شعار نہیں (84)

تدریسی لحاظ سے گرچہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں قاضی صاحب کا تجربہ اچھا نہیں رہا، لیکن یہاں کا عظیم الشان کتب خانہ، جسے اکابرِ دیوبند نے دو دہائی قبل قائم کیا تھا اور جس میں درسی کتب کے علاوہ ہر علم وفن کی کتابیں موجود تھیں، ان کے لئے بڑا پرکشش ثابت ہوا، بچپن میں اپنے اندر پیدا کی ہوئی کتب بینی کی عادت کے باعث وہ اس کتب خانہ میں موجود تاریخ وادب کے موضوعات پر مبنی کتابوں سے استفادہ کر کے ذوق کی باتیں نقل کرنے لگے اور نتیجتاً منظر عام پر آنے کے بعد معرکۃ الآرا تصور کی جانے والی اپنی کتاب ''**رجـال السـنـد والهند**'' کے لئے مواد فراہم کر کے اس کی تالیف کا آغاز کیا۔

عروس البلاد "ممبئی" میں قیام

ممبئی، جسے 1996ء تک بمبئی کہا جاتا تھا، ہندوستان کی ریاست مہاراشٹر کا دارالحکومت اور ملک کے سب سے زیادہ آبادی والے شہروں میں سے ایک ہے، اس کی موجودہ آبادی دو کروڑ دس لاکھ سے زائد ہے۔ ملک کی مغربی سمت میں ساحلِ سمندر پر واقع یہ شہر عہدِ وسطیٰ میں سات جزیروں پر مشتمل تھا جس کے الگ الگ دور میں مختلف نام تھے۔ برطانوی عہد میں ان جزیروں کو یکجا کر کے Bombay (اردو میں بمبئی) نام دیا گیا۔(85)

ملک کی معیشت میں اس شہر کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ ریزرو بینک آف انڈیا، بومبے اسٹاک ایکسچینج اور نیشنل اسٹاک ایکسچینج آف انڈیا جیسے کئی اہم مالیاتی اداروں کے مرکزی دفاتر اسی شہر میں واقع ہیں، جن کے توسط سے 40 فیصد بحری تجارت اور 70 فیصد سرمایہ کاری یہیں سے ہوتی ہے، نیز "بالی ووڈ" کے نام سے معروف ہندی فلموں اور ٹیلی ویژن صنعت کا مرکز بھی یہی شہر ہے۔ ان گوناں گوں خصوصیات کے باعث اس شہر میں کاروبار کے وسیع مواقع پیدا ہوئے، جن کے نتیجہ میں ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے اور شہر کو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا مرکز بنا دیا۔

نو برس مبارک پور، امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل کا چکر کاٹنے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری کی اگلی بلکہ آخری منزل یہی ممبئی شہر تھا، جہاں اپنے تیس سالہ دورِ قیام میں، بقول مولانا عبدالماجد دریابادی، انہیں تحقیقی، علمی اور دینی مقالات پر مشتمل کتابوں کا انبار جمع کرنا تھا اور زندگی کا بہترین حصہ دولت وتجارت کے اس بین الاقوامی شہر کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر تصنیف وتالیف اور صحافت میں گزارنا تھا۔(86)

قاضی اطہر مبارکپوری کے لئے ممبئی کی راہ اس طرح ہموار ہوئی کہ 1949ء میں ڈابھیل سے وطن واپسی کے بعد ایک مرتبہ پھر جب وہ حالات کی تنگ دامانی سے عجیب کشمکش میں مبتلا ہوئے تو انہیں اپنے ہم وطن مولانا حکیم فصیح اللہ خاں اعظمی کو خط لکھنے کا خیال آیا۔ حکیم فصیح اللہ خاں اعظمی کا تعلق قصبہ حمید پور (موجودہ ضلع مئو) سے تھا، لیکن مستقل طور پر ممبئی میں مقیم تھے اور جمعیۃ علماء ہند صوبہ ممبئی کے ناظم ہونے کی حیثیت سے وہاں کے عوام وحکومت میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کے بیان کے مطابق وہ وطنیت کی بنا پر "زمزم" اور "انصار" میں شائع ہونے والے ان کے اشعار ومضامین پڑھتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی جمعیۃ کے مراسلات ان کے پتہ پر بھیج دیتے تھے، اس لئے ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ بہرکیف اس علاقائی تعلق کی بنا پر انہوں نے حکیم اعظمی کو خط میں لکھا:

''میں اس وقت ملازمت کی تلاش میں ہوں، بمبئی میں کوئی جگہ ہو، تو مجھے بلالیں۔'' (87)

اس مرتبہ بھی ان کی درخواست کے مسترد ہونے کا پورا امکان تھا، جیسا کہ اس سے قبل کئی دفعہ ہو چکا تھا، لیکن جس وقت حکیم اعظمی نے جمیعۃ کے دفتر میں یہ خط کھول کر پڑھا وہاں قاضی صاحب کے استاذ مولانا سید محمد میاں اور علمی رفیق مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی موجود تھے، ان حضرات کی سفارش پر حکیم اعظمی نے انہیں ان الفاظ میں خط کا جواب دیا:

''فی الحال کوئی کام نہیں ہے، مگر آپ آجایئے، میں آپ کو آرام پہنچانے کی کوشش کرونگا۔'' (88)

اس طرح قاضی صاحب کے لئے ممبئی جانے کا راستہ ہموار ہوا اور وہ رخت سفر باندھ کر نومبر 1949ء کی کسی تاریخ میں اس عروس البلاد کے لئے روانہ ہو گئے۔ ممبئی کے لئے ان کا یہ دوسرا سفر تھا، اس سے قبل ایک سال پہلے اپنے اس بستر کی تلاش میں بھی وہ وہاں جا چکے تھے جو ڈابھیل کے سفر میں مبارک پور کے حاجیوں کے سامان میں گم ہو گیا تھا۔ (89)

روز نامہ ''جمہوریت'' سے تعلق

ممبئی پہنچنے کے بعد جمیعۃ علماء ہند کا دفتر واقع وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار قاضی صاحب کی پہلی قیام گاہ بنا، یہاں حکیم اعظمی نے عارضی طور پر فتویٰ نویسی اور دوسرے تحریری کام ان کے سپرد کیے اور اپنے ایک دوست غیاث الدین کے ہوٹل میں دو وقت کے کھانے کا انتظام کر دیا۔ ابتدا میں کسی قسم کا مشاہرہ یا تنخواہ طے نہیں ہوئی تھی بلکہ موصوف موقع محل کے اعتبار سے خود ہی قاضی صاحب کی جیب میں کبھی کبھی پانچ دس روپے ڈال دیتے تھے۔ (90) یہ سلسلہ سات ماہ تک جاری رہا، بعد ازاں جون 1950ء میں جمیعۃ سے منسلک کچھ لوگوں نے اس کی پالیسی کے موافق ''جمہوریت'' کے نام سے ایک روزنامہ اخبار جاری کرنے کا پروگرام بنایا، جس کی ادارت کے لئے چار سو روپے مشاہرے پر مولانا حامد الانصاری غازی کا تقرر ہوا جب کہ ایک سو پچاس روپے کے عوض نائب مدیر کے طور پر قاضی صاحب کو منتخب کیا گیا اور تمام تیاریاں پوری ہونے کے بعد 15 جون 1950ء کو روزنامہ ''جمہوریت'' کا افتتاح ہوا۔

جمہوریت کے اجراء کے بعد قاضی صاحب چھ ماہ اس سے منسلک رہے، اس دوران ''افکار و مطالعات'' کے عنوان سے وہ اس میں علمی، دینی اور تاریخی نوعیت کے چار پانچ کالم لکھا کرتے تھے، اسی طرح ''قرآنی جواہر پارے'' کے عنوان سے کسی آیت کی تشریح بھی انہی کے قلم سے ہوتی تھی، اسی طرح کبھی کبھی ان کی نظمیں اور غزلیں بھی اس میں شائع ہوتیں، اس کے علاوہ مراسلات کی کانٹ چھانٹ اور پریس کے لئے اخبار کی کاپی جوڑنے کا کام بھی ان کے ذمہ تھا۔ بہر حال ان کی اور ان جیسے اس اخبار سے منسلک دیگر ملازمین کی کوششوں سے چند ماہ میں

روزنامہ ''جمہوریت''، ممبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا اور اس کے بالمقابل یہاں کے قدیم مشہور اخبار روزنامہ ''انقلاب'' کی مقبولیت وقتی طور پر گھٹ گئی، اس کے مالک عبدالحمید انصاری، جنہوں نے 1937/38ء میں اسے جاری کیا تھا، سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔ دوسرے علاقائی اردو اخباروں کا بھی یہی حال تھا۔ (91)

کم وقت میں حد سے زیادہ مقبولیت روزنامہ ''جمہوریت'' کے لئے نیک فال ثابت ہوئی، لیکن اس کی یہی ترقی قاضی صاحب کی وقتی پریشانی کا سبب بھی بنی، جس کی وجہ اس کے مدیر مولانا حامد الانصاری غازی تھے، ان کی بابت قاضی صاحب کا یہ الزام ہے کہ وہ نام ظاہر کیے بغیر ان کے مضامین اخبار میں شائع کردیتے تھے اور لوگوں کے دریافت کرنے پر انہیں خود سے منسوب کرتے، قاضی صاحب پر یہ بات گراں گزرتی۔ غازی صاحب کے اس غیر اخلاقی رویّہ سے جب ان کی پریشانی بڑھنے لگی تو انہوں نے روزنامہ ''جمہوریت'' سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا، لیکن وطن سے کوسوں دور اجنبی شہر میں، جہاں ابھی ایک سال ہی گزرا تھا، فوری طور پر کوئی فیصلہ لینا آسان کام نہیں تھا، اس لئے دہلی میں مقیم مولانا سید محمد میاں کو خط لکھ کر حالات سے آگاہ کیا، نیز ان سے دہلی بلانے کی بھی درخواست کی، مگر مولانا محمد میاں نے انہیں حالات کا سامنا کرتے ہوئے ممبئی ہی میں رکنے کا مشورہ دیا، لہٰذا انہوں نے اسی پر عمل کیا اور سات ماہ بعد 22 فروری 1951ء کی شام کو مولانا حامد الانصار غازی کو ''جمہوریت'' سے علیحدہ ہونے کی اطلاع دے کر اگلی صبح 23 فروری کو روزنامہ ''انقلاب'' سے منسلک ہوگئے۔

روزنامہ ''انقلاب'' سے وابستگی

روزنامہ ''انقلاب'' موجودہ دور میں اردو زبان کا کثیر الاشاعت اخبار ہے، جسے کچھ سالوں سے دینک جاگرن گروپ ہندوستان کے تیرہ بڑے شہروں سے ایک ساتھ شائع کررہا ہے، 2010ء میں اس کمپنی نے یہ اخبار خالد عبدالحمید انصاری سے خرید کر اپنی ملکیت میں لے لیا تھا۔ خالد عبدالحمید انصاری کے والد عبدالحمید انصاری نے 1938ء میں ممبئی شہر سے اس اخبار کی اشاعت کا آغاز کیا، صفر سے ابتدا کرنے کے بعد اخبار نے رفتہ رفتہ ممبئی کے اردو داں طبقہ میں اپنی شناخت قائم کی اور تقسیم ملک کے ہنگامہ خیز ماحول میں اپنے سیاسی مضامین کے ذریعہ عوام میں مشہور ہوکر ممبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا۔ اس کے مالک عبدالحمید انصاری کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ تقسیم کے وقت محمد علی جناح نے انہیں پاکستان منتقل ہونے کی دعوت دی تھی، لیکن انہوں نے اس دعوت کو مسترد کردیا اور دوسرے چار کروڑ مسلمانوں کی طرح ہندوستان ہی میں رہے۔

روزنامہ ''انقلاب'' سے قاضی اطہر مبارکپوری کی وابستگی ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے توسط سے ہوئی، یہ

روز نامہ ''جمہوریت'' میں نیوز ایڈیٹر کے عہدہ پر فائز ممبئی کے مشہور صحافی تھے اور قاضی صاحب کو ان کی رفاقت حاصل تھی ،بعض درپیش پریشانیوں کے باعث یہ قاضی صاحب سے پہلے ہی جمہوریت سے الگ ہو گئے تھے ۔ قاضی صاحب کی ذہنی تشنگی جب حد سے تجاوز کر گئی اور جمہوریت سے تعلق منقطع کرنے کے علاوہ انہیں کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی تو وہ انہیں ذاکر حسین فاروقی کے پاس گئے اور کسی دوسری جگہ انتظام کرنے کو کہا۔ ادھر روز نامہ ''جمہوریت'' کی عوام میں مقبولیت کے سبب روز نامہ ''انقلاب'' کے حالات بھی خستہ تھے اور اس کے مالک عبدالحمید انصاری کو اخبار کے دینی واصلاحی کالم کے لئے ایک اچھے مضمون نویس عالم کی ضرورت تھی۔ اس لئے ذاکر صاحب نے جب ان سے قاضی صاحب کے لئے سفارش کی تو فوراً قبول ہوئی اور روز نامہ ''انقلاب'' سے ان کا تاحیات باقی رہنے والا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس واقعہ کی پوری روداد قاضی صاحب نے درج ذیل پیرایہ میں اس طرح بیان کی ہے:

> '' حالات روز بروز خراب ہوتے گئے اور جمہوریت چھوڑنے کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی ، آخر مجبور ہو کر ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے پاس پہنچا اور کہا کہ اب میرا انتظام کردو، اب بات قابو سے باہر ہو چکی ، انہوں نے دوسرے دن مجھے بلایا اور دفتر جمہوریت جاتے ہوئے ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ اسی طرف سے روز نامہ ''انقلاب'' جا کر عبدالحمید انصاری سے ملاقات کرلیں ، میں نے ان کو فون کر کے آپ کا انتظام کرا دیا ہے ، انصاری سے میں نے کہا کہ آپ کو میں جمہوریت کی روح نکال کر دے رہا ہوں ، فوراً رکھ لو، انہوں نے نام پوچھا کہ وہ خود آپ سے ملیں گے ، ان کا نام جمہوریت میں نہیں آنے پاتا ہے اس لئے نام بتانے سے کوئی بات معلوم نہیں ہوگی ۔'' (92)

ذاکر حسین فاروقی کے ایما پر قاضی صاحب انقلاب کے دفتر جا کر عبدالحمید انصاری سے ملے اور ملازمت کے تعلق سے گفتگو کے بعد 23 فروری 1951ء کو روز نامہ ''انقلاب'' سے وابستہ ہو گئے ۔ روز نامہ ''جمہوریت'' کے بعد اس اخبار میں ''جواہر القرآن'' اور ''احوال و معارف'' کے زیر عنوان ان کے مضامین کا سلسلہ شروع ہوا، اول الذکر کالم میں وہ قرآن کی کسی نہ کسی آیت یا اس کے جزء کی تشریح کرتے جب کہ ثانی الذکر کے تحت دینی ، علمی ، اصلاحی و تاریخی موضوعات پر مختصر مضامین لکھتے تھے ، اس کے علاوہ اس کالم میں کبھی کبھی احادیثِ نبویؐ اور بزرگوں کے حالات وواقعات بھی ان کے قلم سے شائع ہوتے تھے۔

روز نامہ ''انقلاب'' سے وابستگی کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری کا معمول یہ تھا کہ وہ اس کے دفتر بہت کم جاتے تھے ، جو کالم ان کے ذمہ تھا اسے کسی بھی وقت لکھ کر جیب میں ڈال لیتے اور جب کبھی کمرہ سے باہر نکلتے تو قریب ہی میں واقع انقلاب کے کاتب کی قیام گاہ سے گزرتے ہوئے تحریر اس کے حوالہ کر دیتے ، جسے وہ کتابت

کے بعد اخبار میں چھپنے کے لئے بھیج دیتا تھا۔ان کا اندازِ تحریر اتنا سلیس اور انوکھا تھا کہ اردو زبان سے واقفیت رکھنے والے ممبئی کے تمام لوگ بڑی دلچسپی سے ان کے مضامین پڑھتے تھے، چنانچہ ایک دو ماہ گزر جانے کے بعد ان مضامین کے ذریعہ وہاں کے مسلمانوں میں قاضی صاحب کا خاصا تعارف ہوگیا اور روزنامہ ''انقلاب''، جو کچھ وقت سے تنزلی کا شکار تھا، کو احوال و معارف کے کالم کے باعث پھر سے مقبولیت ملنے لگی، اس کے برعکس ''روزنامہ ''جمہوریت'' اپنے اراکین میں ذہنی انتشار کے سبب آہستہ آہستہ روبہ زوال ہوگیا۔

قاضی اطہر مبارکپوری 23 فروری 1951ء کو روزنامہ ''انقلاب'' سے منسلک ہوئے اور 10 اپریل 1991ء (1980ء میں ممبئی چھوڑنے کے بعد بھی) تک پورے چالیس سال اس سے وابستہ رہے۔(93) اس عرصہ میں انہوں نے جو مضامین اس میں یا دوسرے اخبار و رسائل میں لکھے ان کی تعداد کے بارے میں قاضی ظفر مسعود لکھتے ہیں:

''اندازاً آپ نے پچاس ہزار صفحات اخبارات میں لکھے ہیں۔''(94)

اور مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے روزنامہ ''انقلاب'' اور ان کے مابین قائم صحافتی رشتہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل پیرایہ میں اس طرح کیا ہے:

''بمبئی کا سب سے بڑا اخبار انقلاب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے، جب اس کے مالک عبدالحمید انصاری کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے ''جمہوریت'' سے قطع تعلق کرلیا تو انہوں نے اپنے اخبار میں آنے کی پیش کش کی، قاضی صاحب نے اس کو امداد غیبی سمجھا، ان کی دعوت کو منظور کرلیا اور انقلاب میں آگئے ..... پھر چالیس سالوں تک اپنا مخصوص کالم جواہر القرآن اور احوال و معارف کے نام سے لکھتے رہے، اگر ان تمام مضامین کو جمع کیا جائے تو شاید دس بارہ جلدوں میں آئیں، اس کالم میں بالعموم علمی مسائل ہی لکھتے تھے، آخر میں چند سطریں حالات حاضرہ سے متعلق ہوتی تھیں۔''(95)

مذکورہ دونوں اقتباسات کے مطابق اگر روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع شدہ ان کے مضامین کو یکجا کر کے الگ الگ عنوان کے تحت مرتب کیا جائے تو درجنوں کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔

ماہنامہ ''البلاغ'' کی ادارت

ممبئی اور اس کے اطراف میں آباد مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے قوم کے کچھ مخلص لوگوں نے ''انجمن اسلام'' کے نام سے 1878ء میں ایک سماجی و فلاحی تنظیم قائم کی، اور مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے تحت انجمن

اسلام ہائی اسکول، کریمی لائبریری اور جم خانہ وغیرہ کئی ادارے یکے بعد دیگر ممبئی میں تعمیر کیے، انہی تعمیر شدہ اداروں میں کروفورڈ مارکٹ میں واقع ''حاجی صابوصدیق مسافر خانہ'' بھی شامل ہے، جس کے تمام امور ومعاملات انجمن خدام النبیؐ کمیٹی کے ہاتھ میں تھے، عازمین حج کی خدمت اور حج سے متعلق انہیں ہر قسم کی سہولت فراہم کرنا اس ادارہ کا مرکزی کام تھا، جسے پانی کے جہاز سے مروّجہ سفرِ حج کے زمانہ میں اس کے کارکنان بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے ۔بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جناب احمد غریب اس کے سکریٹری تھے، یہ ممبئی کے امیر ترین مسلمانوں میں سے ایک تھے اور قوم کے مخلص خادم ہونے کی حیثیت سے حجاج کرام کی ہر ممکن طریقہ سے خدمت کرتے تھے۔(96)

جون 1950ء میں روزنامہ ''جمہوریت'' کے اجراء کے بعد احمد غریب صاحب نے مولانا حامد الانصاری غازی اور قاضی اطہر مبارکپوری کو انجمن خدام النبیؐ کے شعبۂ نشر واشاعت سے منسلک کرلیا اور دونوں سے اس کے مراسلات شائع کرانے لگے۔ 1954ء میں انہیں انجمن کے اسی شعبہ سے ہفت روزہ اخبار اور ماہنامہ رسالہ اردو میں جاری کرنے کا خیال آیا، چنانچہ اس سلسلہ میں کمیٹی کے دوسرے اراکین سے مشورہ کے بعد انہوں نے 14 مئی 1954ء میں ''البلاغ'' کے نام سے ہفت روزہ اخبار کا اجراء کیا، ساتھ ہی ماہنامہ ''البلاغ'' کی بنیاد بھی رکھی اور دونوں رسالوں کی مجلسِ ادارت میں مولانا حامد الانصاری غازی اور مولوی عبد الرشید ندوی کے ہمراہ قاضی اطہر مبارکپوری کو بھی شریک کیا۔

ہفت روزہ ''البلاغ'' چند شمارے نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔ (97) لیکن 48 صفحات پر مشتمل ماہنامہ ''البلاغ''، جس کا پہلا شمارہ جون 1954ء میں منصۂ شہود پر آیا تھا، نومبر 1980ء تک پورے 26 سال انجمن خدام النبیؐ کے زیر اہتمام شائع ہوتا رہا۔ ابتدا میں قاضی صاحب کے ساتھ متذکرہ بالا دونوں حضرات بھی اس کی مجلسِ ادارت میں شریک تھے، لیکن بعد میں کسی بنا پر وہ دونوں اس سے دستبردار ہوگئے اور مجلّہ ''البلاغ'' کی جلد نمبر 2 کے شمارہ نمبر 9 (جنوری 1956ء کے شمارہ سے) سے قاضی صاحب بلاشرکتِ غیر تنہا اس کے مدیر ہوئے اور اگلے 24 برس تک یہ مجلّہ ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔(98)

ماہنامہ ''البلاغ'' کے اداریہ کا عنوان ''شذرات'' تھا، جس میں جناب احمد غریب اور رسالہ کے مدیر مسئول محیی الدین منیری کے مضامین شائع ہوتے تھے ۔ شذرات کے علاوہ اس مجلّہ کا ایک دوسرا مستقل کالم ''افکار و مطالعات'' بعد میں ''مطالعات وتعلیقات'' بھی تھا، جس میں پہلے مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کے مضامین شائع ہوتے تھے، لیکن ان کی سبکدوشی کے بعد قاضی صاحب کے مضامین چھپنے لگے، انقلاب کے کالم ''احوال و

معارف'' کی طرح قاضی صاحب اس میں بھی علمی، دینی، سیاسی یا تاریخی نوعیت کے مختصر مضامین لکھتے تھے، نیز اصلاحی انداز میں احادیث، بزرگان دین کے واقعات اور عالمِ اسلام پر تبصرہ کے علاوہ فقہی اور دینی مسائل پر مرکوز مضامین بھی اس کالم کا حصہ تھے۔ مولانا مسعود سعید اعظمی اس کالم (افکار ومطالعات) کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''البلاغ'' کی ادارتی تحریر شذرات کے عنوان سے ہوا کرتی تھی مگر اس کے دوسرے مستقل کالم ''افکار و مطالعات'' کو ایک قسم کا منفرد اداریہ ہی سمجھنا چاہئے، اس میں قاضی صاحب کی نظر بیک وقت متعدد مسائل پر مرکوز رہا کرتی تھی اور چند صفحات میں مختلف امور پر اپنے نقطہ نظر کی توضیح فرماتے تھے۔''(99)

اداریہ کے علاوہ قاضی صاحب اس مجلّہ کے لئے مستقل مقالات و مضامین بھی اس لکھتے تھے، چنانچہ اس حوالہ سے ان کا پہلا مضمون بعنوان ''کعبۃ اللہ کی وحدت و مرکزیت کے ڈاکو قرامطہ'' جون 1954ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد ''فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ، اللہ کا ایک بندہ اللہ کے گھر میں، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ، فقہ اہلِ سنت کی ترویج و اشاعت، مفلس کون ہے؟ اور اسلام کا ابتدائی نظامِ تعلیم و تعلم'' وغیرہ مضامین بالترتیب بعد کے شماروں میں شائع ہوئے، اس سلسلہ کا آخری مضمون ''کعبہ کا دیکھنا عبادت ہے'' نومبر 1980ء کے شمارہ میں چھپا تھا۔ قاضی ظفر مسعود کی تیار کردہ فہرست کے مطابق ماہنامہ ''البلاغ'' میں ان کے والد قاضی اطہر مبارکپوری کے شائع شدہ کل مضامین کی تعداد 140 ہے، جن میں سے بعض خاصے طویل ہونے کے باعث متعدد شماروں میں قسط وار شائع ہوئے تھے اور ان میں سے نصف کتابی شکل میں منظرِ عام پر بھی آچکے ہیں۔

ان علمی و تحقیقی مضامین کے ذریعہ قاضی اطہر مبارکپوری کا نام برصغیر کے بہترین مضمون نگاروں کی فہرست میں شامل ہوا، جس کے نتیجہ میں دار المصنفین کے ترجمان ماہنامہ ''معارف'' سے ان کے علمی تعلقات استوار ہوئے اور اس میں ان کا پہلا مضمون ''ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند'' کے عنوان سے جنوری تا مارچ 1958ء میں شائع ہوا، بعد ازاں مضامین کی اشاعت کا یہ سلسلہ تا دمِ آخر قائم رہا اور 1958ء سے 1995ء تک قریب سینتیس سال کے عرصہ میں ان کے 47 مقالات و مضامین مجلّہ ''معارف'' میں شائع ہوئے ، اس سلسلہ کا آخری مقالہ قاضی صاحب کی وفات سے چھ ماہ قبل بعنوان ''تدوین فتاوی عہد بہ عہد'' دسمبر 1995ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مجلّہ ''معارف'' سے علمی تعلقات قائم ہونے کی روداد قاضی صاحب نے اپنی خودنوشت ''کاروان حیات'' میں ان الفاظ میں درج کی ہے:

> ''البلاغ'' کے تبادلہ میں رسالہ ''معارف'' دار المصنفین آتا تھا، میں زمانہ طالب علمی میں نہایت ذوق وشوق سے اس کو پڑھتا تھا، اس کے ایڈیٹر حضرت شاہ معین الدین ندوی ناظم دار المصنفین تھے،

نہایت نیک بزرگ اور خاندانی عالم تھے، میں ان سے ملنے کے لئے اور کتابوں کی مراجعت کے لئے بمبئی سے آتا تو اکثر دارالمصنفین جاتا تھا اور ان سے خاص طور سے ملتا تھا، وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے، ایک مرتبہ ''رجال السند والہند'' کا مسودہ ان کو دکھایا تھا اور انہوں نے تشجیع فرمائی تھی، ''البلاغ'' میں میرے تاریخی اور تحقیقی مضامین پڑھتے تھے، کہتے تھے کہ ''البلاغ'' آتا ہے تو میں آپ کے مضامین خاص طور سے پڑھتا ہوں اور یہ کہ یہ مضامین ''البلاغ'' کے قارئین سے بالاتر ہیں آپ ان کو ''معارف'' میں دیجئے، میں عرض کرتا کہ میرے مضامین اس لائق نہیں ہوتے ہیں، کہتے تھے کہ میں کور کسر درست کر دونگا، بہر حال ان کی مشفقانہ فرمائش بلکہ اصرار پر میں نے ''رجال السند والہند'' کے مسودہ کا خلاصۃ الخلاصہ ''ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ معارف کے لئے تیار کیا، جس کو شاہ صاحب نے جنوری تا مارچ 1958ء کے معارف میں تین قسطوں میں شائع کیا اور پہلی قسط کو سر مقالہ بنایا، اس کے بعد ''معارف'' میں میرے مقالات و مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا، حضرت شاہ صاحب اکثر مقالات کو سر مقالہ بنایا کرتے تھے۔'' (100)

برصغیر کے علمی حلقہ میں ماہنامہ ''البلاغ'' کی اصل وقعت اس کے ان دو خصوصی شماروں سے ہوئی جو انجمن خدام النبیؐ نے ابتدائی دور میں خاص موقعوں پر شائع کئے تھے۔ ان میں پہلا ''البلاغ تعلیمی نمبر'' (دسمبر 1954ء تا فروری 1955ء) ہے۔ یہ نمبر جنوری 1955ء کی 8، 9 تاریخ کو ممبئی میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ہونے والے آل انڈیا تعلیمی کنونشن کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ 435 صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر میں مختلف مسلم ایجوکیشنل بورڈ، تعلیمی تنظیموں اور مایۂ ناز اہل علم کے سوانحی خاکوں کے علاوہ ہندوستان کے کئی چھوٹے بڑے دینی مدارس و مراکز پر مضامین لکھے گئے تھے، اور مضمون نگاروں کی طویل فہرست میں مولانا حسین احمد مدنی، قاری محمد طیب، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید محمد میاں جیسے باکمال افراد کے نام شامل تھے، نیز اس میں قاضی صاحب کے بھی چار مضامین بعنوان ''استشراق اور مستشرقین، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء، تنقید و تبصرہ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر'' شائع ہوئے تھے۔ علمی دنیا میں اس شمارہ کی بڑی پذیرائی ہوئی اور متعلقہ موضوع پر اسے مستند ماخذ شمار کیا گیا۔ اور دوسرا خصوصی شمارہ ''البلاغ شاہ سعود نمبر'' (دسمبر 1955ء و جنوری 1956ء) شاہ سعود بن عبد العزیز (م 1969ء) کی ہندوستان آمد کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔ ان دونوں خصوصی شماروں کے باعث ماہنامہ ''البلاغ'' آئندہ علمی حلقوں میں معیاری مضامین پر مشتمل ایک اہم علمی رسالہ تصور کیا گیا۔

ممبئ میں تعلیم وتدریس سے تعلق

درس وتدریس سے قاضی اطہر مبارکپوری کا تعلق زمانۂ طالب علمی میں قائم ہوااور تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً پانچ سال مدرسہ احیاء العلوم میں مدرس رہے، مزید برآں لاہور میں قیام کے دوران بھی انہوں نے اس مدرسہ میں عارضی طور پر پانچ ماہ یہ خدمت انجام دی،اس کے علاوہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک سال تدریسی فرائض ادا کیے۔اب ممبئ کی باری تھی جہاں رسمی وغیر رسمی طور پر ایک زمانہ تک وہ اس سے منسلک رہے۔

ممبئ پہنچنے کے چندروز بعد ہی قاضی اطہر مبارکپوری کا تعلیم وتدریس سے سابقہ پڑ گیااورعرصہ تک وہ اس سے مربوط رہے۔ابتدااس کی جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے ہوئی، جہاں حکیم اعظمی نے ان کے قیام کا انتظام کیا تھا، یہاں پچاس روپے ماہانہ معاوضہ پرانہوں نے دوعلاقائی بچّوں کوشرح وقایہ اوراصول الشاشی پڑھانا شروع کی،اسی کے ساتھ کچھ دنوں بعدآپ کھانڈیا اسٹریٹ میں واقع عبداللہ بن احمد عرب سمکری نامی شخص کے مکان ''خان منزل'' کی سطح پربعض عمر درازلوگوں کومولانامحفوظ الرحمٰن نامی کی کتاب ''مفتاح القرآن'' کادرس دینے لگے۔اسی زمانہ میں انہیں جمعیۃ کی طرف سے مالیگاؤں کے مدرسہ بیت العلوم میں مدرسی کی پیشکش ہوئی،مگر بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ اسے قبول نہ کرسکے۔(101)

قاضی اطہر مبارکپوری کے ذہن سے ممبئ کی اجنبیت ختم کرنے کے لئے حکیم اعظمی نے سیاسی،سماجی اورتاجرو مزدوروغیرہ ہرطبقہ کےلوگوں سےتعارف کراکران کا بھی ایک حلقۂ احباب قائم کردیا،جس میں مخلص ومخیّر قسم کے کئی لوگ شامل تھے،انہی مخلص لوگوں میں سے ایک جناب احمد غریب بھی تھے،ممبئ کی جامع مسجد کے سامنےان کی کٹلیری کی دکان تھی۔قاضی صاحب نے ممبئ میں قیام کے دوران شروعاتی سالوں میں انہیں ان کے گھر پرمزید تین بھائیوں (محمد،محمد صادق اورعبدالکریم) کے ہمراہ ریاض الصالحین،صحیح مسلم اورالمنتقی ابن جارودوغیرہ کتابیں پڑھائی۔(102)

اسی طرح وہ جب کبھی اہل وعیال سے ملنے اپنے وطن مبارک پورآتے تو مادرِعلمی مدرسہ احیاءالعلوم میں آمد ورفت کے دوران اعزازی طور پرطلبہ کو پڑھانا بھی ان کا ذاتی مشغلہ تھا جس کے وہ اکثرپابند تھے،بعض دفعہ مدرسہ کے طلبہ خودبھی ان کے گھر پرحاضر ہوکران سے کوئی نہ کوئی درسی کتاب پڑھتے تھے،اس حوالہ سےان کےایک شاگرد مولانا اعجاز احمد اعظمی (م 2013ء) کا نام ہمیں صریح طور پر معلوم ہوا ہے،جنہیں قاضی صاحب نے مقامات حریری کےبعض اسباق پڑھائے تھے۔(103)

غیر رسمی تعلیم کے مذکورہ طریقوں کے علاوہ ممبئ میں قاضی اطہر مبارکپوری کے لئے رسمی تعلیم کا راستہ بھی

ہموار ہوا، جس کے تحت انہوں نے چرچ گیٹ پر واقع اس شہر کے معروف ادارہ ''انجمن اسلام ہائی اسکول'' میں دس سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1960ء میں اس اسکول کے پرنسپل ضیاء الدین خلیفہ کو دینیات کے سابق استاذ کی وفات کے سبب ایک معلم کے ضرورت پیش آئی، اس لئے جناب احمد غریب کے توسط سے انہوں نے قاضی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اسکول کے طلبہ کو دینیات و اخلاقیات کا درس دیں۔ اپنی مصروفیات کے باعث قاضی صاحب نے پہلے تو اس سے انکار کر دیا لیکن ان کے زیادہ اصرار پر بعد میں اس کی حامی بھر لی اور اسکول میں پڑھانے لگے۔ انجمن اسلام ہائی اسکول میں ان کا یہ تدریسی سلسلہ 1960ء سے 1970ء تک پورے دس سال جاری رہا، جہاں اپنی موجودگی سے انہوں نے اسکول کے ماحول کو اسلامی رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ (104) انجمن اسلام ہائی اسکول کے علاوہ جوناپٹی کے مدرسہ امدادیہ میں بھی کچھ وقت تک انہوں نے درس دیا۔

تلامذہ

قاضی اطہر مبارکپوری رسمی طور پر سولہ سترہ سال اور غیر رسمی طور پر تقریباً پوری زندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے، اس پورے عرصہ میں مدرسہ احیاء العلوم، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، مدرسہ امدادیہ اور انجمن اسلام ہائی اسکول میں جن طلبہ کو ان سے پڑھنے کا موقع ملا، ان کی تعداد بلا شبہ سیکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن ان میں سے چند تلامذہ کے نام ہی صراحت کے ساتھ کتابوں میں ملتے ہیں، جو کہ حسب ذیل ہیں:

مولانا محمد عثمان معروفی، مولانا اعجاز احمد اعظمی، ملاّ محمد یونس شکیب مبارکپوری، محمد احمد غریب اور ان کے تین بھائی، مولانا بدر الدین اجمل، یونس اگاسکر، عبد الرزاق قریشی، مولانا عبد الحنان، مولانا عبد الرؤف مبارکپوری، مفتی ظہور احمد، مولوی محمد شعیب محشر، مولانا قمر الدین رسولپوری، مولانا محمد عوف پھینتی پوری، مولانا عبد الکریم، خالد انصاری، ابوسعید بزمی، سید آصف حسن، سید شہاب الدین بھیونڈی، سید محی الدین، قاری انوار الحق مبارکپوری اور محمد عمر سیفی۔ (105)

ان میں سے اکثر طلبہ نے مدرسہ احیاء العلوم میں جبکہ بعض نے دوسرے اداروں میں قاضی صاحب سے تعلیم حاصل کی۔

تصنیفات و تالیفات

دیگر تمام شہروں کے مقابلہ ممبئی کا قیام قاضی اطہر مبارکپوری کے لئے زیادہ خوش گوار ثابت ہوا، یہاں تحریری

اور تدریسی کاموں میں مصروفیات کے سبب علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع میسر آئے، جن سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنے علمی کاموں کو مدون و محفوظ کرلیا۔

انجمن اسلام ہائی اسکول میں درس و تدریس اور روزنامہ ''انقلاب'' و ماہنامہ ''البلاغ'' میں مضامین لکھنے کے علاوہ تصنیف و تالیف بھی قاضی اطہر مبارکپوری کا اہم ترین مشغلہ تھا، جو ورثہ میں انہیں نانیہال سے ملا تھا۔ ممبئ آنے سے قبل سابقہ نوسالہ عملی زندگی میں انہوں نے سات چھوٹی بڑی کتابیں تحریر کی تھیں جو ناساز گار حالات کے سبب شائع نہ ہوسکیں۔ یہاں آنے کے بعد شروع میں ان کا قیام جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں تھا، پھر وہاں سے مدنپورہ کی احمد بلڈنگ میں منتقل ہوگئے اور اخیر میں ایک زمانہ تک 153 جنجیکر اسٹریٹ میں مقیم رہے۔(106) شہر کے شور وغل سے دور اپنے کمرہ میں رہ کر انہوں نے الگ الگ موضوعات پر چھوٹی بڑی اکیس کتابیں تحریر کیں، جو مختلف اداروں سے اپنے اپنے موقعوں پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے پہلی کتاب ''اسلامی نظامِ زندگی'' ہے جو ان کے ممبئ آنے کے پندرہ سولہ روز بعد ہی شائع ہوئی تھی، بعد ازاں اگلے تیس سالوں میں مندرجہ ذیل کتابیں منظر عام پائیں:

1۔افاداتِ حسن بصری	2۔الصالحات
3۔مسلمان	4۔معارف القرآن
5۔رجال السند و الهند	6۔حج کے بعد
7۔طبقات الحجاج	8۔علیؓ و حسینؓ
9۔عرب و ہند عہدِ رسالت میں	10۔ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
11۔ العقد الثمین	12۔اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ
13۔مآثر و معارف	14۔خلافت راشدہ اور ہندوستان
15۔تذکرہ علمائے مبارکپور	16۔دیارِ پورب میں علم اور علماء
17۔خلافتِ امویہ اور ہندوستان	18۔ الهند فی عهد العباسین
19۔تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں	
20۔قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک	

ان کے علاوہ مزید کچھ کتابیں انہوں نے ممبئ سے اپنے وطن مبارک پور لوٹنے کے بعد لکھیں۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ایک موضوع پر الگ الگ عنوان سے مقالات لکھ کر کسی رسالہ یا

اخبار میں شائع کراتے، پھر تمام مضامین کی اشاعت کے بعد انہیں کتابی شکل میں یکجا کر کے طباعت کے لئے ناشر کے پاس بھیج دیتے، کچھ دنوں بعد کتاب چھپ کر منظر عام پر آجاتی۔ مثال کے طور پر ان کی ایک کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' ہے، پہلے اس کے تمام مضامین 7 نومبر تا 17 دسمبر 1959ء میں روزنامہ ''انقلاب'' میں قسط وار شائع ہوئے اور پھر تین ماہ بعد مارچ 1960ء میں کتاب منظر عام پر آگئی۔ اسی طرز پر ان کی دوسری کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

اداروں کا قیام

درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کو سماجی وفلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی اور وہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اس حوالہ سے حج کے موقع پر حجاج کرام کی خدمت ان کا قابل ذکر مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ ممبئی کے زمانۂ قیام میں انہوں نے اسی قسم کی دوسرے امور بھی انجام دیئے، جن میں سے ایک مسلمانوں میں دینی وعصری تعلیم کو فروغ دینے کے لئے چند ایسے اداروں کا قیام ہے جو ان کے تعاون وکوششوں سے وجود میں آئے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کے قائم کردہ اداروں میں ''مدرسہ مفتاح العلوم'' قدیم ترین ادارہ ہے، جسے انہوں نے ممبئی سے متصل اپنے ہم وطن لوگوں سے آباد شدہ علاقہ ''بھیونڈی'' میں 11 جمادی الثانیہ 1371ھ/1951ء میں قائم کیا تھا۔ (107) ہندوستان کے اکثر بڑے مدارس کی طرح اس مدرسہ کی ابتدا بھی ایک کمرہ کے اندر مکتب کی شکل میں ہوئی جہاں قاضی صاحب کے ہم وطن دوست مولوی محمد یٰسین ابراہیم پوری اس کے پہلے مدرس ہوئے۔ بھیونڈی میں آباد اعظم گڑھ کے خوشحال باشندوں نے اپنے مال سے اس ادارہ کا بھرپور تعاون کیا اور اتنی ترقی دی کہ بعد میں اس نے ایک بڑے ادارہ (جسے عرفِ عام میں عظیم الشان قلعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کی شکل اختیار کرلی، اور آج بھی سیکڑوں طلبہ اس میں زیرِ تعلیم ہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم کے بعد قاضی صاحب نے اسی طرز کا ایک دوسرا ادارہ 1981ء میں اپنے گھر کے قریب مبارک پور میں قائم کیا اور غالباً ممبئی کے ''المکتبۃ الحجازیہ'' (جہاں سے ان کی شہرہ آفاق کتاب ''رجـــال السند والهند'' 1958ء میں شائع ہوئی تھی) کی نسبت سے اس کا نام ''المدرسۃ الحجازیہ'' رکھا، ساتھ ہی اس کے احاطہ میں ''حجازی مسجد'' تعمیر کرائی۔ یہ مدرسہ اپنے معاصر مدرسہ مفتاح العلوم کی طرح ترقی نہ کرسکا اور آئندہ کے لئے ایک مکتب کی شکل میں سمٹ کر رہ گیا، البتہ اس کی یہ کمی ''انصار گرلس اسکول'' نے پوری کردی، جسے انہوں نے اسی سے تھوڑے فاصلہ پر پانچ سال قبل 1976ء میں قصبہ کی بچیوں میں عصری تعلیم کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا

تھا، بعد میں اس اسکول نے ترقی کر کے ''انصار گرلس انٹر کالج'' کی شکل اختیار کر لی۔ بیسویں صدی عیسوی میں کسی عالم کے ذریعہ اس طرح کے ادارہ کا قیام اپنے آپ میں ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، کیونکہ اس وقت کے ہندوستان میں اکثر علما مسلم بچیوں کے لئے دینی مدارس قائم کرنے کی حمایت میں نہیں تھے، چہ جائے کہ کسی عصری تعلیمی ادارہ کے، اور مستزاد اس پر یہ کہ تعلیم سے بچیوں کو آراستہ کرنے کے فکر مند بھی تھے۔ بہر حال اس اسکول کو قائم کر کے قاضی صاحب نے اپنے وسیع النظر ہونے کا ثبوت دیا، اور اپنے علمی آباواجداد میں سر سید احمد خاں سے نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کے عملی طریقہ کی اتباع کر کے قصبہ مبارک پور میں حال و مستقبل میں پیدا ہونے والی ہزاروں بچیوں کے لئے عصری تعلیم حاصل کرنے کا سامان مہیا کیا۔

ان تین تعلیمی اداروں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری نے دوستوں کے اشتراک وتعاون سے کتابوں کی نشر واشاعت کے لئے مالیگاؤں میں ''ادارہ احیاء المعارف'' اور مبارک پور میں ''دائرہ ملیہ'' کے نام سے دو علمی ادارے بھی قائم کئے، ان میں اول الذکر دو تین کتابوں کی اشاعت کے بعد ہی بند ہو گیا، البتہ ثانی الذکر ابھی بھی کسی نہ کسی حالت میں باقی ہے۔

دیگر علمی مصروفیات

تیس سال ممبئی میں قیام کے دوران درس وتدریس اور روزنامہ ''انقلاب'' و ماہنامہ ''البلاغ'' میں ملازمت کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ''برہان'' دہلی، ''دار العلوم'' دیوبند اور ہفت روزہ ''صدق جدید'' وغیرہ کے لئے بھی مقالات ومضامین لکھتے تھے، ساتھ ہی کتابوں کی جمع وتدوین اور تصنیف وتالیف بھی ان کا مشغلہ تھا، اسی میں بہت محدود طور پر ان کا کچھ وقت شہر کی علمی واصلاحی سرگرمیوں کے لئے بھی وقف تھا جس کا ایک نمونہ سطورِ بالا میں بیان کیا گیا ہے۔

روزنامہ ''انقلاب'' میں مضامین شائع ہونے کے سبب عوام وخواص، امیر وغریب اور قدیم وجدید تعلیم یافتہ لوگوں میں قاضی صاحب کی کافی شہرت ہوئی اور ہر آشنا شخص نے اس شہر میں ان سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ فلمی دنیا کے بعض لوگ بھی ان کے گرویدہ ہوئے اور کئی ایک نے ان سے مختلف قسم کی فرمائشیں بھی کیں۔(108) اپنی خود نوشت سوانح ''کاروانِ حیات'' میں انہوں نے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے چالیس سے زائد ایسے افراد کا ذکر کیا ہے جن سے ممبئی میں ان کا خاص تعلق تھا۔

عربی زبان پر عبور حاصل ہونے کے باعث اس شہر (ممبئی) میں آباد عربوں سے بھی قاضی اطہر مبارکپوری

کے تعلقات قائم ہوگئے تھے اور رمضان میں یہاں کی مسجدوں میں وہ مصری قراء کے ساتھ گشت لگا کر ان کے خطبات اردو میں ترجمہ کر کے عوام کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اسی طرح عرب ممالک کے بادشاہوں، سفیروں اور علما کی ممبئ آمد کے موقع پر ان کا استقبال کرنا اور نجی محفلوں میں علمی موضوعات پر ان سے گفتگو کرنا بھی ان کے معمولات میں شامل تھا، اس حوالہ سے 9 اپریل 1960ء کو مصر کے صدر جمال عبدالناصر (م 1970ء) کے ساتھ ان کی خاص ملاقات قابلِ ذکر ہے، اس موقع پر وہ جمعیۃ علماء ہند کے وفد کے ساتھ ان سے گورنر ہاؤس میں ملے اور اپنی کتاب ''**رجال السند والهند**'' ہدیہ کی۔ غرض یہ کہ اس شہر میں رہ کر اپنی محنت سے انہوں نے ہر وہ چیز حاصل کی جس کے لئے وہ یہاں آئے تھے، مگر اسی کے ساتھ دو چیزوں سے انہیں دستبردار بھی ہونا پڑا، اول شعروشاعری کہ جس کے سبب یہاں تک انہیں رسائی حاصل ہوئی تھی۔ ممبئ آنے کے بعد شروع کے چند سال وہ اس سے وابستہ رہے، لیکن آگے چل کر مصروفیات کی کثرت اور وقت کی کمی کے سبب انہوں نے اس سے تعلق منقطع کرلیا، جیسا کہ ان کا بیان ہے:

> ''میری خورد شاعری نے مجھے آگے بڑھانے میں بڑی مدد کی، لاہور کے اخبار ''زمزم'' اور اخبار ''مسلمان'' (بعد میں کوثر) میں میرے اشعار کثرت سے چھپتے تھے جس سے بحیثیت شاعر مشہور ومتعارف ہوا اور یہی تعارف مرکز اہل سنت امرتسر اور اخبار زمزم لاہور جانے کا سبب بنا اور یہی بمبئی جانے کا سبب بنا، اس طرح میری شاعری نے مجھے بہت فائدہ دیا مگر اب اس سے میرا تعلق نہیں رہا۔ معلوم نہیں میں نے اس سے بے وفائی کی یا اس نے مجھے اچھی راہ پر لگا کر خود کنارہ کشی اختیار کرلی۔'' (109)

اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''چند ہی دنوں کے بعد بمبئی کے مسلمانوں میں میرا اچھا خاصا تعارف ہوگیا، ابتدا میں مشاعروں میں شریک ہوتا تھا اور سامعین بڑے احترام سے میرے اشعار سنتے تھے، تحت اللفظ سناتا تھا، ہر مشاعرہ میں میری شرکت ضروری ہونے لگی اور یہ بات میرے پڑھنے لکھنے میں حارج ہونے لگی تو بالکل ترکِ تعلق کرلیا۔'' (110)

اور دوم مال و دولت کہ جس کی تلاش کی خاطر اپنے علاقہ کے لاکھوں افراد کی طرح وہ اس بین الاقوامی شہر میں آکر آباد ہوئے تھے۔ یہاں ان کو عزت وشہرت خوب ملی، مگر درمیان میں ضمیر حائل ہونے کے باعث بے پناہ مال و دولت حاصل کرنے سے قاصر رہے، یہی وجہ ہے کہ تیس سال اس شہر میں رہنے کے باوجود قانوناً یہاں نہ شہریت حاصل کی اور نہ زمین کا کوئی ٹکڑا خریدا، بلکہ مسافرت کی زندگی بسر کی، حالانکہ کئی مرتبہ انہیں اس کا موقع ملا جو ہمیشہ بے فائدہ رہا۔ بقول ان کے:

''کئی بڑے لوگوں نے خواہش ظاہر کی میں ان کے یہاں آؤں جاؤں یا ان کو اور ان کے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر تعلیم دوں، دوسروں سے کہلواتے تھے مگر میں اس کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا، حالانکہ پیسہ کمانے کا خوب موقع تھا اور بہت سے مولوی ملا اس طرح خوب کماتے تھے مگر میرا مقصد دولت کمانا نہیں تھا، بلکہ دولت کے شہر میں رہ کر علم دین کی خدمت تھا، البتہ ایک خاندان محمد احمد برادرس (احمد بھائی) سے اس قسم کا تعلق انجمن خدام النبی اور البلاغ کے ذریعہ پیدا ہوا اور ان حضرات نے میری ہر طرح قدر دانی کی اور میرے علمی کام کو آگے بڑھایا، ایک زمانہ میں احمد بھائی مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ کوئی چھوٹی سی فیکٹری لگالیں، فیکٹری ایریا تلاش کریں تاکہ اطمینان وسکون کے ساتھ کام کریں اور معاشی حالت اچھی رہے، ان کے اصرار پر میں بعض جگہ گیا بھی، مگر چونکہ رجحان نہیں تھا اس لئے بیٹھ گیا، حکیم اعظمی صاحب مجھ کو بار بار تاکید کرتے تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور احمد بھائی کی توجہ سے کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگالو۔ بعض احباب خصوصاً ہمارے دوست قادری صاحب بار بار کہتے تھے کہ میں کمرے کا انتظام کر دیتا ہوں بال بچوں کو یہاں بلالیں مگر میں اس کے لئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ بمبئی کی زندگی مجھے بالکل پسند نہیں تھی، میں تیس سال بمبئی میں رہا مگر اپنے کو بمبئی والا نہیں بنایا اور نہ کبھی وہاں مستقل قیام کا خیال ہوا۔''(111)

وطن مبارک پور میں قیام

تیس سال ممبئی میں زندگی کا ایک بڑا حصہ علمی کاموں میں صرف کرنے کے بعد 65 برس کی عمر میں نومبر 1980ء یا اس کے بعد کی کسی تاریخ میں قاضی اطہر مبارکپوری اپنے وطن مبارک پور واپس لوٹ آئے۔(112) اور بقیہ زندگی اسی سال تعمیر کردہ مکان ''قاضی منزل'' کے ایک کمرہ کو ذاتی کتب خانہ کی شکل دے کر اسی میں گزار دی۔ ممبئی چھوڑنے کی اصل وجہ ان کے وہ اہل وعیال تھے جن کے نان ونفقہ اور تعلیم وتربیت کی خاطر کسب معاش کے لئے وہ وہاں گئے تھے، مگر اب وہ سب اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے تھے اور چھ بچوں میں سے دو بیٹے قاضی خالد کمال اور قاضی سلمان مبشر عالمی ادارہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد سعودی حکومت کی جانب سے دعوت وتبلیغ کے لئے گھانہ (شمالی افریقہ) میں مبعوث تھے۔(113) غرض یہ کہ جس مقصد کے تحت وہ ممبئی گئے تھے اس کی اب تکمیل ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود اگلے دس سال تک روزنامہ ''انقلاب'' سے ان کا تعلق قائم رہا اور وہ بدستور اس کے لئے مضامین لکھتے رہے۔

قاضی صاحب نے 1973ء ہی میں ممبئی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر کسی بنا پر چھوڑ نہیں پائے، اس وقت ان کے استاذ مولانا سید محمد میاں نے ان کی لیاقت کے اعتبار سے ایک خط کے جواب میں انہیں انسائکلو پیڈیا آف انڈیا، تاریخ مذاہبِ ہند اور تاریخ علماء ومشائخ ہند میں سے کسی ایک موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔(114) سات برس بعد جب وہ واپس آئے تو اپنے محدود وسائل اور مشکل کشا کام ہونے کے باعث وہ اس مشورہ پر عمل تو نہ کر سکے ،البتہ اس کی جگہ آئندہ زندگی میں، جو کہ صرف سولہ سال تھی، مختلف موضوعات پر درج ذیل کتابیں ضرور تحریر کیں:

1۔ خلافتِ عبّاسیہ اور ہندوستان　　2۔ آثار واخبار

3۔ تدوین سیر ومغازی　　4۔ خیر القرون کی درسگاہیں

5۔ ائمہ اربعہؒ　　6۔ اسلامی شادی

7۔ خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات　8۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ زندگی کے اس آخری مرحلہ میں دوسرے سماجی امور ومعاملات میں بھی وہ مصروف رہے، چنانچہ قصبہ اور اطراف قصبہ میں قائم مدارس کے جلسوں اور فلاح وبہبود کے پروگراموں میں شریک ہونا ان کی زندگی کا اہم حصہ بن گیا، اپنے علمی وقار کے باعث اب وہ اگلی نسل کے علما کے سرپرست تھے اس لئے

جب کبھی کسی مدرسہ میں جاتے تو مزاج میں سادگی کے سبب وہاں کے طلبہ استفادہ کی غرض سے ان کے گرد جمع ہوکر کسی علمی یا تاریخی موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے، نیز وہ خود بھی بے تکلف ہوکر طلبہ سے اظہارِ خیال کرتے تھے، اس کی واضح مثال دارالعلوم دیوبند ہے جہاں وہ شیخ الہند اکیڈمی کے مشرف تھے اور سال میں کم از کم دو مرتبہ کچھ دن کے لئے وہاں جاتے تھے۔ ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، جو کہ اس زمانہ میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس حوالہ سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری خوش نصیبی سے اس زمانہ میں قاضی اطہر مبارکپوری دیوبند تشریف لائے۔ ان کی خدمت میں تقریباً روزانہ حاضری رہتی، ان کی ذات سے بڑا فیض ملا۔ ان کو بھی مجھ سے بڑا تعلق ہوگیا تھا کبھی میں حاضر نہیں ہو پاتا تو خود میرے کمرے میں تشریف لے آتے تھے۔''(115)

تنظیموں اور اداروں کی رکنیت

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریریں مقالات و مضامین اور کتابوں کی شکل میں جب منظرِ عام پر آئیں تو علمی حلقوں میں ان کی بڑی پزیرائی ہوئی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے، عملی طور پر اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ملک و بیرونِ ملک کی بعض علمی و دینی تنظیموں نے اپنے اداروں سے منسلک کر کے ان کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ حسب ذیل تیرہ سماجی و مذہبی تنظیموں اور علمی اداروں میں رکن کی حیثیت سے انہوں نے مختلف اوقات میں مفوضہ خدمات انجام دیں:

1۔ معتمد: انجمن تعمیرات ادب مزنگ، لاہور۔
2۔ مشیر علمی: ادارہ التراث العربی، کویت۔
3۔ صدر: جمعیۃ علماء ہند، مہاراشٹر، ممبئی۔
4۔ صدر: دینی تعلیمی بورڈ، مہاراشٹر۔
5۔ رکن: انجمن خدام النبیؐ، ممبئی۔
6۔ رکن: رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد، ممبئی۔
7۔ رکن تاسیسی: آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ۔
8۔ مشرف: شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند۔
9۔ اعزازی رفیق: دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔
10۔ اعزازی مدیر: ماہنامہ ''برہان'' دہلی۔

11۔رکن مجلس شوریٰ: دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال۔

12۔رکن مجلس شوریٰ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

13۔رکن مجلس شوریٰ: جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور، بہار۔

ان میں مؤخر الذکر سات اداروں کے وہ تاحیات رکن رہے، جبکہ اول الذکر چھ اداروں سے وقتی طور پر ان کا تعلق رہا۔(116)

اعزازات

دینی اور ملّی تنظیموں کے علاوہ حکومتِ ہند نے بھی قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کو تسلیم کیا، چنانچہ جشنِ آزادی کے موقع پر 15 اگست 1984ء کو صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ (م 1994ء) نے بدستِ خود انہیں عربی زبان پر مسلمہ قابلیت اور علمی شغف کے لئے توصیفی سند اور کشمیری چادر سے نواز کر عزت افزائی کی، ساتھ ہی تاحیات پانچ ہزار روپے سالانہ کی پیشکش بھی کی۔(117) حکومت سے ملنے والے اس اعزاز کی خوشی میں دہلی سے اعظم گڑھ واپسی کے بعد اگلے روز وہاں کے لوگوں نے شبلی کالج میں ایک جلسہ منعقد کیا اور ضلع مجسٹریٹ جناب اشوک پریہ درشی کی صدارت میں موصوف کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس واقعہ کو یادگار کے طور پر ان کے ایک تلمیذ رشید محمد عثمان معروفی نے نظم کی شکل میں محفوظ کرلیا۔(118)

حکومتِ ہند سے حاصل ہونے والے اس اعزاز سے قبل اسی سال مارچ 1984ء میں پڑوسی ملک پاکستان کے ایک ادارہ "تنظیم فکرونظر سکھر" سندھ نے ریاستی حکومت کے اشتراک وتعاون سے ایک جلسہ کا انعقاد کیا جس میں انہوں نے ہندوستان کے ایک علمی وفد کے ساتھ قاضی صاحب کو بھی بلایا، اس جلسہ میں شریک پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق (م 1988ء) نے قاضی صاحب کو اپنے ہاتھوں سے سندھ کی روایتی ٹوپی پہنائی اور تنظیم فکرو نظر کا نشان عطا کیا۔ دو سال بعد اسی ادارہ کے زیرِ اہتمام عرب وہند کی ابتدائی چار سو سالہ اسلامی تاریخ پر مبنی موصوف کی چار کتابوں کے رسمِ اجراء کے موقع پر 10 اگست 1986ء کو کراچی کے تاج ہوٹل میں ایک تقریب منعقد ہوئی، جس میں پاکستان کی سربرآوردہ علمی ہستیوں نے بھی شرکت کی۔(119) اس موقع پر صاحبِ کتب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے، دورانِ تقریب تنظیم کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو نے خطبۂ استقبالیہ میں انہیں "محسنِ سندھ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔(120) ساتھ ہی حکومت کی طرف سے شہریت اور دیگر بنیادی سہولیات کی بھی پیشکش کی، لیکن وطن سے محبت اور سادگی وخودداری کے سبب قاضی اطہر مبارکپوری نے اسے قبول کرنے سے انکار

کردیا۔ پڑوسی ملک سے حاصل ہونے والا یہ اعزاز اپنی نوعیت کے لحاظ مذکورہ قومی اعزاز پر بھاری تھا۔

حکومتی سطح کے ان اعزازات کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کو ان کے علمی مقام ومرتبہ کی بنا پر مختلف تقریبات میں انعام واکرام سے نوازا گیا۔

مرض اور سانحۂ ارتحال

1980ء میں ممبئی سے گھر واپسی پر علمی کاموں میں مزید سولہ سال مصروف رہنے کے بعد بیاسی برس کی عمر میں قاضی صاحب کا جسم اب بوڑھا ہو چکا تھا اور انتقال سے ایک سال قبل زکام اور رطوبت جیسی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باعث کمزوری کی علامات ان پر ظاہر ہونے لگی تھیں، ان کے صاحب زادہ قاضی ظفر مسعود کے مطابق اس سے قبل ان کی ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی تھی، مگر اس حالت میں بھی صحت جیسے ہی کچھ درست ہوتی، اپنے آپ کو علمی کاموں میں مصروف کر لیتے تھے۔(121) لیکن ان کا یہ علمی سلسلہ زیادہ دن برقرار نہیں رہا اور چھ سات ماہ بعد ہی جولائی 1996ء میں چند دن مرض الموت کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اسی ماہ کی 14 تاریخ کو رات دس بجے ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔(122)

اگلے دن 15 جولائی کو بعد نمازِ ظہر تجہیز وتکفین کے فرائض طے پائے اور دنیا سے رخصت ہو چکے اس مؤرخ اسلام کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے قصبہ کے علاوہ اعظم گڑھ اور اس کے ہمسایہ اضلاع سے علما کی اکثریت پر مشتمل لوگوں کی بھیڑ مبارک پور کے محلّہ حیدر آباد میں جمع ہوئی۔ میت کے دوستوں میں سے ایک مفتی ابو القاسم نعمانی (موجودہ مہتمم دار العلوم دیوبند) نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر گھر سے تین منٹ کے فاصلہ پر بجانب مغرب آبائی قبرستان شاہ کا پنجہ میں جسمِ اطہر کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔(123)

حلیہ اور اخلاق وعادات

قاضی اطہر مبارکپوری میانہ قد، گھنی داڑھی، کشادہ جبین اور گندمی رنگ کے بڑے ذہین آدمی تھے، جسم متوازن تھا یعنی نہ بہت دبلے اور نہ بہت موٹے تھے، سفید گزی گاڑھے کا کرتا پائجامہ اور کشتی نما ٹوپی پہنتے تھے، بینائی کمزور ہونے کے سبب ہمیشہ ان کی آنکھوں پر زیادہ پاور کا چشمہ لگا رہتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع کی نسبت خود نوشت سوانح میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''سفید گزی گاڑے کا کرتا پائجامہ عام لباس تھا، شیروانی بہت کم پہنتا تھا، اوپر صدری ہوا کرتی تھی، ٹوپی کشتی نما اچھے کپڑے کی ہوا کرتی تھی جوتا اس زمانہ کے لحاظ سے قیمتی ہوتا تھا، عطر کی شیشی ہمیشہ جیب

میں رکھتا تھا، کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا، یہی وضع قطع آج بھی باقی ہے، مگراب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات مضر، موہم، بخل اور باعث تحقیر ہوجاتی ہے۔''(124)

اخلاقی طور پر وہ بڑے خوددار، کفایت شعار، دنیا سے بے رغبت اور مہمان نواز قسم کے انسان تھے، ان میں بعض عادتیں ایسی بھی تھیں جن پر معاصرین ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ مثلاً محمد نعیم صدیقی ان کے اخلاق وکردار کی بابت بیان کرتے ہیں:

''میرے لیے بعض وقت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ قاضی صاحب کے کردار واخلاق کا پلہ بھاری ہوجاتا ہے یا ان کے علمی وتصنیفی فضل وکمال کا۔''(125)

اور مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔''(126)

متذکرہ بالا ان دونوں اقتباسات کی بناپر معاصرین نے اپنی تحریر وگفتگو میں ان کی جن خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے بعض الگ الگ ذیلی عناوین کے تحت یہاں بیان کی جارہی ہیں۔

سادگی:۔ قاضی اطہر مبارکپوری حد درجہ سادہ لوح انسان تھے اور ہمیشہ معمولی وضع قطع میں رہا کرتے تھے، جس کے باعث بسا اوقات ان سے ملنے والے لوگ لباس یا طرز زندگی سے ان کی شناخت نہیں کرپاتے تھے۔ اس حوالہ سے قاضی ظفر مسعود انہی کی زبانی ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ دوپہر میں کمرے میں لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا تو انہوں نے کہا کہ میں قاضی اطہر مبارکپوری سے ملنے آیا ہوں، والد صاحب نے کہا کہ اندر آیئے اور بیٹھئے! والد صاحب نے کرتہ پہن کر کہا کہ میں ہی قاضی اطہر ہوں تو وہ صاحب کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے آپ مجھے سینے سے لگالیں میں صرف آپ سے ملنے کے لیے احمد آباد سے آیا ہوں۔''(127)

اسی خوبی سے متعلق زمانۂ طالب علمی میں ان سے ملاقات کا ایک واقعہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں قاضی صاحب کے ارشادات سن رہا تھا، نگاہیں قاضی صاحب کے لباس، سامان اور جوتوں کا جائزہ لے رہی تھیں دل ودماغ محو حیرت تھے، ذہن میں قاضی صاحب کی شخصیت کا جو تصور تھا قاضی صاحب اس سے سراسر مختلف نکلے، ایسی سادگی، ایسی تواضع، ایسی مسکنت اور ایسی محبت جو خال خال نظر آتی ہے، قاضی صاحب کی بات چیت، لباس اور طرز معیشت ومعاشرت کہیں سے بھی نہیں جھلکتا تھا کہ

وہ اتنے بڑے آدمی ہیں۔" (128)

اسی طرح ان کے احباب میں سے مفتی ابوالقاسم نعمانی نے ایک انٹرویو میں بتایا:

> " قاضی صاحب دیکھنے میں معمولی قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے، انہیں دیکھ کر کوئی یہ بھی خیال نہیں کرسکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم اور مؤرخ ہیں۔" (129)

قوت ارادی:۔ ایک خوبی قاضی اطہر مبارکپوری میں یہ بھی تھی کہ وہ مضبوط ارادہ کے مالک اور عزم مصمم کے پیکر تھے، جب کسی کام کا ارادہ کرلیتے تو پھر پورا کرکے ہی دم لیتے، چنانچہ یہ ان کا استقلال اور مستقل مزاجی ہی تھی کہ عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر تحقیقی کتابیں لکھیں ورنہ کسی فردِ واحد کے لئے ایسا کام کرنا آسان نہیں ہے، ان کے اس وصف پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی روشنی ڈالتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> " عام طور پر طبیعتیں کسی خاص موضوع پر کچھ دنوں تک کام کرنے کے بعد ادھر سے اچاٹ ہوجاتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ کام کسی درجہ میں پائے تکمیل کو پہنچ جائے۔ لیکن قاضی صاحب میں ایسی استقامت طبع تھی کہ ایک موضوع پر کام کرتے ہوئے وہ اکتاتے نہ تھے۔" (130)

غیرت وحمیت:۔ قاضی اطہر مبارکپوری انتہائی غیرت مند اور قناعت پسند انسان بھی تھے، اپنے اندر غضب کی شان استغناء رکھتے تھے، انہوں نے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا، نہ کبھی علم کو بیچا اور نہ اسے مال ودولت کا ذریعہ بنایا، یہی وجہ ہے کہ وہ ناشرین کو بغیر کسی رائلٹی کے اپنی کتابیں چھاپنے کی اجازت دے دیتے تھے، زندگی میں محض ایک مرتبہ انہوں نے اپنی کتاب "الصالحات" پر رائلٹی لی جس پر تاعمر افسوس زدہ رہے۔ (131) انہوں نے ہمیشہ جھونپڑی کو محل پر اور غربت کو مال ودولت پر ترجیح دی، اس کی کئی مثالیں انہوں نے اپنی خودنوشت "کاروانِ حیات" میں بیان کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے صاحب زادہ قاضی ظفر مسعود ذیل کے اقتباس میں مولانا مختار احمد ندوی کی تحریر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:

> " قاضی صاحب نے کبھی اپنے علم کا رعب نہیں جمایا اور نہ اپنے خداداد علم کو دنیا کی پونجی بنایا، وہ چاہتے تو علم کی جس بلندی پر تھے دنیا ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی اور زینہ بزینہ اس سے زیادہ مادی ترقی کے مینار پر ان کو پہنچا دیتی۔ قاضی صاحب ایک مثالی انسان تھے انہوں نے بمبئی کے سیٹھوں کو کبھی منہ نہیں لگایا یا کسی کے پاس اپنی یا اپنی اولاد کی ضرورت لے کر نہیں گئے، انتہا درجہ کے خوددار، غیرت مند اور حساس آدمی تھے، قناعت اور صبر وتحمل ان کی عادت تھی۔" (132)

اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے بقول:

> " خاکساری اور سراپا عجز وفروتنی کے باوجود ان میں بڑی غیرت وخودداری بھی تھی، طبیعتاً نہایت

مستغنیٰ اور بے نیاز واقع ہوئے تھے، ہمیشہ علم کے وقار وعظمت کا خیال رکھتے، نہ کبھی علم کا سودا کیا اور نہ ارباب دول کی عقیدت ونیاز مندی کا دم بھرا۔'' (133)

خوردنوازی اور حوصلہ افزائی: ۔ان میں ایک عادت خوردنوازی کی بھی تھی یعنی وہ ہمیشہ چھوٹوں اور ماتحتوں سے نرمی کے ساتھ پیش آتے، ان کے کاموں کو سراہتے اور عزت کی نگاہ سے انہیں دیکھتے تھے، نیز اکابر کے کارناموں کے ذریعہ ان میں لکھنے پڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتے تھے۔تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے احوال واوصاف میں ان کی خوردنوازی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے چند تحریروں سے اقتباسات ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں:

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''یہ ان کی عظمت تھی کہ وہ چھوٹوں اور خردوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، اسی وجہ سے ان کو پکڑ کر چلنا سکھاتے تھے۔'' (134)

اور ضیاء الدین اصلاحی بیان کرتے ہیں:

''وہ اپنے خردوں اور نیاز مندوں سے بھی بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملتے تھے اور ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کا دل بڑھاتے اور ان کی دل جوئی کرتے تھے۔'' (135)

ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب کے ایک نوجوان استاذ مولانا عارف جمیل مبارکپوری نے اس حوالہ سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا:

''طالب علمی کے زمانہ میں ایک مضمون لکھنے کے بعد اصلاح کی غرض سے اسے لیکر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، قاضی صاحب نے سرسری طور پر مضمون پر نگاہ ڈالنے کے بعد فرمایا کہ بہت اچھا مضمون ہے اسے چھپنا چاہئے، چنانچہ فوراً اپنے بیٹے کو موٹر گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا اور مجھے ساتھ لیکر اسی وقت دارالمصنفین کا قصد کیا، وہاں ''معارف'' کے ایڈیٹر مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے ملے اور مضمون چھاپنے کی انہیں تاکید کی، بعد میں میرا مضمون معارف میں شائع ہوا۔'' (136)

مذکورہ اقتباس میں منقول واقعہ 1995ء کی کسی تاریخ کا ہے کیونکہ مولانا عارف جمیل کا مضمون بعنوان ''سجدۂ تحیت وتعظیم'' جنوری 1996ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ قاضی اطہر مبارکپوری کی خوردنوازی ہی تھی ورنہ دنیا بھر میں مشہور اسّی سال کا ایک عمر دراز شخص، جسے چند ماہ بعد اس دارِ فانی سے کوچ کرنا تھا، پندرہ سال کے نوعمر لڑکے کے مضمون کی اشاعت کے لئے تگ ودو سے کام کیوں کر لیتا۔

ان چند خصوصی صفات کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے قوتِ حافظہ، کثرتِ مطالعہ، توکل واستغناء اور وسعتِ قلب ونظر کو بھی ان کے اخلاق وکردار کا جزء قرار دیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(1) حبیب اللہ،اعظم گڑھ کا علمی ادبی اور تاریخی پس منظر،اسلامک بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی،2004ء،ص:11

(2) ندوی،سید سلیمان،حیات شبلی،شبلی اکیڈمی دارالمصنفین ،اعظم گڑھ،2015ء،ص:114

(3) Brockman, D.L.Drake,Azamgarh A Gazetteer,Vol:XXXIII,Newal Kishore Press,Lucknow,1911,P:166-168

(4) ایضاً،ص:172،173

(5) ایضاً،ص:1

(6) حیات شبلی،ص:113

(7) اعظم گڑھ کا علمی ادبی اور تاریخی پس منظر،ص:17

(8) ایضاً،ص:19،18

(9) سہیل،اقبال احمد خاں،کلیات سہیل،شبلی اکیڈمی دارالمصنفین ،اعظم گڑھ،2011ء،ص:243

(10) اس حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں مولانا حمید الدین فراہی،مولانا غلام نقشبند،مولوی عبدالقادر، مولانا قاضی علی اکبر،مولانا عنایت رسول،مولانا محمد فاروق،مولانا غلام فرید،مولانا محمد کامل،ڈپٹی محمد کریم اور جسٹس سید عبدالرؤف کے اسماء ذکر کیے ہیں۔مزید معلومات کے لئے''حیات شبلی''صفحہ 117 تا119 ملاحظہ کیجیے۔

(11) حیات شبلی،ص:113

(12) ایضاً،ص:119،118

(13) مبارکپوری،قاضی اطہر،تذکرہ علمائے مبارک پور،مکتبۃ الفہیم ،مئو،2010ء،ص:43

(14) Azamgarh A Gazetteer,P:260

(15) مبارک پور کے ان اٹھائیس محلوں میں سے نصف اندرون قصبہ اور نصف اس کے اطراف میں واقع ہیں۔اندرون قصبہ محلوں میں پورہ صوفی اور پورہ رانی قدیم آبادیاں ہیں،ان کے علاوہ حیدرآباد بھی قصبہ کا ایک محلّہ ہے جو عمر کے آخری حصہ میں موضوعِ مقالہ کا مسکن رہا ہے۔قصبہ کے اطراف میں جو بستیاں ہیں ان میں رسول پور،حسین آباد، نوادہ،سرائے مبارک پور،املو،چکیا اور بمھور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں،انہی میں ایک بستی سکھٹی بھی ہے جو کبھی قصبہ سے علیحدہ تھی اور اب اس کے ملحقات میں شامل ہے۔

(16) مبارکپوری،قمرالزماں،صدر رنگ،جعفر لائبریری مبارک پور،اعظم گڑھ،1970ء،ص:17

(17) یعنی ان کا گھر ایسی جگہ واقع ہے جہاں محلّہ پورہ صوفی اور حیدرآباد ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ جس مکان میں قاضی اطہر مبارکپوری کی پیدائش ہوئی وہ پورہ صوفی میں ہے اور جس مکان میں انہوں نے بعد میں رہائش اختیار کی وہ اسی مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر دونوں محلوں کے درمیان سے گزرنے والی سڑک کے دوسری طرف محلّہ حیدرآباد میں واقع ہے، مکان کا نام "قاضی منزل" ہے اور فی الحال قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد کی ملکیت میں ہے، جبکہ وہ مکان جس میں قاضی صاحب کی ولادت ہوئی ان کے ایک دوسرے بھائی کی اولاد کی تحویل میں ہے۔

(18) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:9

(19) لفظ "قاضی" سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ قاضی اطہر مبارکپوری کسی شہر یا علاقہ میں منصب قضاء کے عہدے پر فائز تھے، بلکہ انہوں نے یہ لفظ وراثت میں اپنے بزرگوں سے پایا ہے۔ دراصل راجہ سید مبارک شاہ مانک پوری (بانی مبارک پور) نے پارچہ بافی سے تعلق رکھنے والی جس جماعت سے مبارک پور کو آباد کیا تھا اس میں قاضی صاحب کے آباو اجداد بھی شامل تھے، جو صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ علم وحکمت اور دانائی سے بھی آشنا تھے۔ مبارک پور سے راجہ سید مبارک کے چلے جانے کے بعد یہی لوگ ان کے قائم مقام قرار پائے اور راجہ کی تعمیر کردہ جامع مسجد کے متولی ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس قصبہ میں اہم علمی و دینی خدمات انجام دیں، لیکن ان میں سے کسی کے حالات کتابوں میں مذکور نہیں، قاضی شیخ علی مبارکپوری اس خانوادہ کے پہلے ایسے بزرگ ہیں جن کا تذکرہ صفحۂ قرطاس پر موجود ہے، قاضی اطہر مبارکپوری ان کی ساتویں پشت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دار القضاء محمد آباد گہنہ کی طرف سے مبارک پور کے نائب قاضی بنائے گئے تھے، ان کے بعد نیابتِ قضاء کا یہ عہدہ ان کے خاندان میں اگلی تین پشتوں تک قائم رہا اور بالترتیب قاضی شیخ امام بخش، قاضی محمد رضا، قاضی شیخ حسام الدین اور قاضی شیخ رجب مبارک پور کے نائب قاضی رہے اور پھر برصغیر میں برطانوی قانون کے نفاذ کے بعد سابقہ نظامِ حکومت کی طرح یہ عہدہ بھی منسوخ ہوگیا، البتہ اس کی خوں بوں اس خاندان کے افراد میں بعد تک باقی رہی، چنانچہ نیابت قضاء کا عہدہ ختم ہونے کے بعد بھی لفظ "قاضی" اس خاندان کے افراد کے ناموں سے وابستہ رہا۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنے جدامجد قاضی شیخ علی اور ان کے بعد کے بزرگوں کے حالات و واقعات اپنی تین کتابوں یعنی "تذکرہ علمائے مبارک پور"، "مآثر و معارف" اور "دیار پورب میں علم اور علماء" میں اجمال وتفصیل سے بیان کیے ہیں۔

(20) مبارکپوری، قاضی اطہر، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، مکتبہ صوت القرآن، دیوبند، سن اشاعت غیر مذکور، ص:9

(21) ایضاً، ص:10

(22) کیونکہ مسجد کے امام یا مکتب ومدرسہ کے معلم، جو کہ مولوی صاحب کہلاتے ہیں، اس زمانہ میں راہ چلتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص غلط کام یا نازیبا حرکت کرتا ہوا نظر آتا تو فوراً اسے وہی ڈانٹ ڈپٹ کر منع کردیتے تھے، آج کل ویسا ماحول بالکل نہیں ہے۔

(23) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:10

(24) قاضی اطہر مبارکپوری نے اس حوالہ سے اپنی خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں باقاعدہ تعلیم کے لئے محلّہ کے گھریلو مکتب میں بھیجا گیا، لیکن انہوں نے اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے والدین نے محلّہ کے کسی مکتب میں انہیں ڈالا ہو، لیکن ان کی شرارتوں کے سبب یا ناسازگار ماحول کے باعث پھر مکتب سے ہٹالیا ہو اور گھر پر ہی تعلیم کا انتظام کیا ہو، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ قاضی صاحب نے واقع کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو اور قارئین کے لئے اس کی کیفیت بیان کرنا ضروری نہ سمجھا ہو، البتہ ان کے گھریلو ماحول کے مطالعہ سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مکتبی تعلیم گھر پر ہی والدہ کے پاس ہوئی ہوگی اور پھر جب پڑھنے کی شدبد ہوگئی تو مدرسہ احیاء العلوم میں داخل کرادیے گئے۔ مکمل تفصیلات کے لئے مصنف کی خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے ابتدائی اوراق ملاحظہ کیجیے۔

(25) نگارافشاں، مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ حیات وخدمات، ایوروزا اکاڈمی، علی گڑھ، 2018ء، ص:12

(26) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:12

(27) ایضاً، ص:13

(28) فخرالدین احمد، ''مدرسہ شاہی ایک تاریخی تعلیمی رپورٹ''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''، اکتوبر تا دسمبر 1992ء، (مدیر: محمد سلمان منصورپوری)، مرادآباد، ص:439-432

(29) اشتیاق احمد، ''مورخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری مدظلہ''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''، ص:580-577

(30) رشیدی، اخلد، ''مدرسہ شاہی علم حدیث کا ایک مثالی مرکز''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''، ص: 182-189

(31) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:17

(32) ایضاً

(33) ایضاً

(34) ایضاً، ص:15

(35) ایضاً، ص:15، 14

(36) مبارکپوری، قاضی اطہر، مئے طہور، (مرتب: قمرالزماں مبارکپوری)، قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ، 2006ء، ص:35

(37) قاضی اطہر مبارکپوری کی اولاد کے نام ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

(1) شریف انور (2) انور جمال (3) مولانا خالد کمال (4) قاضی ظفر مسعود (5) امۃ الرحمٰن ام سلمہ (6) قاضی

سلمان مبشر (7) قاضی حسان احمد اور (8) شمیمہ عائشہ۔ ان میں اول الذکر قاضی صاحب کے دونوں بیٹے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، جبکہ بقیہ چاروں لڑکوں اور دونوں لڑکیوں نے طویل عمر پائی اور آخر الذکر چار اولاد ابھی بھی بقید حیات ہیں۔

(38) مئے طہور، ص:35

(39) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:20،21

(40) ایضاً، ص:21،22

(41) ایضاً، ص:23

(42) ادروی، اسیر، ''حدیث یار''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء، (مدیر: اسیر ادروی)، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس، ص:39

(43) اعظمی، محمد زبیر، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی، مئی 2001ء، (مدیر: محمد سلمان منصور پوری)، مرادآباد، ص:49،50

(44) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:25

(45) ایضاً، ص:25،26

(46) کتابوں کی جلد سازی ماضی میں ذریعہ معاش کا ایک اچھا پیشہ تھا، لیکن یہ فن اب تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔

(47) ملاحظہ کیجیے قاضی اطہر مبارکپوری کی خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے صفحات 27 تا 31۔

(48) ایضاً، ص:33،34

(49) دارالمصنفین اعظم گڑھ برصغیر کا ایک اہم علمی و تحقیقی ادارہ ہے جسے علامہ شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے قبل قائم کیا تھا۔ پچھلی ایک صدی سے زائد عرصہ میں اس ادارہ سے علومِ اسلامی کے مختلف موضوعات پر سیکڑوں اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ اس ادارہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ماہنامہ ''معارف'' ہے جو روزِ اول ہی سے اس کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس مجلّہ کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ یہ اپنے علمی و تحقیقی مضامین کے لئے ہمیشہ سے ہی برصغیر کے معیاری مجلّات و رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

(50) دارالمصنفین کی طرح ندوۃ المصنفین بھی ہندوستان کا اہم علمی و تحقیقی ادارہ تھا جو بیس بائیس سال قبل بند ہو گیا۔ اس ادارہ کے روحِ رواں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے جنہوں نے 1938ء میں اسے دہلی کے مٹیا محل علاقہ میں قائم کیا تھا۔ مفتی صاحب نے پچاس سال کے عرصہ میں اس ادارہ سے تاریخ اسلام کے مختلف موضوعات پر سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ ماہنامہ ''برہان'' کے نام سے ادارہ کا ایک علمی ترجمان بھی تھا جس کے پہلے مدیر مولانا سعید احمد اکبرآبادی تھے، 1985ء میں ان کی وفات کے بعد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے بیٹے عمیر الرحمٰن عثمانی مدیر ہوئے اور اپریل

2001ء تک انہی کی ادارت میں یہ ماہنامہ نکلتا رہا۔

(51) رسالہ ''جامعہ'' کا شمار برصغیر کے اہم ترین علمی وادبی رسائل میں ہوتا ہے۔ یہ رسالہ مشہور علمی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اس کے قیام کے دوسال بعد 1923ء میں منظر عام پر آیا اور ملک کی آزادی کے وقت اس نے اپنے علمی وادبی مضامین کے ذریعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور برصغیر کے مسلمانوں کی خوب ترجمانی کی۔ یہ رسالہ آج بھی ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہوتا ہے۔

(52) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص 34

(53) ایضاً، ص 39،40

(54) ایضاً، ص 35

(55) ماہنامہ ''قائد'' مرادآباد کی ابتدا مولانا سید محمد میاں کی زیر ادارت محرم 1357ھ / مارچ 1938ء میں ہوئی اور بیس ماہ بعد شعبان 1358ھ / ستمبر 1939ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اس قلیل مدت کے باوصف اپنے معیار و وقار کی وجہ سے اس وقت کے علمانے اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور متعدد معاصر رسائل وجرائد میں اس کے لئے ستائشی کلمات کہے گئے۔ ذی قعدہ 1357ھ میں اس کا ایک خاص نمبر بعنوان ''صحیفہ سیاست اور مصطفی کمال نمبر'' بھی شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں قاضی اطہر مبارکپوری کے مضامین قسط وار ''ائمہ اربعہ'' کے عنوان سے شائع ہوا کرتے تھے، اس حوالہ سے ان کا ایک مضمون بعنوان ''امام دار الہجرۃ مالک بن انس'' دستیاب ہوا ہے جو شعبان ورمضان 1358ھ کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا مضمون ''مصلح اعظم ﷺ''، جو ربیع الاول 1358ھ کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس موضوع سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے کتاب ''تذکرہ سید الملت''، مطبع فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2018ء، صفحات: 446،435۔

(56) مبارکپوری، قاضی اطہر، ''استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی سے میرا تعلق''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''، ص: 469-440

(57) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص: 37

(58) ایضاً، ص: 41،42

(59) ایضاً ص: 42،43

(60) مبارکپوری، قاضی اطہر علیؓ وحسینؓ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2007ء، ص: 293

(61) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص: 43

(62) احسان دانش، جہانِ دگر، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء، ص: 453

(63) مبارکپوری، قاضی اطہر، کاروان حیات، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء، ص: 60،61

(64) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص:49

(65) کاروان حیات، ص:67

(66) ایضاً،ص:68

(67) ایضاً

(68) ایضاً،ص:74،75

(69) ایضاً،ص:71-76

(70) ایضاً،ص:76،75

(71) ادروی، اسیر، ''حدیث یار''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص:28

(72) کاروان حیات، ص:80

(73) قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''کاروان حیات'' کے صفحات 83،82 ملاحظہ کیجیے۔

(74) ایضاً،ص:88،87

(75) ایضاً،ص:94

(76) ایضاً،ص:105

(77) آٹھ صفحات پر مشتمل یہ اخبار ہر ماہ کی 1، 8، 16 اور 24 تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اخبار سیاسی تھا البتہ دینی، علمی اور ادبی خبریں بھی اس میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی تقرری سے قبل اخبار کے پہلے شمارے میں مولانا ابو الفضل عبدالحفیظ بلیاوی نے ادارت کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس کی مجلس ادارت میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبدالمجید الحریری بنارسی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر سعید انصاری شامل تھے۔ اخبار کا آخری شمارہ 8 مئی 1948ء کو شائع ہوا تھا جس کے دوسرے صفحہ کے آخر میں ''انصار کی اشاعت ملتوی'' کے عنوان سے خبر شائع کر کے اس کے بند ہونے کی اطلاع قارئین کو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

(78) کاروانِ حیات، ص:106

(79) قاسمی، افضال الحق، ''قاضی اطہر مبارکپوریؒ فکر و فن''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، اگست تا ستمبر 2003ء، (مدیر: ضیاء الحق خیرآبادی)، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ، ص:239

(80) ادروی، اسیر، ''حدیث یار''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص:31

(81) کاروانِ حیات، ص:108،107

(82) مدرسہ عالیہ اپنی نوعیت کا ہندوستان میں پہلا ادارہ تھا جو مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے برطانوی عہد میں قائم کیا گیا تھا۔ تقسیمِ بنگال کے بعد اس کے جملہ دفاتر کلکتہ سے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان بعد میں بنگلا دیش) منتقل

کردیے گئے، کلکتہ میں صرف ویران عمارت تھی جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اثر ورسوخ سے دوبارہ آباد کیا۔ آج کل یہ ادارہ عالیہ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔

(83) کاروان حیات، ص:109، 108

(84) ایضاً، ص:110

(85) شمیم طارق، انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2015ء، ص:10، 9

(86) کاروانِ حیات، ص:114

(87) ایضاً، ص:114

(88) ایضاً، ص:115

(89) ایضاً، ص:109

(90) ایضاً، ص:115

(91) ایضاً، ص:119، 118

(92) ایضاً، ص:121

(93) ایضاً، ص:126-122

(94) مبارکپوری، قاضی ظفر مسعود، مورّخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا سوانحی خاکہ اور علمی کارنامے، دائرہ ملیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، 1996ء، ص:24

(95) ادروی، اسیر، ''حدیث یار''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص:33

(96) کاروانِ حیات، ص:132، 133

(97) ہفت روزہ ''البلاغ'' سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم نہ ہوسکی اور نہ ہی اس کا کوئی شمارہ حاصل ہوا، البتہ اس میں قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے شائع شدہ بیس مضامین دستیاب ہوئے ہیں، جن میں پہلا مضمون ''ماہ صیام اور انسانیت کا احترام'' 14 مئی 1954ء کو اس اخبار کے اولین شمارے میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد اسلامی زندگی کے چند حسین حقائق، کعبہ کے فضائل وخصائل، مسافران حج وزیارت کی راہ میں، شمع حرم کے پروانے، ایک حاجی ایک امام اور ایک درزی، انسانی خدمت اور اسلامی اوقاف وغیرہ مضامین بعد کے شماروں میں شائع ہوئے۔ اس اخبار میں ان کے آخری دو مضامین یعنی ''کعبہ کے دوراہی کلیسا میں'' اور ''رحمۃ للعالمین کی بستی'' 22 اکتوبر 1954ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے ان مضامین کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ہفت روزہ ''البلاغ'' 22 اکتوبر 1954ء تک جاری رہ کر بند ہوگیا۔

(98) اعظمی، مسعود سعید، ''مجلّہ البلاغ اور قاضی اطہر صاحب کی خدمات''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص:205-219

(99) ایضاً،ص:217

(100) کاروانِ حیات،ص:145،144

(101) ایضاً،ص:118

(102) ایضاً،ص:134

(103) اعظمی، اعجاز احمد، ''مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نقوش وتاثرات''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص:245-259

(104) کاروانِ حیات،ص:146

(105) یہ تمام اسماء کتاب ''مئے طہور'' اور مجلّہ ضیاء الاسلام کے خصوصی شمارے ''قاضی اطہرؒ نمبر'' سے ماخوذ ہیں۔

(106) کاروانِ حیات،ص:137

(107) ایضاً،ص:118

(108) ایضاً،ص:161

(109) ایضاً،ص:55,54

(110) ایضاً،ص:126،125

(111) ایضاً،ص:160،159

(112) ماہنامہ ''البلاغ'' کا آخری شمارہ نومبر 1980ء میں شائع ہوا تھا، اس لئے گمان غالب ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری اس کے معاً بعد ہی گھر واپس لوٹ آئے ہوں گے، ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ وہ سات آٹھ سال قبل ہی ممبئی چھوڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ ماہنامہ ''ندائے شاہی'' کے خصوصی شمارہ ''تاریخ شاہی نمبر'' کے ص:440-469 پر ان کے مطبوعہ مضمون میں موجود مولانا سید محمد میاں کے خط سے معلوم ہوتا ہے، اس خط پر سن 1973 درج ہے، لیکن پتہ نہیں کیوں انہوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور 1980ء تک ممبئی میں مقیم رہے۔

(113) بعد میں مولوی خالد کمال گھانا سے نیوزی لینڈ اور قاضی سلمان مبشر ہندوستان منتقل ہو گئے۔ اول نے نیوزی لینڈ ہی میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں 1999ء میں وفات پائی، جبکہ ثانی الذکر ابھی بھی حیات ہیں اور اپنے آبائی وطن مبارک پور میں مقیم ہیں۔

(114) مبارکپوری، قاضی اطہر، ''استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی سے میرا تعلق''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''،ص:440-469

(115) تجاروی، محمد مشتاق، ''دورِ طالب علمی سے متعلق چند معروضات''، مشمولہ: یادگار زمانہ شخصیات کا احوال ومطالعہ، (مرتب: ابن الحسن عباسی)، مکتبۃ النور، دیوبند، 2020ء، ص: 524

(116) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص: 56

(117) قاضی صاحب نے ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے صفحہ 56 پر 15 اگست 1984ء ہی لکھا ہے، جبکہ صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے جاری کردہ سند میں 16 مارچ 1985ء درج ہے۔

(118) مئے طہور، ص: 113

(119) کاروانِ حیات، ص: 178، 177

(120) ایضاً، ص: 236

(121) مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا مختصر سوانحی خاکہ، ص: 14

(122) ایضاً، ص: 17

(123) ایضاً، ص: 18

(124) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص: 46

(125) صدیقی، محمد نعیم، ''قاضی اطہر مبارکپوری میری نظر میں''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 301

(126) ندوی، مطیع الرحمٰن، ''قاضی اطہر مبارکپوری بحیثیت مربی ومعلم''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 305

(127) مبارکپوری، قاضی ظفر مسعود، ''محترم والد قبلہ''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 270

(128) کاندھلوی، نور الحسن راشد، ''درویش صفت عالم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری: چند مشاہدات وتاثرات''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 281

(129) مفتی ابوالقاسم نعمانی نے ایک انٹرویو کے دوران اس بات کا اظہار کیا تھا۔

(130) صدیقی، ظفر احمد، ''قاضی صاحب بحیثیت مورّخ ومصنف''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مورّخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 69

(131) تفصیلات کے لئے ''کاروانِ حیات'' کا صفحہ 95 ملاحظہ کیجیے۔

(132) مبارکپوری، قاضی ظفر مسعود، ''محترم والد قبلہ''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 271

(133) اصلاحی، ضیاء الدین، ''مولانا قاضی اطہر مبارکپوری''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 286

(134) ندوی، مطیع الرحمٰن، ''قاضی اطہر مبارکپوری بحیثیت مربی ومعلم''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 307

(135) اصلاحی، ضیاء الدین، ''مولانا قاضی اطہر مبارکپوری''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہرؒ نمبر''، ص: 285

(136) مولانا عارف جمیل نے یہ واقعہ ایک گفتگو کے دوران ذکر کیا تھا۔

باب سوم

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات

پچھلے باب میں قاضی اطہر مبارکپوری کی حیات کا مفصل جائزہ لیا جاچکا ہے، ساتھ ہی ان کی زندگی کے بعض علمی پہلوؤں پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب میں قدرے تفصیل سے ان کے علمی کاموں کا تذکرہ کیا جائے گا۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا مکمل علمی سرمایہ ان کے قلم سے تحریر شدہ وہ تمام مقالات و مضامین ہیں، جو برصغیر کے متعدد علمی و تحقیقی رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئے، یا پھر اردو و عربی میں تحریر کردہ وہ چند کتابیں ہیں، جو مختلف اداروں سے شائع ہوئیں۔ یہ علمی سرمایہ ان کی زندگی بھر کی کوشش و محنت کا نتیجہ ہے جس کی بنیاد طالب علمی کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی۔

مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیم کے دوران قاضی اطہر مبارکپوری میں مطالعہ کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ دیگر کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ بقیہ وقت اسی میں مصروف رہتے تھے، مزید تقویت اس کام میں انہیں اپنے ماموں مولانا محمد یحیٰ سے ملی، جو مطالعہ کے لئے ان کی کتابوں کا انتخاب کرتے تھے۔ بعد ازاں جب کچھ آگے بڑھے تو مضمون نگاری کا شوق ابھرا، اس کام کے لئے ان کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری ذریعہ بنے جو اس زمانہ میں ڈھاکہ کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے اور ایام تعطیل میں گھر پر رہ کر ذاتی کتابوں سے اقتباسات اخذ کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے کئی دفعہ اس منظر کا بچشم خود مشاہدہ کیا جس سے ان کے دل میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور اس کا عملی نتیجہ اس وقت سامنے آیا جب 1934ء میں ان کا پہلا مضمون بعنوان ''مساوات'' رسالہ ''مومن'' بدایوں میں شائع ہوا، جیسا کہ وہ خود اس حوالہ سے بیان کرتے ہیں:

> ''پھر 1353ھ میں رسالہ ''مومن'' بدایوں میں ایک صفحہ کا مضمون ''مساوات'' کے عنوان سے شائع ہوا، کہنا چاہئے کہ میرا سب سے پہلا مضمون یہی ہے۔''(1)

اسی زمانہ میں چند سال بعد 1938ء میں مدرسہ احیاء العلوم کے سالانہ جلسہ میں ان کی ملاقات مولانا سید محمد میاں سے ہوئی۔ موصوف مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس تھے اور اسی سال اپنی ادارت میں انہوں نے وہاں سے ایک رسالہ بعنوان ''قائد'' جاری کیا تھا، جس کا پہلا شمارہ مارچ واپریل 1938ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ان کی فرمائش پر قاضی صاحب نے رسالہ کے لئے چند مضامین تحریر کر کے روانہ کر دیئے جو جلد ہی شائع ہو گئے، اس کے بعد پابندی کے

ساتھ وہ اس رسالے کے لئے مضامین لکھنے لگےاور جب تک یہ نکلتا رہاان کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری نےتعلیم سے فراغت کے بعدعملی زندگی کی ابتدادرس وتدریس سے کی اور پانچ سال مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی فرائض انجام دیئے، بعدازاں اہل وعیال کی کفالت کی غرض سے پہلے امرتسر اور پھر دو ماہ وہاں قیام کے بعد لاہور کا قصد کیا جہاں اخبار''زمزم'' کے دفتر میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر سرپرستی انہوں نے صحافت کا آغاز کیا۔ یہیں اخبار کے دفتر میں انہوں نے''منتخب التفاسیر'' کے عنوان سے اردو زبان میں قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی ترتیب دی جو بدقسمتی سے تقسیم ملک کے نتیجے میں بگڑے ہوئے حالات کی نذر ہوگئی، نیز ایک کتاب بعنوان''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں''مشہور شاعر احسان دانش کے ایماء پر لکھی جو مدت دراز کے بعد چندسال قبل ناقص حالت میں قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور سے شائع ہوئی۔

1947ء میں ملک کی تقسیم کے بعد لاہور مغربی پاکستان کا حصہ قرار پایااور قاضی اطہر مبارکپوری نے مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے مشورہ پر حال ہی میں جاری ہونے والے ان کے اخبارہفت روزہ''انصار'' کی ادارت قبول کرلی اوران کے علاقہ بہرائچ چلے گئے۔ یہاں ہفت روزہ''انصار'' اگلے سات آٹھ ماہ تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا،لیکن اپنے سیاسی مضامین کے باعث جلد ہی حکومتِ اتر پردیش کی نگاہ میں کھٹکنے لگا،جس کے سبب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کو نتیجۃً اسے بند کرنا پڑا۔اس کے بعد قاضی صاحب کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل(گجرات)میں پڑھانے کا موقع ملا،وہاں انہوں نے ایک سال مفوضہ خدمات انجام دیں،بعدازاں 1949ء کے آخر میں معاش ومعیشت کے حصول کی غرض سے ممبئی چلے گئے۔

ممبئی میں جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ابتدا میں قاضی اطہر مبارکپوری کا مسکن بنا، جہاں شروع میں وہ چند ماہ خالی رہے،لیکن جون 1950ء میں جب جمعیۃ علماء کے زیرانتظام''جمہوریت'' کے نام سے ایک روزنامہ کا اجراعمل میں آیا تو اس میں نائب مدیر ہوئے ،لیکن چھ ماہ بعد مدیراخبار مولانا حامدالانصاری غازی سے اختلاف کے سبب بادل ناخواستہ اس سے علیحدہ ہوکر روزنامہ''انقلاب'' سے منسلک ہو گئے اور آئندہ چالیس سال(1951ءتا1990ء) تک اس سے وابستہ رہے۔

ممبئی کے اسی زمانہ قیام میں چارسال کی مدت گزرجانے کے بعد صابوصدیق مسافرخانہ کی کمیٹی انجمن خدام النبیؐ نے 1954ء میں''البلاغ'' کے عنوان سے ہفت روزہ اور ماہنامہ نکالنے کا پروگرام بنایا،جس کی ادارت میں انہوں نے مولانا حامدالانصاری غازی اور مولوی عبدالرشید ندوی کے ہمراہ معاون مدیر کے طور پر قاضی اطہر مبارکپوری کو بھی شامل کیا۔ہفت روزہ''البلاغ'' چندشمارے نکلنے کے بعد بند ہوگیا،مگر ماہنامہ''البلاغ'' آئندہ چھبیس سال تک

تسلسل کے ساتھ نکلتا رہا۔ ابتدا میں مولانا حامد الانصاری غازی اس کے مدیر تھے، لیکن دو برس بعد ان کی سبکدوشی پر ادارت کی ذمہ داری قاضی صاحب کے حصے میں آئی اور چوبیس سال تک یہ رسالہ انہی کی ادارت میں نکلتا رہا۔

ممبئی میں تقریباً تیس برس مسافرت کی زندگی بسر کرنے کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے 1980ء میں اس شہر کو خیر باد کہا اور ہمیشہ کے لئے اپنے وطن مبارک پور واپس لوٹ آئے اور یہیں زندگی کے باقی سولہ سال اپنی سابقہ روش کے مطابق علوم اسلامی کے مختلف موضوعات پر تحقیق وجستجو میں صرف کیے اور جولائی 1996ء کی 14 تاریخ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ممبئی میں دورانِ قیام روزنامہ ''انقلاب'' اور ماہنامہ ''البلاغ'' کے علاوہ ملک کے الگ الگ حصوں سے شائع ہونے والے دوسرے دینی وعلمی رسالوں مثلاً مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''برہان'' دہلی اور ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ سے بھی قاضی صاحب کا تعلق رہا، کیونکہ ان مجلّات میں بھی ان کے تاریخی وتحقیقی مقالات شائع ہوتے تھے، تحقیقی اس لئے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کے قدیم ترین اور بنیادی مآخذ کی روشنی میں دلائل وبراہین کے ساتھ معلومات فراہم کرتے، نیز ایک ہی عبارت سے مختلف پہلوؤں کی تخریج کرتے اور اگر کسی موضوع پر مؤرخین کے مابین اختلاف ہوتا تو مختلف فیہ عبارتوں کو بیان کر کے ان کا موازنہ کرتے اور جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا اس کو اختیار کرتے، لیکن اگر بات پھر بھی واضح نہ ہوتی تو تمام اقوال کو ایک جگہ جمع کر دیتے، چنانچہ اکثر وبیشتر مقالات ومضامین میں انہوں نے یہی صورت اختیار کی ہے۔ اس قسم کے ان کے درجنوں مقالات ان رسالوں کے صفحات کی زینت بنے۔ عنوان کے لحاظ اکثر مقالات میں ندرت کا پہلو غالب ہوتا تھا جن پر بعض دفعہ معاصرین اپنی تمہیدی وتوصیفی آراء وتاثرات کا اظہار کرتے تھے اور کہیں کوئی کمی بیشی نظر آتی تو اس پر تنقیدی تبصرہ بھی کرتے، اس حوالہ سے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو ان کی تحریروں کا سب سے بڑا نقاد کہا جا سکتا ہے، کیونکہ قاضی صاحب کے مقالات ان کی نظر سے بھی گزرتے تھے، علمی نقطۂ نظر سے کسی مقالہ میں اگر کوئی خدفروگزاشت نظر آتی تو موصوف اس کے جواب میں تنقیدی زاویہ سے مضمون لکھتے اور پھر اسی رسالہ میں چھپنے کے لئے بھیج دیتے تاکہ دیگر قارئین بھی اس کو پڑھ کر اپنی سابقہ معلومات میں تصحیح واضافہ کر لیں۔ اس قسم کی کئی مثالیں مولانا اعظمی کے مقالات کے مجموعے ''مقالات ابوالمآثر'' میں موجود ہیں۔ جہاں تک قاضی صاحب کا تعلق ہے تو وہ خود بھی دوسروں کی جانب سے کئے گئے نقد وجرح کو خندہ پیشانی اور خوشی کے ساتھ نہ صرف قبول کرتے بلکہ ناقدین کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

مقالات ومضامین کے علاوہ کتابوں کی تصنیف وتالیف بھی قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کا ایک اہم مشغلہ

رہاہے،جس کی بنیاد تعلیمی دور میں ہی پڑ چکی تھی۔اس زمانہ میں انہوں نے بالترتیب حسب ذیل پانچ کتابیں لکھیں:

(1)**خیر الزاد فی شرح بانت سعاد**(2)**مرآت العلم**(3)ائمہ اربعہ(4)الصالحات(5)اصحاب صفہ۔

ان میں اول الذکر دو کتابیں عربی میں جبکہ بقیہ تین اردو میں لکھی تھیں،آخر الذکر''اصحاب صفہ'' سوا دوسو اشعار کی ایک منظوم کتاب تھی۔ان پانچوں کتابوں میں مؤخر الذکر تین کتابیں شائع ہوئے بغیر مفقود ہوگئیں،البتہ اول الذکر دو کتابیں مسوّدہ کی شکل میں ابھی بھی ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد قاضی صاحب نے جب عملی میدان میں قدم رکھا تو چند برس کے وقفہ کے ساتھ تصنیف وتالیف کا یہ سلسلہ وہاں بھی جاری رہا اور تقسیم ملک سے قبل لاہور کے ڈیڑھ سالہ زمانۂ قیام میں انہوں نے دو کتابیں تحریر کیں،ایک''منتخب التفاسیر'' زمزم کمپنی کی جانب سے ماہانہ طے شدہ اجرت پر اور دوسری''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں''،مشہور شاعر احسان دانش کی فرمائش پر۔مگر بد قسمتی سے یہ دونوں بھی اشاعت سے قبل ملک میں پھیلی بدامنی کی نذر ہوگئیں۔

1950ء میں جب وہ ممبئی پہنچے تو وہاں ماحول اور حالات دونوں ان کے لئے سازگار ثابت ہوئے، چنانچہ یہاں آنے کے پندرہ دن بعد ہی ان کی پہلی کتاب بعنوان''اسلامی نظام زندگی'' چھپ کر منظرِ عام پر آئی، اس کے بعد تصنیف وتالیف کا ایسا سلسلہ قائم ہوا کہ یہاں قیام کے دوران اگلے تیس سالوں میں ملک وبیرون ملک کے مختلف اشاعتی اداروں سے ان کی بیس کتابیں شائع ہوئیں،انھیں میں عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر ان کی مشہور زمانہ آٹھ کتابیں بھی شامل ہیں۔(2)اسی طرح 1980ء میں ممبئی سے اپنے وطن مبارک پور لوٹنے کے بعد زندگی کے آخری ایام تک وہ علمی کاموں میں منہمک رہے اور اس عرصہ میں ان کے قلم سے آٹھ کتابیں منصۂ شہود پر آئیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کی بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔اس اعتبار سے ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد پینتالیس ہے،جن میں سے اکثر تاریخی نوعیت کی ہیں،البتہ عناوین ان کے مختلف ہیں۔ان میں نو کتابیں (6اردو اور 3 عربی میں)صرف عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر مبنی ہیں جن میں عہدِ رسالتؐ سے لے کر ابتدائی عباسی خلفاء کے زمانہ تک ہندوستان کی سیاسی،دینی،علمی اور ثقافتی تاریخ بیان کی گئی ہے،اس موضوع پر ان کی یہ کتابیں بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے کئی کتابیں لکھیں،چنانچہ ایک کتاب''خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم وتربیت'' ہے،جس میں

زمانۂ رسالت، عہدِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اسلامی ریاست کے بڑے شہروں میں رائج تعلیمی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ ایک دوسری کتاب ''تدوین سیر ومغازی'' میں مختلف مراحل طے کرنے کے بعد فن سیر ومغازی کی تدوین کس طرح عمل میں آئی؟ اس پر معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ایک کتاب ''خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات'' ہے، جس میں انہوں نے قرون اولیٰ کی بعض ایسی مسلم خواتین کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ علومِ دینیہ کی نشر واشاعت میں عظیم خدمات انجام دی تھیں، اسی طرح ''ائمہ اربعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب میں انہوں نے فقہ اسلامی کی تاریخ اور اہل سنت والجماعت کے ائمہ متبوعین کے حالات زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں دو ایسی بھی کتابیں ہیں، جن میں انہوں نے اپنے علاقہ کی تاریخ اور وہاں بسنے والے علماء کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں پہلی کتاب ''تذکرہ علماء مبارک پور'' ہے، اس میں انہوں نے مبارک پور کی چار سو سالہ تاریخ اور انیسویں وبیسویں صدی کے علماء، قراء اور حفاظ کا تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' میں انہوں نے شرقی سلطنت کے حوالہ سے عہد وسطیٰ کے مشرقی اتر پردیش کی علمی تاریخ بیان کی ہے۔ ایک کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' کے عنوان سے محمود احمد عباسی امروہوی کی مشہور کتاب ''خلافتِ معاویہ ویزید'' کی تردید میں ہے۔ ان کے علاوہ ''الصالحات، اسلامی نظام زندگی، مسلمان، صفاتِ نفس، مکتوباتِ امام احمد ابن حنبل، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء، طبقات الحجاج، تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں، قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے، معارف القرآن، ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت، مآثر ومعارف، آثار واخبار، اسلامی شادی، حج کے بعد، مئے طہور، دیوان احمد اور کاروان حیات'' وغیرہ کتابیں اور کتابچے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

ان کتابوں کے تعلق سے قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر مصنف کے ان مقالات و مضامین پر مشتمل ہیں جو روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی، ماہنامہ ''البلاغ''، ممبئی، مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ اور ماہنامہ ''دار العلوم'' دیوبند وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ دراصل اس وقت کے بعض صاحبِ تصانیف قلم کاروں کا یہی شیوہ تھا کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے، اس سے متعلق مضامین تیار کر کے کسی رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دیتے، جہاں مدیر رسالہ ان مضامین کو قسط وار مختلف شماروں میں شائع کرتا، پھر تمام مضامین کی اشاعت کے بعد مضمون نگار انہیں یکجا کر کے تقدیم وتمہید کے اضافہ کے ساتھ کتابی شکل دیکر کسی ناشر کے حوالہ کر دیتا اور پھر کچھ ہی دنوں میں کتاب طبع ہو کر منظرِ عام آجاتی، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ اپنی تصانیف میں یہی اسلوب اختیار کرتے تھے اور قاضی اطہر مبارکپوری بھی اسی پر

عمل پیرا تھے۔اس اعتبار سے ان کی جملہ تصانیف حسب ذیل اقسام میں منقسم ہیں:

اول:۔ وہ کتابیں جن کے تمام مضامین وابواب کسی رسالے یا مجلّے میں شائع ہوئے بغیر کتابی شکل میں منظر عام پر آئیں،ان میں ان کی مندرجہ ذیل چھ کتابیں شامل ہیں:

(1) **رجال السند والهند** (2) **العقد الثمين** (3) **الهند في عهد العباسيين** (4) خلافت راشدہ اور ہندوستان (5) خلافت امویہ اور ہندوستان،اور (6) خلافت عبّاسیہ اور ہندوستان۔

دوم:۔ وہ کتابیں جن کے تمام مقالات ومضامین پہلے کسی رسالے یا مجلّے میں شائع ہوئے،بعد میں انہیں کتابی شکل دی گئی،اس زمرہ میں شامل کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جن میں سے قابل ذکر کتابیں حسب ذیل ہیں:

(1) دیارِ پورب میں علم اور علماء (2) مآثر ومعارف (3) آثار واخبار (4) علی وحسین (5) اسلامی نظامِ زندگی (6) معارف القرآن اور (7) طبقات الحجاج وغیرہ۔

سوم:۔ وہ کتابیں جن کے بعض مقالات ومضامین کسی رسالے یا مجلّے میں شائع ہوئے اور بعض شائع نہیں ہوئے،ایسی کتابیں حسب ذیل ہیں:

(1) عرب وہند عہدِ رسالت میں (2) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (3) تذکرہ علمائے مبارک پور، اور (4) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ وغیرہ

چہارم:۔ ایک قسم ان کتابوں اور کتابچوں کی بھی ہے جو درحقیقت قاضی اطہر مبارکپوری کی نہیں ہیں بلکہ ان کے مصنفین کوئی اور ہیں،قاضی صاحب نے ان کی کتابوں یا کتابوں کے بعض اجزاء کا صرف ترجمہ کیا ہے یا پھر ان پر حواشی وتعلیقات لکھے ہیں،مثلاً:

(1) مسلمان (2) صفاتِ نفس (3) **جواهر الاصول في علم حديث الرسول** (4) **خير الزاد في شرح بانت سعاد** (5) **ديوان احمد** اور (6) **تاريخ اسماء الثقات** وہ کتابیں ہیں جن کے ترجمے یا حواشی وتعلیقات قاضی صاحب کے قلم سے ہیں جب کہ اصل تحریریں کسی اور کی ہیں۔

بہر حال یہ ان کی جملہ تصانیف ہیں جن میں سے اکثر ان کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔اجمالی تعارف کے بعد اب ان کتابوں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان میں موجود مواد کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو اور ایک مؤرخ ومحقق کی جمع کردہ ان معلومات کا علم ہو جسے اس نے اپنی زندگی کا گرانقدر حصہ سابقہ مآخذ ومراجع کی تلاش وتحقیق اور جستجو میں صرف کر کے معاصرین کے سامنے پیش کیا تھا۔

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر مبنی کتب

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ سے مراد سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت سے قبل کے وہ حالات و واقعات ہیں جو اسلام، مسلمانوں اور مسلم خلفاء کے تعلق سے اس ملک میں پیش آئے۔ اس موضوع سے متعلق عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سلطان محمود غزنوی کے دور میں ہوئی، محمود غزنوی سے تین صدی قبل 711ء میں محمد بن قاسم سندھ میں ضرور آئے تھے مگر جلد ہی واپس چلے گئے۔ حالانکہ حقائق و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلقات عہدِ رسالت ﷺ ہی میں استوار ہو گئے تھے، حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں بعض صحابہؓ ہندوستان کے تین ساحلی علاقوں میں وارد ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایران وافغانستان سے متصل ہندوستانی علاقوں میں مسلمانوں نے اپنی بستیاں قائم کر لی تھیں، اموی وعباسی دورِ خلافت میں اس ملک کا شمال مشرقی خطہ (سندھ) صدیوں تک اسلامی قلمرو میں شامل رہا۔(3) اور اسی زمانہ میں عربوں کی کئی خود مختار حکومتیں ان علاقوں میں قائم ہوئی، جن میں سے بعض کا خاتمہ خود سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا۔(4)

برصغیر کے لوگوں کی اس دور کی تاریخ سے ناواقفیت کی اصل وجہ ضیاء الدین برنی (م 1357ء)، ملا عبد القادر بدایونی (م 1615ء) اور محمد قاسم فرشتہ (م 1620) جیسے عہدِ وسطیٰ کے وہ ہندوستانی مؤرخین ہیں جنھوں نے اس ملک کی اسلامی تاریخ کا آغاز غزنوی عہد یا اس کے بعد کے دور سے کیا اور اپنے زمانہ تک کے واقعات کتابوں میں نقل کر دیئے۔ بعد میں دورِ جدید کے مؤرخین میں مولوی ذکاء اللہ (م 1910ء)، ایشوری پرشاد (م 1973ء)، شاہ معین الدین ندوی (م 1974ء) خلیق احمد نظامی (م 1997ء)، بپن چندرا اور عرفان حبیب وغیرہ نے بھی انہی کی پیروی کی۔ ان کے برعکس عرب مؤرخین، جغرافیہ نویس اور سیاحوں (جن میں ابن خردادبہ، سلیمان التاجر، ابوزید حسن سیرافی، احمد بن یحییٰ بلاذری، یعقوبی، ابن فقیہ ہمدانی، ابن رستہ، بزرگ بن شہریار، ابو الحسن مسعودی، مطہر بن طاہر مقدسی، اصطخری، بشاری مقدسی اور ابن اثیر کے نام قابلِ ذکر ہیں) عالمِ اسلام کی تاریخ جمع کرتے وقت دوسرے علاقوں کی طرح ہندوستان کے حالات و واقعات بھی اپنی کتابوں میں نقل کیے۔ پچھلے پیراگراف میں محمود غزنوی سے قبل کی تاریخ کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ انہی عرب مؤرخین، جغرافیہ نویس اور سیاحوں کی کتابوں میں فراہم کردہ معلومات کا خلاصہ ہے۔

عربوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ آج بھی باقی ہے، لیکن عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی مؤرخین کی فراہم کردہ معلومات میں ''چچ نامہ'' (جسے علی بن حامد کوفی نے ساتویں صدی ہجری میں عربی کے ایک قدیم مخطوطہ سے فارسی میں منتقل کیا تھا) کے علاوہ دوسری کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا، پھر اس میں بھی فقط محمد بن قاسم کے زمانہ کے واقعات ہی موجود ہیں۔

عربی و فارسی کے بالمقابل اردو میں اس موضوع کی طرف بیسویں صدی کے بعض ہندوستانی علمانے اپنی توجہ مرکوز کر کے قدیم عربی مصادر و مراجع کی روشنی میں ہندوستان کی ابتدائی اسلامی تاریخ رقم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحلیم شرر (م 1926ء) نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''تاریخ سندھ'' کے عنوان سے 262 صفحات میں ایک کتاب تحریر کی۔ یہ کتاب 1907ء میں دلگداز پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، مؤلف نے اس میں عہدِ فاروقی سے محمد بن قاسم کے مظلومانہ قتل تک کے واقعات نقل کیے ہیں۔ کتاب کے سرِ ورق پر مرقوم جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف آگے کی تاریخ لکھنے کے متمنی تھے مگر ایسا کر نہ سکے۔ سید سلیمان ندوی اس کتاب کی بابت لکھتے ہیں:

> ''اردو میں سندھ کی کوئی مفصل محققانہ اور مستقل تاریخ موجود نہیں ہے، مولوی عبدالحلیم شرر کی کتاب محض فتوح سندھ کی تاریخ اور وہ بھی صرف فتوح البلدان بلاذری، کامل ابن اثیر اور چچ نامہ کے بیانات کا خلاصہ ہے، مولوی ذکاءاللہ اور دوسرے مؤرخین ہند کی کتابوں میں سندھ کے حالات محض ضمنی ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب اردو میں سندھ کی سب سے پہلی مفصل، مستند اور مستقل تاریخ ہے۔''(5)

مولوی عبدالحلیم شرر کے بعد خود سید سلیمان ندوی نے اس میدان کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور 1929ء میں اپنی چند تحریریں خطبات کی شکل میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں پیش کیں، جنھیں بعد میں دارالمصنفین نے کتابی شکل دیکر ''عرب و ہند کے تعلقات'' کے عنوان سے شائع کیا۔ کتاب کا موضوع عرب و ہند کے باہمی تعلقات ہے جس کی ابتدا مصنف نے دونوں ملکوں کے مابین ہونے والی قدیم ترین تجارت سے کی ہے۔ اس میں خورد ونوش اور ضروریات زندگی سے متعلق ان تمام اشیاء کی تفصیلات بھی ہیں جن کی برآمد اور درآمد عہدِ رسالتؐ یا اس سے قبل و بعد میں ہندوستان سے عرب اور عرب سے ہندوستان میں ہوا کرتی تھی، نیز ان ساحلی راستوں اور بندرگاہوں کا جغرافیائی نقشہ بھی کھینچا ہے، جہاں سے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ تجارتی جہازوں پر لاد کر منتقل کیا جاتا تھا۔ بہر حال برصغیر کے علمی حلقوں میں کتاب بے حد مقبول ہوئی۔

سید صاحب کے بعد اس موضوع پر تیسری اہم کتاب سید ابوظفر دسنوی کی ''تاریخ سندھ'' ہے، جو 1947ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔ مولوی عبدالحلیم شرر کی ''تاریخ سندھ'' کے مقابلہ اس میں تفصیلات بہت زیادہ ہیں۔ فاضل مؤلف نے سندھ کا جغرافیہ اور مسلمانوں کے حملوں سے پیشتر کے حالات نقل کرنے کے بعد خلافتِ راشدہ سے لیکر عباسی عہد تک اس علاقہ کی سیاسی تاریخ بیان کی ہے، اس میں عربوں کی ان خودمختار حکومتوں کا بھی تذکرہ ہے جن کے ماتحت اس دور میں یہ علاقہ رہا، مزید برآں مسلمانوں کے علمی اور تمدنی حالات و کارناموں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

سید ابوظفر دسنوی کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور تیس سال تلاش و تحقیق کے بعد الگ الگ عنوان سے اس پر نو کتابیں تیار کیں، اس سلسلہ کی ان کی پہلی کتاب ''**رجال السند والهند**'' 1958ء میں منظر عام پر آئی، بعد ازاں دوسری کتابیں سال دو سال کے وقفہ سے شائع ہوتی رہیں، آخری کتاب ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' 1982ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔ ان کتابوں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سابقہ تینوں کتابوں کے زیر بحث مضامین میں مصنف نے نہ صرف قابلِ قدر اضافہ کیا، بلکہ طبقات و تراجم کے باب میں اس زمانہ کے سیکڑوں ہندوستانی علماء و محدثین اور عام انسانوں کے احوال و کوائف دریافت کیے، نیز ان عرب فاتحین وزائرین کے تراجم (حالات زندگی) بھی ان کتابوں میں جمع کردیے جو اس زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنی ان کتابوں میں پہلی صدی سے چوتھی صدی تک کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، ثقافتی، علمی اور تمدنی تاریخ بیان کرکے دنیا سے ''مؤرخ اسلام'' کا خطاب پایا، جیسا کہ مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے اس حوالہ سے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''قاضی صاحب کی تمام حیثیتوں میں سب سے نمایاں حیثیت اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کے مورخ کی ہے''۔(6)

قاضی اطہر مبارکپوری کے بعد محمد اسحٰق بھٹی (م2015ء) اور سید عابد علی وجدی وغیرہ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور خوب لکھا، مگر وہ قاضی صاحب کی فراہم کردہ معلومات میں اضافہ نہ کرسکے، کیونکہ موصوف نے سابقہ تمام کتابوں کا نچوڑ اپنی ان کتابوں میں پیش کردیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ جملہ تصانیف آج بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تمام کتابوں کا تفصیلی تعارف حسب ذیل ہے۔

1۔عرب و ہند عہدِ رسالت میں

موضوع کے لحاظ سے عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ پہلی کتاب ہے جو

ندوۃ المصنفین دہلی سے 1965ء میں شائع ہوئی۔ دوسو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں آٹھ مقالات ہیں، جن میں عہد نبویؐ میں عرب و ہند کے باہمی معاشی وثقافتی روابط سے بحث کی گئی ہے۔ اشاعت سے قبل اس کے بعض اجزاء مجلّہ ''معارف''، اعظم گڑھ اور ماہنامہ ''البلاغ''، ممبئی میں شائع ہو چکے تھے، مصنف نے انہی مقالات ومضامین میں نظرِ ثانی اور کچھ حذف واضافہ کے بعد یہ کتاب مرتب کی۔ پچھلے پچپن سال میں یہ کتاب برصغیر کے مختلف اداروں اور مکاتب سے کئی مرتبہ شائع ہوچکی ہے، نیز عربی میں ''**العرب والهند فی عهد الرساله**'' اور سندھی میں ''عرب ءِ ھند نبیﷺ جن جي زماني م'' کے عنوان سے اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ پیش نظر مطبوعہ نسخہ فرید بک ڈپو نئی دہلی نے 2004ء میں شائع کیا تھا۔

اس کتاب کے پہلے مقالہ کا عنوان ''نارجیل سے نخیل تک'' ہے، جس کی ابتدا میں مصنف نے سندھ اور ہند کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کے بعد عرب وہند کے جغرافیہ پر روشنی ڈالی ہے، اور ابن خرداذبہ و یاقوت حموی کی تحریروں کے حوالہ سے ان بحری وبرّی راستوں کی نشاندہی کی ہے جن سے گزر کر تجارتی قافلے اس زمانہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر طے کرتے تھے، نیز راستہ میں پڑنے والی بندرگاہوں اور شہروں کے درمیان کی مسافت وفاصلہ کی وضاحت کی ہے۔

دوسرا مقالہ ''عرب وہند کے قدیم تجارتی تعلقات'' کئی ذیلی عناوین میں منقسم ہے۔ اس میں پہلے ان تجارتی اشیاء کی فہرست دی گئی ہے جو عرب تاجر ہندوستان اور اطراف وجوانب کے علاقوں سے خرید کر اپنے ملک لے جاتے تھے، بعد ازاں ابلہ، صحار، عدن اور جار نامی عرب کی چار ساحلی منڈیوں کا ذکر ہے جہاں ہندوستان اور اس کے نواحی علاقوں کا سامان ہی خریدا اور بیچا جاتا تھا، اس کے علاوہ دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا اور عکاظ وغیرہ اندرون عرب کے عمومی بازاروں کا بھی اس میں ذکر ہے۔ اسی مقالہ میں مصنف نے ایک جگہ پر ہندوستانی نیزہ اور مشک سے منسوب دو علاقوں یعنی خط اور دارین کا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ باب کے آخر میں تلواریں، نیزے، کافور، قرنفل، فلفل، عود، ساگوان، زنجبیل اور قسط وغیرہ چند خالص ہندوستانی اشیاء پر الگ الگ عنوان سے اس لحاظ سے بحث کی گئی ہے کہ ان میں سے بعض کا ذکر عربی ادبیات میں یعنی ہندوستانی تلواریں، نیزے، فلفل وغیرہ، بعض کا احادیث میں مثلاً: قسط اور عود، جب کہ تین چیزوں یعنی مشک، کافور اور زنجبیل کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

ہندوستانی سامان کی طرح یہاں کے باشندوں کی بھی اس زمانہ میں عرب میں آمد ورفت رہا کرتی تھی، وہاں ساحلِ سمندر پر ان کی بستیاں آباد تھیں اور اہل عرب انہیں ''سندی'' یا ''ہندی'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ تیسرا مقالہ ''عرب میں آباد ہندوستانی قومیں'' انہی سندی اور ہندیوں سے متعلق ہے، قاضی صاحب نے اس میں

زط (یعنی جاٹ)، مید، سیابجہ، اساورہ، احامرہ، بیاسرہ اور تکا کرہ نامی سات ہندوستانی قوموں کا تفصیل سے تعارف کرایا ہے، ان میں مؤخر الذکر بیاسرہ اور تکا کرہ کا تعلق اموی دور سے ہے جب کہ اوّل الذکر پانچ میں سے تین اقوام (زط، سیابجہ اور اساوہ) بعثتِ نبویؐ کے وقت عرب میں پائی جاتی تھیں۔ مقالہ میں ان میں سے ہر ایک پر نسلی اور لسانی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، اور ہندوستان کے کس علاقہ میں وہ پائے جاتے تھے اس کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اسی مقالہ میں ایک مقام پر قاضی صاحب نے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (م 150ھ) کو تاریخ ابن خلکان کے حوالہ سے قومِ زط میں شمار کیا ہے، چنانچہ صفحہ 64 پر وہ لکھتے ہیں:

''کابل میں بھی جاٹوں کی آبادی تھی، انہی میں بعد میں امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی (زطی) بن ماہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، غالباً زوطی کا اسلامی نام نعمان تھا اور ماہ شاہ ایران کے مرزبان یعنی نائب حاکم تھے، اس لئے بعض روایات میں زوطی بن ماہ کے بجائے نعمان بن مرزبان آیا ہے۔'' (7)

اس کی مزید تصحیح و تصریح وہ اپنی ایک دوسری کتاب ''ائمہ اربعہ'' میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''آپ کا اسم و نسب یہ ہے امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان تیمی، کوفی رحمۃ اللہ علیہ، بعض علماء نے دادا کا نام زوطی بن ماہ بتایا ہے، وجہ یہ ہے کہ قبل اسلام نعمان کا نام زوطی بروزن موسیٰ یا بروزن سلمہ تھا اور مرزبان کا نام ماہ تھا جو فارس کے کسی علاقہ کے حاکم تھے، فارسی میں مرزبان حاکم و امیر کو کہتے ہیں، یہ بات بے اصل ہے کہ زوطی زطؔ کا معرب ہے جس کے معنیٰ ہندوستانی جاٹ یا سندھی جیٹ کے ہیں، نعمان بن مرزبان کابل کے اعیان و اشراف میں بڑی فہم و فراست کے مالک تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلام قبول کرنے کے بعد کوفہ چلے آئے اور یہیں آباد ہو گئے، اس خاندان کو حضرت علیؓ سے خصوصی تعلق تھا۔''

اسی میں آگے لکھتے ہیں:

''امام صاحب کے پوتے اسماعیل کا بیان ہے کہ میرا نام اسمٰعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہے، ہم لوگ ابنائے فارس یعنی فارسی النسل ہیں، واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کا غلام نہیں تھا۔ میرے دادا ابوحنیفہ 80ھ میں پیدا ہوئے، پردادا ثابت بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں گئے، آپ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں خیر و برکت کی دعا فرمائی، ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کی دعا قبول فرمائی ہے، نعمان بن مرزبان نے نوروز کے جشن پر حضرت علی کو فالودہ پیش کیا تو آپ نے کہا ہمارا ہر دن نوروز ہے، ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ جشنِ مہرجان کا ہے۔'' (8)

چوتھا مقالہ ''عرب میں ہندوستانیوں کی بستیاں'' تیسرے مقالہ ہی کا تکملہ ہے۔ اس میں یمن، عراق، بحرین

،عمان اور یمامہ وغیرہ جزیرۂ عرب کے ان مشرقی وجنوبی ساحلی علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں ہندوستانی زط، سیابجہ اوراساورہ رہا کرتے تھے،ساتھ ہی ان سے متعلق عہدِ نبویؐ اوراس کے بعد کے تین واقعات نقل کیے ہیں۔

پانچویں مقالہ ''عرب میں آباد ہندوستانیوں کودعوتِ اسلام'' کا موضوع محمدﷺ کی حیاتِ طیبہ کا وہ حصہ ہے جبکہ زندگی کے آخری ایام میں آپؐ نے عرب میں آباد تمام قبائل کودعوتِ اسلام کا پیغام دیا،جس کے جواب میں ان کی ایک بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔مقالہ کی رو سے اسلام قبول کرنے والے غیر عرب باشندوں میں یمن کے ہندوستانی بھی تھے،مگر نام کے ساتھ کسی کی تصریح نہیں ہوسکی ،اس سلسلہ میں قاضی صاحب نے حاکم یمن حضرت باذانؓ اور بیزرطن ہندی نامی ایک طبیب کا تذکرہ بھی کیا ہے،لیکن ساتھ میں یہ بھی واضح کردیا کہ اوّل الذکر کا ہندی الاصل ہونا ثابت نہیں ہے اورثانی الذکر کے ہندوستانی ہونے کے باجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ انہوں نے عہدِ نبویؐ میں اسلام قبول کیا تھا یانہیں،اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی موافق تصدیق ہوجاتی تو ہندوستان بھی عجم کے ان ممالک میں شمار کیا جاتا جہاں کے باشندے صحابیت کے بلند مقام ومرتبہ پر فائز ہوئے اورآج وہاں کے مسلمان ان پررشک کرتے ہیں۔ان کے علاوہ عرب میں آباد وہ غیر مسلم،جواپنے سابقہ مذہب پر ہی قائم رہے،مقالہ کی رو سے انہیں عرب کی نئی اسلامی حکومت نے مشرک ہونے کے باعث مجوس اور صائبہ میں شمار کرتے ہوئے ان کی عورتوں سے نکاح ناجائزاوران کا ذبیحہ حرام قرار دیا۔

اگلا مقالہ ''پیغمبر اسلامؐ اور ہندوستان کے باشندے'' ان احادیث پرمبنی ہے جن میں براہ راست ہندوستان کا ذکرآیا ہے، چنانچہ ابتدا میں حضرت آدمؑ کے سرزمین ہند میں اتارے جانے والی احادیث مذکور ہیں، بعد ازاں حضرت ثوبانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ان مشہوراحادیث کونقل کیا گیا ہے جن میں آپؐ نے ہندوستان میں جہاد کرنے کی فضیلت و بشارت دی تھی ۔(9) مزید برآں صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی دوایسی حدیثیں بھی مقالہ نگار نے اس میں ذکر کی ہیں جن میں آپؐ نے ایک موقع پرحضرت موسیٰؑ اور جنات کو جاٹوں سے تشبیہ دی تھی ۔اسی میں اس ہندوستانی راجہ کا واقعہ بھی ہے جس نے ہدیۃً آپؐ کی خدمت میں سوٹھ بھیجی تھی اور آخر میں سرباتک ہندی اوررتن ہندی نامی دوایسے ہندوستانیوں کا تذکرہ ہے جوصحابیت کے جھوٹے دعویدار تھے۔

ساتویں مقالہ کا عنوان ''عہدِ رسالت میں ہندوستانی اشیاء کا استعمال'' ہے۔اس میں وہ ہندوستانی اشیاء زیرِ بحث ہیں جن کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے یا جو چیزیں محمدؐ نے خوداستعمال کی تھیں۔کافور،مشک اورزنجبیل کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے کہ ان تینوں خالص ہندوستانی پیداوار کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے،ان کے علاوہ ہندوستان

کی بعض اشیاء ایسی بھی تھیں جنہیں آپؐ استعمال کرتے تھے، چنانچہ لونگ، مشک، عود، زنجبیل وغیرہ کو آپؐ نے استعمال کیا، مدینہ میں آپؐ کی مستعمل اشیاء میں ساگوان کا ایک تخت بھی تھا، جس کے پیڑ محض ہندوستان میں پائے جاتے تھے، علاوہ ازیں مقالہ میں مصنف نے ''کرتہ'' کی بابت لکھا ہے کہ یہ ایک ہندی الاصل لباس ہے اور کسی موقع پر آپؐ نے اسے زیب تن کیا تھا۔ اسی طرح احادیث میں ہندی نیزوں، تلواروں اور سندھی مرغیوں وغیرہ کا ذکر آیا ہے خرد ونوش اور ضرورت کی ان چند چیزوں کے بعد مقالہ کے آخر میں شطرنج اور چوسر (جسے عرف عام میں لوڈو کہا جاتا ہے) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں کھیل ہندوستانی معاشرے کی پیداوار ہیں جن کی احادیث میں ممانعت کی گئی ہے۔

کتاب کا آخری مقالہ ''اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد'' ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں قاضی اطہر مبارکپوری نے ان صحابۂ کرام کا تذکرہ کیا ہے جو زمانۂ رسالت یا اس سے قریب ترین دور میں ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، اس حوالہ سے انہوں نے پہلے عہدِ نبویؐ میں تین یا پانچ صحابہؓ کے اس ملک میں آنے کی موضوع روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد عہد فاروقی میں تھانہ، بھڑوچ اور دیبل کے ساحلی علاقوں پر حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ اور ان کے دو بھائیوں کے حملہ کے واقعات درج کیے ہیں۔

2۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں

سابقہ کتاب کی اشاعت کے دو سال بعد قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب 1967ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت 340 صفحات ہے اور موضوع ہندوستان کی وہ پانچ خود مختار عرب حکومتیں ہیں جو خلافت عباسیہ کے دور زوال میں شمال مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم ہوئی تھیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں اس موضوع پر یہ پہلی مفصل کتاب ہے جسے اس کے مصنف نے پچاس کے قریب کتابوں سے معلومات حاصل کر کے اصول تحقیق کے ضوابط کے تحت مدون کیا ہے اور اسی وجہ سے اس کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری نے عربی میں ''**الحکومات العربیہ فی الھند**'' کے عنوان سے اس کا ترجمہ شائع کرایا۔

کتاب چھ جلی عنوانات میں منقسم ہے اور ہر عنوان کسی نہ کسی حکومت سے منسوب ہے۔ پہلا عنوان ''دولتِ ماہانیہ سنجان'' ہے۔ یہ حکومت 198ھ کے قریب ممبئی سے متصل علاقہ سنجان (سندان) میں قائم ہوئی اور 227ھ کے حدود تک باقی رہی، عرب کے ایک قبیلہ بنو سامہ کا آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان اس حکومت کا بانی تھا، جس نے علاقۂ سنجان (موجودہ ممبئی اور تھانہ) کو پایہ تخت بنا کر وہاں ایک جامع مسجد تعمیر کی اور عباسی خلیفہ مامون کا نام خطبۂ جمعہ میں شامل کیا۔ فضل کے بعد اس کا بیٹا محمد بن فضل بن ماہان اس حکومت کا وارث ہوا، یہ اس خاندان کا بڑا ہی

طاقتور حکمراں تھا کیونکہ اس نے تھانہ کی بندرگاہ پالی تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا تھا، لیکن بعد میں اس کے بھائی ماہان بن فضل بن ماہان نے پایہ تخت پر قبضہ کر کے اسے بے دخل کر دیا، اس کے زمانہ میں ملک میں ابتری پھیلنے کے سبب اس کی ہندو رعایا نے اسے سولی پر لٹکا دیا اور شہر کی جامع مسجد مسلمانوں کے حوالہ کر دی۔

دوسری حکومت ''دولتِ ہبّاریہ منصورہ'' ہے۔ صحابیٔ رسولؐ حضرت ہبّار بن اسود اسدی قرشیؓ کی اولاد میں سے ایک شخص منذر بن زبیر ہبّاری اموی دور میں عراق سے سندھ میں آ کر آباد ہوا، اسی منذر کے پوتے عمر بن عبد العزیز ہبّاری نے 247ھ کے حدود میں سندھ کے شہر منصورہ پر غلبہ پا کر اپنی خود مختار حکومت قائم کی، اس کے جانشینوں میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز، موسیٰ بن عمر بن عبدالعزیز، ابوالمنذر عمر بن عبداللہ اور یحییٰ بن محمد کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہ حکومت تقریباً 170 سال قائم رہی اور پھر 416ھ یا 417ھ میں محمود غزنوی نے اس کا خاتمہ کر دیا، کچھ وقت تک شہر ملتان بھی اس حکومت کے زیر تصرف رہا۔

اس فہرست میں تیسری خود مختار عرب حکومت ''دولت سامیہ ملتان'' ہے۔ یہ حکومت 280ھ کے حدود میں ملتان میں قائم ہوئی اور 360ھ تا 370ھ کے قریب زوال پزیر ہوگئی۔ تلاش و تحقیق کے باوجود مصنف کو کتابوں میں اس کے کسی حکمراں کا نام نہیں ملا، اس لئے مؤرخین و سیاحوں کے حوالہ سے اس کے ضمن میں انہوں نے فقط قبیلہ بنو سامہ کے تذکرہ پر اکتفاء کیا ہے۔ اس کے زوال کے بعد ملتان باطنی اسماعیلیوں کے قبضہ میں چلا گیا، 396ھ میں سلطان محمود غزنوی نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر کے اس علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

چوتھی حکومت ''دولتِ معدانیہ'' ہے۔ یہ حکومت علاقۂ مکران (موجودہ افغانستان کا حصہ) میں 340ھ کے حدود میں قائم ہوئی اور شہر ''تیز'' اس کا پایہ تخت تھا۔ مصنف کے مطابق اس خود مختار حکومت کا بانی عیسیٰ بن معدان تھا جسے اس کی رعایا ''مہراج'' کے لقب سے پکارتی تھی۔ اس کے جانشینوں میں معدان بن عیسیٰ بن میدان، عیسیٰ بن معدان بن عیسیٰ بن معدان اور ابوالعساکر حسین بن معدان تین حکمرانوں کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہ لوگ خوارج تھے، سلطان غیاث الدین غوری کے ہاتھوں 471ھ میں ان کا خاتمہ ہوا تھا۔

اس کتاب میں مذکور پانچویں حکومت طوران کی ''دولتِ متغلبہ'' ہے۔ دولت معدانیہ کی طرح یہ بھی 340ھ کے قریب قائم ہوئی اور سلطان غیاث الدین غوری کے ہاتھوں 471ھ میں زوال پذیر ہوئی۔ مغیرہ بن احمد نامی ایک عرب سردار کو اس حکومت کا بانی بتایا گیا ہے، اس نے طوران پر قبضہ کر کے شہر کیز کو اپنا پایہ تخت بنایا، بعد میں اس کے جانشینوں نے یہ حیثیت شہر قزدار (قصدار) کو دے دی۔ ابوالقاسم بصری کے علاوہ مغیرہ کے جانشینوں میں سے کسی حاکم

کا نام اس کتاب میں مذکور نہیں، البتہ مؤرخین کے حوالہ سے ایک عادل ومتواضع صفت بادشاہ کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے متعدد کتابوں سے تھوڑی تھوڑی معلومات جمع کر کے اسی کی بنیاد پر اس کتاب میں متذکرہ بالا حکومتوں کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا ہے، لیکن ہر حکومت کے ضمن میں اس کے نظم وضبط اور ثقافتی وعلمی پہلوؤں پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے، ساتھ ہی ان کی قلمرو میں شامل تمام بڑے شہروں کے طبعی، علمی اور تمدنی حالات وواقعات بیان کیے ہیں۔

آخری جلی عنوان ''عمومی تبصرہ وتجزیہ'' کے ضمن میں مصنف نے معاصر خودمختار ہمسایہ حکومتوں اور حکمرانوں پر تبصرہ کرنے کے بعد اس زمانہ کی علمی وتجارتی سرگرمیوں سے بحث کی ہے۔

3۔اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر اردو زبان میں قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ تیسری کتاب ہے، جو 243 صفحات میں ندوۃ المصنفین دہلی سے 1969ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب مصنف کے آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں سے پانچ مقالات ماہنامہ ''معارف'' میں اور ایک مقالہ ماہنامہ ''البلاغ'' میں کتاب کی طباعت سے قبل ہی شائع ہو چکے تھے۔ ہر مقالہ میں اسلامی ہند کی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کر کے اس ملک کی عظمتِ رفتہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، ساتھ ہی بعض مباحث پر تحقیقی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے پہلے مقالہ ''اسلامی ہند پر متقدمین ومتاخرین کی تصنیفات'' میں تاریخ وجغرافیہ اور طبقات وتراجم کی ان کتابوں کا تذکرہ ہے جن میں ابتدائی عہد کے ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے اشخاص وافراد کے حالات قلم بند کئے گئے تھے، اس سلسلہ میں پہلے ان قدیم ترین کتابوں کی فہرست ہے جو خاص ہندوستان کے موضوع پر لکھی گئی، مثلاً محمد بن عمر واقدی کی کتاب ''اخبار فتوح بلد السند'' اور ابوالحسن علی بن محمد مدائنی کی ''کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند اور کتاب فتح مکران'' وغیرہ۔ اس کے بعد سفرناموں اور تاریخ وجغرافیہ کی ان خاص وعام کتابوں کی فہرست ہے جن میں اس ملک کے سیاسی، اخلاقی، معاشی، علمی اور تمدنی حالات درج ہیں، چنانچہ علامہ مسعودی کی ''مروج الذہب'' اور ''اخبار الزماں''، بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی کی ''عجائب الہند'' اور علامہ مقدسی بشاری کی ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' وغیرہ بیسیوں کتابیں اس زمرے میں شامل ہیں۔ بعد ازاں متاخرین میں سے عرب و ہند کے جن علماء نے اس موضوع کو اپنی کتابوں میں جگہ دی، ان کی فہرست ہے، اسی زمرہ میں چند سطور میں حکیم عبدالحی حسنی کی ''نزہۃ الخواطر'' اور سید سلیمان ندوی کی ''عرب وہند کے تعلقات'' کا ذکر کرنے کے بعد مقالہ نگار نے اپنی دو

کتابوں یعنی ''رجال السند و الهند''اور''العقد الثمین'' کواس سلسلہ کی آخری کڑی قرار دیا ہے۔

دوسرے مقالہ ''فاتحین ہند حضرات عثمان وحکم اور مغیرہ بنو ابی العاص ثقفیؓ'' میں قبیلہ بنو ثقیف کی تاریخ اور اس کے تین فرزندوں یعنی حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی، حکم بن ابوالعاص ثقفی اور مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی کے حالاتِ زندگی زیرِ بحث ہیں۔ یہ تینوں بھائی اصحاب رسولؐ میں سے ہیں، ان میں حضرت عثمانؓ سب سے بڑے تھے، حضرت عمرؓ نے انہیں فارس کا حاکم بنایا تھا، اپنے دورِ امارت میں انہوں نے اپنے دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر ہندوستان کی تین بندرگاہوں یعنی تھانہ، بھڑوچ اور دیبل پر 15 ھ تا 21 ھ کے مابین حملے کیے تھے، حضرت عمر کو جب ان حملوں کی اطلاع ملی تو وہ ان پر کافی برہم ہوئے۔

تیسرا مقالہ ''فاتحِ ہند محمد بن قاسم ثقفیؒ'' اس کتاب کا اہم ترین مقالہ ہے، مصنف نے اس میں محمد بن قاسم ثقفی کی حیات وخدمات کے ہر پہلو کو کتبِ تواریخ کی روشنی میں پرکھا ہے اور ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر ایک الگ نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، خصوصاً ان کی عمر اور حجاج بن یوسف سے رشتہ داری کے تعلق سے اہم حقائق بیان کئے ہیں، مثلاً ایک جگہ محمد بن قاسم ثقفی کی عمر کے حوالہ سے مؤرخین کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''ہمارے مؤرخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر 92 ھ یا 93 ھ میں فتح ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال تسلیم کر لی جائے تو 83 ھ میں جبکہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے چھ سات سال ماننی پڑے گی جو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس عمر میں کسی بچے کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے، گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری بھی نہیں دی جاتی ہے۔''(10)

اور ایک دوسرے مقام پر حجاج بن یوسف سے ان کی رشتہ داری کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''حضرت محمد بن قاسمؒ حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی تو نہیں ہیں، البتہ خاندان اور رشتہ میں چچازاد بھائی ضرور ہوتے ہیں، لیکن یہ جو مشہور ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے داماد بھی ہیں اور حجاج کی بیٹی ان سے بیاہی تھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف چچ نامہ میں اس کا ذکر افسانوی رنگ میں پایا جاتا ہے۔''(11)

اسی طرح اس مقالہ میں راجا داہر کی بیٹی سے شادی اور اس عظیم فاتح کی موت کے تعلق سے کتابوں میں جو مختلف فیہ روایات درج ہیں ان پر نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔

اگلا مقالہ جس کا عنوان ''امیرِ ہند عمرو بن محمد بن قاسم ثقفیؒ'' ہے، فاتحِ ہند محمد بن قاسم ثقفی کے جواں سال بیٹے کی سیاسی زندگی پر محیط ہے۔ مقالہ کی رو سے کتابیں ان کے ابتدائی حالات سے خالی ہیں اور محمد بن قاسم کی وفات کے نو سال بعد 105 ھ سے ان کا نام تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے، اس وقت یہ سندھ میں موجود تھے اور

خلافت کے ملکی وانتظامی امور میں دخل رکھتے تھے۔ 105ھ سے 120ھ تک امیر ہند حکم بن عوانہ کلبی کی معیت و ماتحتی میں انہوں نے فوجی وانتظامی خدمات انجام دیں اور اسی کے حکم سے شہر منصورہ کی بنیاد رکھی۔ حکم بن عوانہ کلبی کی عدم موجودگی میں یہ دو سال فوجی امیر رہے اور 122ھ میں دارالخلافہ کی طرف سے سندھ کے امیر نامزد کئے گئے، مگر ان کا انجام اچھا نہیں ہوا، 126ھ ہجری میں سندھ کے نئے امیر محمد بن غزان کلبی نے ان کو قید کرلیا اور سخت سزا دینی چاہی مگر اس سے قبل ہی انہوں نے محافظ کی تلوار سے اپنے آپ کو زخمی کر کے ہلاک کرلیا۔

پانچویں اور چھٹے مقالہ میں قاضی صاحب نے امام حسن بصریؒ کے دو مایہ ناز شاگردوں یعنی امام ربیع بن صبیح بصری ہندی اور امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان سے ان دونوں بزرگوں کا خاص تعلق تھا، ان میں سے اوّل الذکر ایک فقیہ تھے جو 160ھ میں گجرات میں فوت ہوئے، جبکہ ثانی الذکر محدث تھے اور تجارت کے سلسلہ میں بصرہ سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔

ساتویں مقالہ ''ہند وعرب کے قدیم سیاسی وثقافتی تعلقات'' میں وہ خوشگوار سیاسی وثقافتی تعلقات موضوعِ بحث ہیں جو عرب کے خلفاء اور ہندوستان کے راجاؤں کے درمیان استوار تھے اور جن کی بنا پر بسا اوقات جانبین میں ہدایا وتحائف کا تبادلہ اور باہمی خط وکتابت ہوا کرتی تھی۔ اس حوالہ سے زیرِ نظر مقالہ میں امیر معاویہ کی خدمت میں شاہ چین کا ایک خط، خلیفہ ہشام کی خدمت میں ہندوستان کے ایک راجہ کا طلسمی تحفہ، مامون الرشید کی خدمت میں راجہ رہمی کا خط، بدلہ میں مامون کا خط اور تحائف راجہ کے نام وغیرہ عناوین پر مبنی تحریریں قاضی رشید بن زبیر کی ''**كتاب الذخائر والتحف**'' سے اقتباسات کی شکل میں نقل کی گئی ہیں۔

کتاب کے آخری مقالہ کا عنوان ''راجہ رہمی اور ہندوستان کے دوسرے چند راجے'' ہے۔ اس میں ان غیر مسلم راجاؤں پر تبصرہ کیا گیا ہے جن کی اموی اور عباسی عہد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں حکومتیں قائم تھیں۔ راجہ رہمی کے علاوہ مقالہ میں جن راجاؤں کا تذکرہ ہے ان میں راجہ بلہرا، راجہ مہراج، راجہ جزر، راجہ طافن، راجہ جابہ اور راجہ غابہ شامل ہیں، ان راجاؤں کے یہ اصل نام نہیں ہیں بلکہ القاب ہیں جن سے انہیں ان کے علاقوں میں پکارا جاتا تھا۔ آخر میں مقالہ نگار نے راجہ رہمی کے نام کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیقات پر بعض معروضات بھی پیش کی ہیں۔

اشاعت کے بعد جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو نادر موضوعات اور علمی وتحقیقی مقالات کی بنا پر اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اخبار ومجلّات میں اس پر خوب تبصرے کئے گیے۔

4۔خلافت راشدہ اور ہندوستان

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب 1972ء میں منظرِ عام پر آئی۔ مذکورہ تینوں کتابوں کی طرح اس کی اشاعت بھی ندوۃ المصنفین دہلی سے ہوئی۔ 280 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے ان سماجی، سیاسی، تمدنی اور ثقافتی تعلقات سے بحث کی ہے جو عرب و ہند کے مابین خلافتِ راشدہ میں قائم ہوئے تھے۔ مقدمہ کے علاوہ اس میں آٹھ ابواب ہیں اور ہر باب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اس کے پہلے باب ''چند ضروری باتیں'' میں مصنف نے قدیم وجدید مؤرخین کی تاریخ نویسی کے فرق کو واضح کیا ہے، ساتھ ہی ہندوستان کی خالص اسلامی وعربی تاریخ کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ علاقہ (ہندوستان) عہدِ خلافت ہی میں عراق، ایران اور مصر وشام کی طرح عالمِ اسلام کا حصہ بن چکا تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارے مؤرخین نے اس سے بے اعتنائی برتی اور سلطان محمود غزنوی کے عہد سے اس ملک کی اسلامی تاریخ کا آغاز کیا، حالانکہ عرب مؤرخین وسوانح نگاروں نے عالمِ اسلام کی تاریخ لکھتے وقت اس خطہ کو اس میں شامل کر کے یہاں کے حالات اپنی کتابوں میں جمع کیے، مزید برآں ہندوستان کے اس خطہ کی نشاندہی کی ہے جو خلافتِ راشدہ، بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے زمانہ میں اسلامی قلمرو کا حصہ تھے۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے کتاب کے دوسرے باب ''عہدِ رسالت اور ہندوستان'' میں اپنی سابقہ کتاب ''عرب وہند عہدِ رسالت میں'' کے بعض مضامین جیسے غزوۂ ہند، حضرت آدمؑ کے ہندوستان میں اترنے، عہدِ رسالتؐ میں پانچ صحابہؓ کے سندھ میں آنے کی روایات اور بابا رتن ہندی، بیزرطن ہندی، حضرت باذانؓ اور حضرت تمیم داری وغیرہ کے واقعات کا اعادہ کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

تیسرا باب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کتاب کا اصل باب ہے، اس میں ان ہندوستانی اقوام (جاٹ اور سیابجہ) کے حالات وواقعات سے بحث کی گئی ہے جو عہدِ خلافت میں عرب میں آباد تھیں، اور بتایا گیا ہے کہ فتنۂ ارتداد میں انہوں نے نہ مرتدین کا ساتھ دیا تھا اور نہ مسلمانوں کا، بلکہ یہ لوگ الگ تھلگ رہے اور امن قائم ہونے کے بعد ان کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہوئیں، پھر عہد فاروقی میں ان لوگوں نے اسلامی فوج میں شامل ہو کر غنیم سے جنگ کی۔ مزید برآں ہندوستانی راجاؤں کے حوالہ سے اس باب میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ جنگ نہاوند میں انہوں نے شاہِ ایران کا ساتھ دیا اور شکست کے بعد اپنے اپنے علاقوں کی طرف راہِ فرار اختیار کی، لہٰذا ان کے تعاقب کے نتیجہ میں مسلمانوں نے سندھ ومکران کے دشوار گزار علاقے فتح کیے۔

چوتھے باب ''غزوات وفتوحات'' کے ضمن میں ان جنگوں کی تفصیلات ہے جو عہدِ فاروقیؓ سے عہدِ علوی تک سندھ ومکران کے ہندوستانی علاقوں میں یہاں کے باشندوں سے ہوئیں، اس سلسلہ میں پہلے تھانہ، بھڑوچ اور دیبل کی بندرگاہ پر ہونے والے ان تین حملوں کا ذکر ہے جو خلیفہ کو اطلاع دیے بغیر 15ھ تا 21ھ کے حدود میں ہوئے، بعدازاں ان بارہ جنگوں پر تبصرہ کیا گیا ہے جو 23ھ سے 38ھ کے درمیان خلیفۂ وقت کی اجازت سے مکران، بلوچستان، فہرج، قندابیل، قیقان اور سجستان سے متصل سندھی علاقوں میں لڑی گئیں۔ جنگوں کے علاوہ یہاں پر موجود اسلامی فوج کی تعداد، فتوحات وغنائم کی حیثیت، جہاد کے اسلامی اصول اور دعوتِ توحید ورسالت وغیرہ مضامین بھی اس باب میں زیرِ بحث ہیں۔

اگلے باب ''انتظام وتعلقات'' کے تحت خلفائے راشدین کے زمانہ میں رائج نظامِ حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس کی رو سے ہندوستان کا یہ سرحدی وساحلی علاقہ سوادِ عراق کے ماتحت تھا اور بصرہ کا والی اس علاقہ کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز، حضرت عثمان بن حنیف انصاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ یکے بعد دیگر بصرہ کے والی بنائے گئے اور ان کی ماتحتی میں حضرت حکم بن عمرو ثعلبی، عبیداللہ بن معمر قرشیؓ، عمیر بن سعد کودیؓ، ابن کندیر قشیریؓ اور حارث بن مرہ عبدیؓ سجستان کے امیر تھے اور ہندوستان کا مفتوحہ علاقہ سجستان میں شامل تھا۔

چھٹے باب ''عرب کے مسلمان ہندوستان میں'' کے معنوی طور پر دو حصے ہیں۔ پہلے میں یہاں آنے والی اسلامی فوج کے بود و باش، رہن سہن، تعلیمی وانتظامی سرگرمیوں سے بحث کی گئی ہے، اس کے تحت مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے بعد مفتوحہ زمین کو اپنے قبضہ میں لے کر مکانات اور مساجد تعمیر کیں اور جو فاضل زمین بچ گئی اسے کاشت کاری کے لئے استعمال کیا، ان کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی تھا، جہاں صحابہ وتابعین میں سے علماء وفقہاء درس دیا کرتے تھے۔ دوسرے حصہ میں ان صحابہؓ وتابعینؒ کی علمی وطبعی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو اسلامی فوج میں شامل ہو کر اس ملک میں یا اس کے اطراف میں وارد ہوئے تھے۔

ساتویں باب ''ہندوستان کے مسلمان عرب میں'' میں ان ہندوستانیوں کا ذکر ہے جو اس عہد میں عرب میں پائے جاتے تھے۔ بنیادی طور پر ان کی مندرجہ ذیل تین قسمیں تھیں:

زط وسیابجہ:۔ ہندنژاد یہ دونوں جنگجو قومیں عرب کے ساحلی علاقوں میں عہدِ قدیم سے آباد تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو کر اسلامی فوج میں شامل ہوئے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں چالیس

یا چار سو افراد پر مشتمل ان کی ایک جماعت، جس کے سردار ابو سالمہ زوطی تھے، بصرہ کے بیت المال کی محافظ تھی، جسے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی فوج کے ہمراہ سحر کے وقت قتل کر دیا تھا۔

اساورہ:۔ یہ لوگ ایرانی فوج میں شامل تھے، ساسانی حکومت کے زوال کے بعد انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور انتظامی امور میں خلیفہ کی امداد کی۔

جنگی قیدی:۔ یہ وہ ہندوستانی تھے جو اسلام کے قانون جہاد کے مطابق قیدی بنا کر ہندوستان سے عرب لے جائے گئے اور اسلام قبول کر کے عربوں کی ولاء ودوستی میں رہے۔

مذکورہ ان تینوں قسم کے ہندوستانیوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا گیا اور قابلیت کے لحاظ سے مختلف مراتب دیے گئے۔ باب کے آخر میں سرندیپ کے اس وفد کا بھی تذکرہ ہے جو محمدؐ کی ملاقات کی غرض سے عہدِ فاروقی میں مدینہ پہنچا تھا۔

اس کتاب کے آٹھویں باب ''ہندوستان میں صحابہؓ وتابعینؒ'' میں ان صحابہؓ وتابعینؒ کے حالات نقل کئے گئے ہیں، جن کی ہندوستان یا اس سے قریب ترین علاقہ میں آنے کی تصریح کتابوں میں ان کے ناموں کے ساتھ موجود ہے۔ مصنف نے شروع میں لفظ ''صحابی'' اور ''تابعی'' پر تجزیاتی وتحقیقی بحث کی ہے، بعد ازاں سترہ صحابہؓ اور نو تابعینؒ کے حالات حسب ذیل ترتیب پر درج کئے ہیں۔

صحابہؓ کے اسماء:

(1) حضرت حکم بن ابو العاص ثقفیؓ (2) حضرت حکم بن عمرو ثعلبی غفاریؓ (3) حضرت خریت بن راشد ناجی (4) حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذحجی (5) حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ (6) حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاریؓ (7) حضرت صحار بن عباس عبدیؓ (8) حضرت عاصم بن عمرو تمیمیؓ (9) حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاریؓ (10) حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی (11) حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشیؓ (12) حضرت عبیداللہ بن معمر قرشی تیمیؓ (13) حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفیؓ (14) حضرت عمیر بن عثمان بن سعدؓ (15) حضرت مجاشع بن مسعود سلمیؓ (16) حضرت مغیرہ بن ابی العاص اور (17) حضرت منذر بن جارود عبدیؓ۔

تابعینؒ کے اسماء:

(۱) حضرت تاغر بن دعرؒ (2) حضرت حارث بن مرّہ عبدیؒ (3) حضرت حکیم بن جبلہ عبدیؒ (4)

حضرت امام حسن بن ابوالحسن بصریؒ (5) حضرت سعد بن ہشام (6) حضرت سعید بن کندیر قشیریؒ (7) حضرت شہاب بن مخارق تمیمیؒ (8) حضرت نسیر بن وسیم عجلیؒ اور (9) حضرت صفی بن فسیل شیبانیؒ۔

ان صحابہؓ و تابعینؒ کے حالات نقل کرنے کے بعد مصنف نے تین ہندی الاصل تابعین یعنی ابوسالمہ زطی، طبیب زطی مدنیؒ اور خولہ ہندیہ (حضرت علیؓ کی باندی) کے تذکرہ پر کتاب کا اختتام کیا ہے۔

5۔ خلافت امویّہ اور ہندوستان

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کے موضوع پر قاضی اطہر مبارکپوری کی اگلی کتاب ''خلافتِ امویّہ اور ہندوستان'' ہے جو پہلی دفعہ 1975ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ خلافت بنوامیہ کے زیر انتظام اسلامی ہند کی 90 سالہ تاریخ پر مبنی یہ تصنیف اپنے موضوع پر سب سے مفصل کتاب ہے، جس میں مصنف نے اموی دور کے اسلامی ہند کے غزوات و فتوحات، ادارتی اور سرکاری انتظام، جنگی و فوجی نظام اور ملکی و شہری انتظام وغیرہ پر مفصل تبصرہ کیا ہے، مزید برآں امراء و حکام اور راجے مہاراجے، حتیٰ کہ ہند و عرب سے تعلق رکھنے والے عام مسلمانوں کا اجمالی تعارف درج ذیل ابواب کی درجہ بندی کے ساتھ کرایا ہے۔

پہلے باب ''غزوات و فتوحات اور اہم واقعات'' کے ضمن میں ان تمام غزوات و فتوحات کا اجمالی تعارف ہے جو اموی عہد میں ہندوستان میں پیش آئیں، اس حوالہ سے امیر معاویہؓ، ولید بن عبدالملک اور ہشام بن عبدالملک کے دور میں سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئیں، جن کے نتیجہ میں موجودہ پاکستان کے علاوہ افغانستان، کشمیر، پنجاب، راجستھان اور گجرات کا کچھ علاقہ اسلامی قلمرو کا حصہ بنا، یہ پورا خطہ مسلمانوں نے جنگ یا صلح کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ عبدالملک کے زمانہ تک شہر قندابیل (موجودہ افغانستان) اسلامی فوج کے لئے پناہ گاہ تھا، لیکن ولید کے عہد میں محمد بن قاسم نے شہر دیبل کو اس کا مستقر بنایا، بعدازاں یہاں کے باغی و جنگجو قبائل اور ہمسایہ حکومتوں کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں حکم بن عوانہ کلبی نے شہر منصورہ تعمیر کروایا۔

دوسرے باب ''ادارتی اور سرکاری نظام'' میں بنوامیّہ کے سیاسی نظام سے بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب نے ان کے اٹھائیس امرائے ہند کی تفصیلات بیان کی ہیں، جن میں سے دو امراء صحابیؓ تھے جبکہ بقیہ تابعین یا تبع تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان میں مشہور ترین امراء محمد بن قاسم، جنید بن عبدالرحمٰن مرّی، تمیم بن زید قینی اور حکم بن عوانہ کلبی تھے۔ امراء کے حالات بیان کرنے کے بعد مصنف نے ان کے تقرر کے تین طریقے بھی اس باب میں ذکر کیے ہیں، علاقائی نظام کو درست رکھنے کے لئے ان امراء کے ساتھ اعیان و شرفاء کی ایک

جماعت بھی ہوا کرتی تھی جس کے افراد مختلف قسم کے امور و معاملات میں امیر کے مشیر و معاون ہوتے تھے، تاہم اہم امور و معاملات میں عراقی حاکم یا شامی خلیفہ سے خط و کتابت کا دروازہ بھی کھلا تھا، امیر کا اپنا کاتب، ترجمان، حرس یعنی محافظ دستہ ہوتا، اسی طرح دارالامارہ میں دارالقضاء، بیت المال اور جیل خانہ کا منظم نظم و نسق بھی تھا۔

تیسرا باب ''حربی اور فوجی نظام'' ہے۔ اس باب کے ضمن میں مصنف نے اسلامی فوج کی تعداد، اقسام، نوعیت، میدان جنگ میں سپاہیوں کے لڑنے کے طریقے اور جنگی اسلحہ وہتھیار وغیرہ سے بحث کی ہے، نیز بتایا ہے کہ عالمِ اسلام کے دوسرے خطوں کی طرح امویوں کا یہ حربی نظام ہندوستان میں بھی رائج تھا۔

چوتھے باب ''ملکی اور شہری نظام'' کے تحت ان حقوق سے بحث کی گئی ہے جو اموی سلطنت کے وسیع خطہ میں آباد غیر مسلموں (یہودی، عیسائی، پارسی اور ہندو وغیرہ) کو حاصل تھے، یہ لوگ ذمی کہلاتے تھے اور انہیں مذہبی رسومات کی مکمل آزادی حاصل تھی، نیز قابلیت کی بنا پر ان میں سے بعض لوگ کلیدی عہدوں پر بھی فائز کئے جاتے تھے اور زیادتی کی صورت میں انہیں براہ راست خلیفہ سے شکایت کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ غیر مسلموں کے ان حقوق کے علاوہ اموی حکمرانوں نے اسلامی ہند کی تعمیر و ترقی میں جو حصہ لیا، اس کی تفصیلات بھی اس باب میں دی گئی ہے، چنانچہ اس حوالہ سے انہوں نے کیز، منصورہ اور محفوظہ نامی تین نئے شہر آباد کئے اور قدیم ہندوستانی شہروں میں دیبل، الور، ملتان، برہمن آباد، سیوستان وغیرہ کی از سرِ نو تعمیر و توسیع کر کے ان میں مسلمانوں کو بسایا تھا، شہروں کے علاوہ خانات اور سرائے بھی تعمیر کرائے تھے۔

پانچویں باب ''اموی حکمراں اور راجے مہاراجے'' کا تعلق ان ثقافتی روابط سے ہے جو اموی خلفاء اور ہندوسانی راجاؤں کے مابین استوار تھے، اس حوالہ سے کچھ کے راجہ راسل، بامیان کے راجہ رتبیل، قنوج کے راجہ ہر چند، راجہ رائے اور قیقان وچین وغیرہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے راجاؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ اموی خلفاء سے ان کے بڑے اچھے تعلقات قائم تھے، ان میں سے بعض نے خلیفۂ وقت کی خدمت میں قیمتی ہدایا وتحائف بھی بھیجے تھے اور خلیفہ کی طرف سے یہاں کے راجاؤں کو جو تحائف بھیجے گئے اس کی تفصیلات بھی اس میں بیان کی گئی ہیں۔

اگلے باب ''ہندوستان کے مسلمان'' میں عرب میں آباد ہندی الاصل اور ہندوستان میں آباد عربی النسل مسلمانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اموی عہد میں عرب میں دو طرح کے ہندوستانی پائے جاتے تھے، ایک وہ جو ہندوستان سے جنگ کی صورت میں قیدی بنا کر وہاں لے جائے گئے اور عربوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھے، بعد

میں ان کی نسلوں میں کئی علمی شخصیات پیدا ہوئی۔ دوسرے عہد قدیم سے عرب میں آباد ہندوستانی جاٹ اور سیابجہ تھے، اس زمانہ میں ان کا اصل مسکن عراق کا شہر بصرہ تھا، لیکن حجاج بن یوسف نے بغاوت کے نتیجہ میں انہیں مقام کسکر اور شام کی طرف منتقل کر دیا۔ اسی زمانہ میں عربی مرد اور ہندی عورت کے اختلاط سے وجود میں آنے والی ایک تیسری نسل بیاسرہ کا بھی تذکرہ اس باب میں موجود ہے۔ عرب میں آباد ہندی مسلمانوں کے مقابلہ ہندوستان میں آباد عربی مسلمان بنوثقیف، بنوعبدالقیس، بنوتمیم، بنوسامہ، قریش، ہبار، بنواز داور بنوکلب وغیرہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور سندھ سے لیکر سراندیپ تک اس ملک میں ان کی بستیاں آباد تھیں، مقامی عوام اور راجہ مہاراجہ ان کی عزت کرتے اور عقیدت ومحبت سے پیش آتے تھے۔ صاحب کتاب نے اس باب میں خاشک، دیبل، ملتان، الور، سیوستان اور نیرون وغیرہ کو مسلم اکثریت والے شہروں میں شمار کیا ہے اور مؤرخین کی تحریروں کے حوالہ سے قیقان، قندھار، قندابیل، دیبل وغیرہ کو ان کی شہادت گاہ بتایا ہے۔ آخر میں اس بات کی بھی توضیح کی ہے کہ ہندوستان کی مصنوعات ومخلوقات جیسے سندھی طرائف، چینی طرائف، قصداری انگور، قیقانی گھوڑے، سندھی گھوڑے، ہندی خضاب، بھینسیں، ہندی طرزِ تعمیر اور باندیاں عرب میں انہی مسلمانوں کے ذریعہ متعارف ہوئیں۔

آٹھویں باب ''اسلامی علوم وفنون'' میں علمِ حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر لسانی وادبی علوم وفنون کی سرگرمیوں کو زیرِ بحث لاکر ان چند محدثین کا تعارف کرایا گیا ہے جو اموی عہد میں عرب سے ہندوستان آئے، یا ہندی الاصل نے عرب میں رہ کر حدیث کی خدمات انجام دیں۔ ہندی الاصل محدثین میں آلِ بیلمانی، آلِ ابی معشر سندی اور آلِ مقسم قیقانی کے علاوہ اس باب میں امام مکحول سندی شامی اور امام اوزاعی کا تذکرہ ہے جبکہ ہندوستان آنے والے محدثین کی فہرست میں تیس نام مذکور ہیں۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ''اموی دور میں واردین وصادرین'' ہے۔ اس کے تحت مصنف نے ان تمام افراد کے تراجم جمع کر دیئے ہیں جن کی اموی عہد میں ہندوستان آنے کی تصریح مؤرخین نے اپنی کتابوں میں ان کے نام کے ساتھ کی ہے، مختلف پیشوں، طبقوں اور عہدوں سے ان لوگوں کا تعلق تھا، چنانچہ امراء کے علاوہ ان میں اعیان واشراف، علماء، صلحاء اور عبّاد وزہاد وغیرہ سبھی شامل تھے، ان میں حکومت کے باغی بھی تھے اور فوج کے سپاہی بھی، ایسے لوگوں کی مجموعی تعداد 181 ہے۔ باب کے آخر میں ان ہندوستانیوں کا بھی تعارف ہے جو اس زمانہ میں عرب میں آباد تھے، اس حوالہ سے 17 مرد اور 4 عورتوں کے تراجم اس باب میں شامل کیے گئے ہیں۔

6۔ خلافتِ عبّاسیہ اور ہندوستان

عرب و ہند کی اسلامی تاریخ پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ آخری کتاب ہے جو 1982ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ 554 صفحات کی اس کتاب میں مصنف نے خلافت عباسیہ کے زیرِ انتظام اسلامی ہند کے غزوات وفتوحات، اداراتی اور سرکاری انتظام، جنگی وفوجی نظام اور ملکی وشہری انتظام وغیرہ پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے، اس کے علاوہ امراء وحکام، راجے مہاراجے اور عرب و ہند کے عام مسلمانوں کا اجمالی تعارف مختلف ابواب میں پیش کیا ہے۔

پہلا باب ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' خلفائے بنوعباس کے زیرِ تصرف ہندوستان کی ایک سو پندرہ سالہ تاریخ پر مشتمل ہے، جس میں ابوالعباس سفاح سے لیکر دسویں خلیفہ متوکل کے زمانہ (247ھ) تک سندھ کے تخت پر متمکن ہونے والے 42 امراء کی سیاسی رو داد بیان کی گئی ہے۔ ابوالعباس سفاح کے زمانہ میں سندھ پر منصور بن جمہور کلبی کی خود مختار حکومت قائم تھی، خلیفہ بننے کے بعد ابوالعباس سفاح نے مغلس بن سری عبدی کو یہاں کا امیر بنا کر بھیجا مگر منصور بن جمہور کلبی کے مقابلہ میں ناکام ہوکر وہ قتل ہوا، اس کے بعد موسی بن کعب نے یہاں آکر منصور بن جمہور کا خاتمہ کیا، موسیٰ بن کعب کے بعد خلیفہ ابوجعفر منصور، مہدی، ہادی، ہارون، امین، مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے دورِ خلافت میں یکے بعد دیگر 40 امراء سندھ کے تخت پر بیٹھے اور ہٹائے گئے، جن میں ہشام بن عمرو تغلبی، لیث بن طریف خزاعی، داؤد بن یزید مہلبی، عمران بن موسیٰ برمکی اور عمر بن عبدالعزیز ہباری مشہور امراء تھے۔ مؤخر الذکر نے خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد ہندوستان میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ایک سلطنت کی بنیاد رکھی جو تاریخ میں ہباری سلطنت کے نام سے موسوم ہوئی۔ عباسی عہد میں ہندوستان میں کوئی نیا علاقہ فتح نہیں ہوا بلکہ ان کی حکومت امویوں کے مفتوحہ علاقہ ہی میں محدود رہی، البتہ دوسرے شعبوں خصوصاً علوم وفنون میں ترقی ہوئی، چنانچہ ہندی علماء ودانشوروں کی کتابیں اسی زمانہ میں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں، راجاؤں سے بہتر تعلقات استوار ہوئے اور بہت سے ہندوستانی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

کتاب کا دوسرا باب ''امارت بحرِ بصرہ اور ڈاکوؤں سے جنگ'' ایک ایسے فتنہ سے متعلق ہے جس سے سندھ کے امراء وحکام ایک طویل عرصہ تک دوچار ہوئے۔ دراصل اس زمانہ میں عالم اسلام میں پھیلی بدامنی اور طوائف الملوکی کا فائدہ اٹھا کر بصرہ میں آباد ہندی جاٹوں نے بھی سرکشی اختیار کر لی اور بحرِ بصرہ سے سوراشٹر (گجرات) تک سمندر میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، ان کی سرکوبی کے لئے ابوجعفر منصور نے 140ھ میں امارت بحرِ بصرہ کا شعبہ قائم کیا، جس کے تحت حکومت کی ان جاٹوں سے پندرہ جنگیں ہوئیں، مگر اکثر جنگوں میں فتح حاصل ہونے کے بعد بھی ان کا زور نہیں ٹوٹا، بالآخر معتصم باللہ کے زمانہ میں عجیف بن عقبہ نے ایک فیصلہ کن جنگ میں

ستائیس ہزار جاٹوں کو گرفتار کر کے عین زربہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔

تیسرے باب ''امارات اور ملکی وشہری انتظامات'' کے تحت کس خلیفہ کے عہد میں کتنے امراء سندھ کے تخت پر متمکن ہوئے؟ اس سے بحث کرنے کے بعد قبائلی مناسبت سے تمام امراء کی درجہ بندی کی گئی ہے، مزید برآں عباسیوں کے ملکی وشہری نظام کے اجمالی تعارف کے بعد ہندوستان کے واقعات ضمناً اس میں شامل کیے گئے ہیں، البتہ یہاں کے جن شہروں اور عمارتوں میں اس زمانہ میں تعمیری کام ہوئے ان کا بطور خاص تذکرہ ہے۔

چوتھے باب ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں اہل ہند کی رواداری پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں کے لوگ مسلمانوں سے بڑی محبت کرتے تھے، عرب کے خلیفہ کی عظمت ان کے دلوں میں سب بادشاہوں سے زیادہ تھی، نیز بعض راجاؤں کے یہاں مسلمانوں کو درباری آداب اور ملکی قوانین سے آزادی حاصل تھی اور کچھ جگہوں پر مسلمانوں کے امور ومعاملات طے کرنے کے لئے مسلمان عالم ہی کا انتخاب کیا جاتا تھا، مثلاً ایک مقام پر بیان کیا گیا ہے:

> ''راجوں مہاراجوں نے اپنی طرف سے مسلمان حاکم اور قاضی مقرر کر رکھا تھا جو ان کے علاقہ کے مسلمانوں کے امور ومعاملات اسلامی قانون کے مطابق طے کرتا تھا، اس عہدہ کو ہنرمنہ اور عہدیدار کو ہنرمن کہتے تھے۔''(12)

مسلمانوں کے ساتھ رواداری کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے بعد ہندی عورتوں کے حسن وجمال اور ان کی دوسری خوبیوں کے پیش نظر عربوں کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہندی عورتیں اپنے حسن وجمال کی کشش، موسیقی، امور خانہ داری، بچوں کی پرورش اور توالد وتناسل جیسے اوصاف کی وجہ سے عربوں میں بہت زیادہ مقبول ومحبوب تھیں، پھر اس موقف کی تائید میں معاصر شعراء کے وہ اشعار پیش کیے گئے ہیں جن میں ان اوصاف و کمالات کا تذکرہ آیا ہے۔

پانچویں باب ''عرب و ہند کے درمیان تجارت' کے ضمن میں ہندوستان اور عرب کے مابین برّی و بحری راستوں کی نشاندہی کے بعد جہازوں میں موجود تجارتی سامان اور تاجروں کی تفصیلات درج ہے۔ اس زمانہ میں سامان کی خرید وفروخت سونے چاندی کے سکّوں سے ہوا کرتی تھی اور تاجر آمد ورفت کے مقامات کی علاقائی زبانوں سے واقف تھے، نیز سمندری لٹیروں سے حفاظت کی غرض سے تجارتی جہازوں میں محافظ دستے تعینات کئے جاتے تھے۔

چھٹے باب ''ہندی علوم وفنون اور علمائے ہند'' میں حساب و ہندسہ، علم نجوم وفلکیات، علم طب، ہندی جڑی

بوٹیوں، قصے کہانیوں اور نغمہ وموسیقی وغیرہ ہندی علوم وفنون کو زیرِ بحث لاکر ان علوم کے ماہرین اور ان پر لکھی گئی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی خلیفہ منصور اور اس کے جانشینوں میں سے جن لوگوں نے علوم وفنون میں خاص دلچسپی لی اور قابلِ قدر اضافے کئے تھے، ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ساتویں باب ''اسلامی علوم وفنون اور علمائے اسلام'' میں مصنف نے ان 75 ہندی فقہاء ومحدثین کے حالات قلم بند کئے ہیں جو عباسی عہد میں عالمِ اسلام کے مختلف شہروں میں گزرے ہیں، اسی طرح جو علماء دوسرے علاقوں سے ہندوستان آئے ان کا بھی اس باب میں ذکر ہے، لیکن تعداد میں یہ فقط آٹھ تھے۔ اس میں ان علماء کے حالات بھی منقول ہیں جو تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری کے درمیان اس ملک میں پیدا ہوئے یا باہر سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔

آخری باب کا عنوان ''ہندی موالی ومممالیک'' ہے۔ مولیٰ یا موالی عربی میں آزاد کردہ غلام کو کہا جاتا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس باب میں عرب میں آباد ہندوستانی غلاموں کی دینی، علمی، سیاسی اور سماجی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ عباسی دور میں سندھ وہند کے غلاموں نے اسلامی ریاست کے ہر شعبہ میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی، بغداد، بصرہ اور کوفہ میں ان کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی اور مقامی باشندوں کی حیثیت سے ہر معاملہ میں دخل رکھتے تھے، بہترین استعداد وصلاحیت کی بدولت ان میں حفاظِ حدیث، ائمہ دین، عباد وزہاد، شعراء وادباء، امراء وحکام، اربابِ جاہ ومنصب اور صاحبِ مال ودولت وغیرہ پیدا ہوئے، اور ان کے کئی خاندان مدتوں شہرت وناموری کے حامل رہے، چنانچہ آلِ بیلمانی، آلِ ابومعشر سندی، آلِ مقسم قیقانی دینی علوم میں اور سندی بن شاہک کا خاندان حکومت وامارت اور دنیاوی جاہ ومنصب میں مدتوں مشہور رہا، غرض یہ کہ ہندوستان کے ان غلاموں اور غلام خاندانوں نے اپنے اپنے حلقہ میں بہترین خدمات انجام دیں۔

7۔ العقد الثمین

عرب وہند کے موضوع پر اردو میں مذکورہ چھ کتابوں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری نے تین کتابیں عربی میں بھی لکھیں ہیں، جن میں سے ایک پیش نظر کتاب ''**العقد الثمین** '' ہے۔ اس کا پورا نام ''**العقد الثمین فی فتوح الهند و من ورد فیها من الصحابة و التابعین** '' ہے۔ پہلی دفعہ یہ کتاب 1968ء میں ممبئی کے مکتبہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی سے 335 صفحات میں شائع ہوئی اور دوسری مرتبہ 1979ء میں دارالانصار قاہرہ سے چھپی۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب میں خلفائے راشدین وبنوامیہ کے زمانہ کی اسلامی ہند کی فتوحات کا

ذکر کیا ہے، ساتھ ہی یہاں آنے والے مجاہدین، ولاۃ وحکام کے علاوہ صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعین میں سے محدثین، فقہاء، عبّاد وزہّاد اور رجالِ علم وفن کے حالات وتراجم نقل کیے ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے اسلامی ہند کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے حالات وواقعات کافی تحقیق کے بعد قلم بند کیے گئے ہیں۔ مصنف نے گزشتہ اوراق میں مذکور اپنی دو کتابیں ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' اور ''خلافت بنو امیہ اور ہندوستان'' اسی کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھیں۔

8۔ الهند فی عهد العباسیین

1979ء میں دارالانصار قاہرہ سے شائع ہونے والی یہ کتاب سابقہ کتاب کا تکملہ ہے، جس میں خلافتِ عباسیہ کی ابتدا سے 340 ہجری تک ہندوستان کی اسلامی تاریخ مذکور ہے، نیز یہاں آنے والے عباسی امراء وحکام اور خودمختار عرب حکمراء کے حالات وتراجم بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ 78 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے تمام مضامین ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' اور ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' میں بھی شامل ہیں۔

9۔ رجال السند و الهند

کتاب کا پورا نام ''**رجال السند و الهند الی القرن السابع**'' ہے۔ عرب وہند کی اسلامی تاریخ پر یہ قاضی اطہر مبارکپوری کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، جس میں انہوں نے پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک کے ان علماء، محدثین، فقہاء، اولیاء، شعراء، ادباء، فلاسفہ، اطباء، حکام، سلاطین اور مسلم تجار وصنعت کار وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی، خواہ وفات کہیں بھی ہوئی ہو، یا وہ ہندوستانی جو عرب میں پیدا ہوکر وہیں پروان چڑھے، اسی طرح اس میں ان لوگوں کے تراجم بھی شامل ہیں جو سیاسی، اقتصادی یا تبلیغ وغیرہ کی غرض سے دوسرے ممالک سے یہاں آکر آباد ہوئے اور کام کی تکمیل کے بعد واپس چلے گئے یا پھر وفات پاکر یہیں مدفون ہوئے۔

عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کے حدود مغرب میں ایران وافغانستان اور مشرق میں برما تک وسیع تھے اور قدیم عرب مؤرخین وجغرافیہ نویس اس پورے خطہ کے لئے سندھ اور ہند کے الفاظ استعمال کرتے تھے، قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی انہی کی پیروی میں اس کتاب میں ہندوستان کا ذکر دو ملکوں کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، ورنہ بلاشبہ یہ دونوں ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔

مؤلف کے ذہن میں اس کی جمع وتدوین کا خیال ڈابھیل میں تدریس کے زمانہ (1948ء) میں پیدا ہوا،

جہاں وہ ایک دن مشہور مصری عالم احمد امین کی کتاب ''ضحی الاسلام'' کے مطالعہ میں مشغول تھے، دوران مطالعہ ان کی نظر سے ابن الاعرابی کا ترجمہ گزرا جن کی بابت کتاب میں مذکور ''کان اصلہ سندیاً'' دیکھ کر ان کی اس موضوع پر کام کرنے کی خواہش ہوئی۔ کتاب کی جمع وتدوین کے اس دلچسپ واقعہ کو موصوف نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''ایک روز احمد امین کی کتاب ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق ''کان اصلہ سندیا'' دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہل علم وفضل سندی ہندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، وقت وقت کی بات ہے، ورنہ اس سے پہلے دیوان حماسہ وغیرہ میں ابو عطاء السندی کے اشعار بار بار نظر سے گزرے مگر اس کا احساس نہیں ہوا، بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کر لیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں ''رجال السند والهند'' کی شکل میں سامنے آیا۔''(13)

بعد ازاں تیس سال کی تلاش وتحقیق کے بعد کتاب حسب ذیل دو مراحل میں شائع ہوئی۔

پہلا مرحلہ:۔ یہ مرحلہ اس وقت تکمیل کو پہنچا جبکہ کتاب ممبئی کے المکتبۃ الحجازیہ سے جون 1958ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس نسخہ میں دو طرح کے اہل علم اور اعیان واشخاص کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، ایک وہ جو اسی ملک میں پیدا ہوئے اور یہیں زندگی گزاری، خواہ ان کی وفات کہیں بھی ہوئی ہو۔ اور دوسرے سندھ و ہند کے وہ باشندے جو دوسرے علاقوں میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور زندگی بسر کی۔

328 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں مختلف ممالک کے علماء، اہل قلم اور سربرآوردہ حضرات کی آراء وتقریظیں درج ہیں۔ (14) اس کے بعد صفحہ 11 سے صفحہ 46 تک مصنف کے قلم سے تحریر شدہ تفصیلی مقدمہ ہے، جس میں موضوع کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے پیش رو مصنفین کی ان کتابوں کا تذکرہ ہے جو خاص سندھ و ہند کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، بعد ازاں مؤلف نے کتاب کی وجہ تسمیہ اور اپنے منہج وانداز تحقیق سے گفتگو کی ہے، اس کے بعد علمی، ادبی اور ثقافتی اعتبار سے عالم اسلام میں سندھ و ہند کا کیا مقام ومرتبہ ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے، پھر ان دونوں ملکوں کے ان قدیم مشہور شہروں کا تعارف کرایا ہے جن کا ذکر کتاب میں اکثر وبیشتر جگہ آیا ہے۔ تراجم وسوانح پر مبنی کتاب کا اصل عنصر صفحہ 47 سے شروع ہو کر 319 پر ختم ہو جاتا ہے، جس میں 316 افراد کے تراجم حروف تہجی کی ترتیب پر بیان کئے گئے ہیں، البتہ الف میں لفظ ''احمد'' اور میم میں لفظ ''محمد'' کو تبرکاً دیگر ناموں پر مقدم رکھا گیا ہے، اس کے بعد مضامین کی فہرست صفحہ 325 تک اور آخر میں صفحہ 328 تک مصادر و

مراجع درج ہیں۔

مؤلف نے تاریخ وطبقات کی عام وخاص کتابوں کے علاوہ حدیث، سیر ومغازی، جغرافیہ، لغت، شعر، ادب اور دیگر علوم وفنون کی سو سے زائد امہات کتب سے استفادہ کرکے کتاب میں مذکور تراجم کو جمع کیا ہے اور ہر ترجمہ میں متعلقہ ماخذ سے اقتباسات بعینہٖ نقل کردیے ہیں، نقل بالمعنیٰ یا قطع وبرید کی کوشش نہیں کی، البتہ اپنی طرف سے کہیں الفاظ کا اضافہ کیا بھی تو ''**قال القاضی**'' لکھ کر پہلے ہی اس کی تصریح کردی ہے۔ اسی طرح اخذ شدہ عبارت میں مؤلف کو اپنی تحقیق کی بنیاد پر کوئی غلطی نظر آئی تو الگ سے اس پر تنبیہ کرکے غلطی کی تصحیح کردی ہے جیسا کہ صفحہ 253 اور 254 پر الور کے راجہ ''مہروک بن رائق'' کا ترجمہ بزرگ بن شہریار کی کتاب ''**عجائب الھند**'' سے ماخوذ ہے، پورا ترجمہ نقل کرنے کے بعد مؤلف نے لفظ ''الرا'' (الور) کی بابت تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

" قال القاضی: کان مھروک بن رایق من رجال المائۃ الثالثۃ، وکان ملک الور، و (الرا) فی کل موضع فی ھذہ العبارۃ تصحیف النسخ او الطبع." (15)

ترجمہ:۔ مہروک بن رائق تیسری صدی میں الور کا راجہ تھا اور عبارت میں ہر جگہ جو ''الرا'' ہے تو وہ نقل کی غلطی ہے یا طباعت کی۔

اسی طرح متن میں اگر کسی غیر معروف قبیلہ، خاندان، نسل یا قوم کا ذکر آیا ہے اور وہ کسی خاص اہمیت کا حامل ہے تو مصنف نے اس کی تشریح بھی مفصل اور تشفی بخش انداز میں کی ہے، جیسا کہ صفحہ 272 تا 275 پر مذکور ابو سالمہ زطی کے ترجمہ میں لفظ ''سیابجہ'' اور ''زط'' پر بحث ہے۔ ساتھ ہی حالات نقل کرتے وقت صاحبِ ترجمہ کے سن وفات اور زمانہ کی تعیین کا اہتمام بھی کیا ہے، لیکن اگر دونوں میں سے کسی ایک کی بھی صراحت انہیں کسی ماخذ میں نہیں ملی تو متعلقہ شخص کے شیوخ وتلامذہ اور معاصرین کے تراجم میں غور وفکر کرکے زمانہ کی تعیین کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً احمد بن سندی بغدادی کے زمانہ کی تعیین ان کے شیخ یعقوب بن دورقی کے سن وفات سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" قال القاضی: ولم اجد سنۃ وفاتہ ومات شیخہ الدورقی فی سنۃ الثنتین و خمسین و مائتین، فکان احمد بن السندی المطرز من رجال المائۃ الثالثۃ." (16)

ترجمہ:۔ مجھے ان کا سن وفات نہیں مل سکا، ان کے استاذ یعقوب بن ابراہیم الدورقی کی وفات 252ھ میں ہوئی تھی، جس کا مطلب ہے کہ احمد بن سندھی مطرز تیسری صدی ہجری کے اعیان میں ہیں۔

دوسرا مرحلہ:۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا:

" ولم نذکر اللذین جائوا الی الھند و تأھلوا وتوطنوا فیھا، ومن حقوقھم علینا ان

نذکرھم ایضاً وھم کثیرون ، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً .''(17)

ترجمہ:۔ جولوگ باہر سے ہندوستان آئے اور پھر شادی کر کے یہی کے ہوگئے، ایسے لوگوں کا تذکرہ ہم نے اس میں نہیں کیا ہے، حالانکہ ان کے تئیں ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ان کا بھی تذکرہ کریں اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، شاید کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کردے۔

چنانچہ آئندہ بیس سال کے عرصہ میں انہوں نے مذکورہ بالا اس کمی کی تلافی کی، ساتھ ہی مطبوعہ نسخہ میں بہت کچھ حذف و اضافہ بھی کیا، جس سے کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی، اور مسوودہ تیار ہونے کے بعد 1978ء دارالانصار قاہرہ سے دو قسموں پر مشتمل اس کا اضافہ شدہ جدید نسخہ 588 صفحات میں شائع ہوا۔

قسم اول:۔ اس دوسرے ایڈیشن کے قسم اول کا تعلق سابقہ نسخہ سے ہے، جس میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ مؤلف نے اسلامی دور سے قبل کے ہندوستانی فلاسفہ، اطباء اور مالدیپ و سومرہ کے حکمرانوں کے تراجم یکسر حذف کر دیے ہیں، ان کی کل تعداد سابقہ ایڈیشن میں 57 تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے بعض ایسے اصحاب علم وفضل کے تراجم بھی کتاب سے حذف کر دیے ہیں جو درحقیقت ہندی یا سندی نہیں تھے، بلکہ مؤلف نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر انہیں کتاب میں شامل کرلیا تھا، مثلاً سابقہ ایڈیشن کے صفحہ 167-165 میں مذکور محدث عبد بن حمید کو انہوں نے ''کس'' بالفتح کے ساتھ گجرات کے علاقہ ''کچھ'' کی طرف منسوب سمجھ کر داخل کتاب کرلیا تھا، لیکن بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ یہ نسبت درحقیقت کسرہ کے ساتھ ''کس'' کی طرف ہے، جس کا جائے وقوع ماوراء النہر کے شہر نخشب کے قریب ہے، لہٰذا ان کا ترجمہ سرے سے حذف کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے سہیل بن ذکوان ابوالسندی المحدث (ص:152) ابوسعید المالکی الہندی الفقیہ (ص:375) ابوالہندی الشاعر (ص:287) وغیرہ سولہ یا اس سے متجاوز افراد کے تراجم بھی حذف کیے ہیں کیونکہ کتاب کی شرط پر یہ سب سندھی یا ہندی نہیں تھے۔

اسی طرح مصنف نے سابقہ ایڈیشن کے بعض تراجم میں نظر ثانی کے بعد حسب تحقیق کمی و بیشی بھی کی ہے، مثال کے طور پر ابراہیم بن سندی بن شاہک کا ترجمہ طبع اول کے صفحہ 66 پر مفصل تھا لیکن طبع دوم کے صفحہ 64 پر بہت ہی مختصر ہے، یہی حال ابان بن محمد السندی اور امام حسن صغانی وغیرہ کا ہے کہ ان کے تراجم طبع اول میں بالترتیب صفحہ 66 اور 98 تا 104 پر مذکور تھے اور طبع دوم میں تفصیل کے ساتھ صفحہ 59 اور 92 تا 95 پر ہیں۔

مؤلف نے اس جدید نسخہ میں 75 سے زائد ایسے نئے تراجم کا بھی اضافہ کیا ہے جو سابقہ ایڈیشن میں نہیں تھے، ان میں قابلِ ذکر نام محدث اسمٰعیل بن ابراہیم المعروف بہ ابن علیہ، ان کے صاحب زادگان حماد بن اسمٰعیل

اور ابراہیم بن اسمعیل کے ہیں ۔اس طرح سابقہ ایڈیشن سے ایک معتد بہ حصہ حذف کرنے کے بعد دوسرے ایڈیشن کی صرف قسم اول کی تعداد 306 ہے۔

قسم ثانی:۔کتاب''رجال السند والهند'' کی طبع ثانی میں ایک گرانقدر اضافہ ''القسم الثانی'' کا ہے، جو کہ ایک مستقل تصنیف ہے۔قسم اول میں صرف ان لوگوں کے تذکرے ہیں جو سندھ وہند کے کسی حصہ میں پیدا ہوئے یا پھر وہ لوگ جو اصلاً تو سندھی یا ہندی تھے لیکن ان کی پیدائش اور بود وباش کسی اور ملک میں ہوئی تھی۔تیسری قسم ان رجال کی ہے جو دوسرے علاقوں کے باشندے تھے، لیکن سیاسی، اقتصادی یا تبلیغی اغراض سے سندھ وہند کے کسی علاقہ میں آبسے اور اپنی مہم پوری کر کے واپس چلے گئے یا یہیں مدفون ہوئے۔ان لوگوں کو بالقصد پہلی جلد میں شامل نہیں کیا گیا تھا، صرف ایک نام عمران بن موسیٰ برمکی کا غلطی سے طبع اول کے صفحہ 189 پر درآیا تھا جو اب قسم ثانی کے صفحہ 468 پر ہے۔

سندھ وہند کی ثقافتی تاریخ کے تعلق سے کتاب کا یہ حصہ معلومات کا گنجینہ ہے، جس کی ضخامت 272 صفحات اور درج شدہ تراجم کی کل تعداد 245 ہے جن میں 14 حضرات صحابہ ہیں، مؤلف نے ان کے شرف و منزلت کے باعث انہیں دوسروں پر مقدم رکھا ہے۔شروع میں صحابہ کرام کی ہندوستان آمد کے تعلق سے ایک بیش قیمت تمہید بھی ہے جو مختلف کتب علوم حدیث کی ورق گردانی کے بعد مرتب کی گئی ہے، اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے ان رجال کے تراجم درج کئے گئے ہیں جو قسم ثانی کی شرط پر اترتے ہیں۔اس طرح دونوں قسموں کے تراجم کی مجموعی تعداد 548 ہے جو مؤلف کتاب کے بقول سندھ وہند سے متعلق قابل ذکر اصحاب فضل کی واقعی تعداد کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے۔(18)

اس کتاب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے آئندہ کے لئے اپنے مؤلف کے علمی سفر کا رخ اور اس کی منزلیں متعین کیں، کیونکہ اس کی ترتیب وتدوین کے دوران موصوف نے حدیث، رجال، سیر ومغازی، تاریخ، طبقات، تذکرہ وتراجم، جغرافیہ، لغت اور شعر وادب وغیرہ علوم وفنون کی سو سے زائد امہات الکتب کا بار بار مطالعہ کیا اور اکثر وبیشتر کو بالاستیعاب پڑھا، بلکہ حتی الامکان پوری طرح کھنگال ڈالا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اپنے موضوع اور اس کے متعلقات پر پوری طرح حاوی ہوگئے، اس سے ان کے ذہن میں اسلامی ہند کی ابتدائی چار سو سالہ اسلامی تاریخ کا مفصل خاکہ مرتب ہوگیا، جو بتدریج اگلے چوبیس سالوں میں ماقبل مذکور آٹھ مدلل ومستند کتابوں کی شکل میں منظر عام پر آیا۔

متفرق موضوعات پر مبنی کتب اور کتابچے

عرب و ہند کی اسلامی تاریخ کے علاوہ دینی، علمی، اصلاحی اور تاریخی نوعیت کے دیگر موضوعات پر بھی قاضی اطہر مبارکپوری نے قلم اٹھایا اور بعض کتب و کتابچے تحریر کئے۔ اس حوالہ سے ان کی 13 کتابیں اور 5 کتابچے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں بعض موضوع کے لحاظ نادر اور مستند ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے دو (تدوین سیر و مغازی اور خیر القرون کی درسگاہیں) کی بابت مولانا نظام الدین بیان کرتے ہیں:

> ''قاضی صاحب نے اپنے علمی سفر میں وہ راہ اختیار کی جسمیں کم سے کم نشانات قدم پائے جائیں، ان کا ذہن نئے نئے موضوعات سوچتا رہتا تھا ان کے آخری دور کی دو کتابیں بھی اچھوتے موضوع پر ہیں، ''خیر القرون کی درسگاہیں'' اور ''تدوین سیر و مغازی'' اپنے اپنے موضوع پر اہم ترین کتابیں ہیں، ان کتابوں کی ترتیب میں جس وسعتِ مطالعہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں پر گہری نظر کی ضرورت ہے اہل علم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔'' (19)

بہر حال متفرق موضوعات پر مبنی قاضی اطہر مبارکپوری کی تمام کتب و کتابچوں کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:

1۔ اسلامی نظامِ زندگی

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں یہ اولین کتاب ہے، جو اوائل 1950ء میں سلطانی پریس ممبئی سے پاکٹ سائز کے 256 صفحات میں طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس سے قبل انہوں نے مختلف موضوعات پر سات کتابیں تحریر کی تھیں، مگر ان میں سے کچھ ضائع ہو گئیں اور کچھ کسی وجہ سے طبع نہ ہو سکیں۔ اس کتاب کا پیش نظر مطبوعہ نسخہ ادارہ فیضان معرفت بلساڑ، گجرات نے 2004ء میں متوسط سائز کے 160 صفحات میں شائع کیا تھا۔

لاہور میں قیام کے دوران قاضی صاحب روزنامہ ''زمزم'' میں دینی و اخلاقی نوعیت کے جو مضامین لکھتے تھے، اشاعت کے بعد اخبار سے ان کے تراشوں کو کاٹ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ ممبئی آنے کے بعد انہوں نے ان ہی تراشوں کی مدد سے ''حیات جمیلہ یعنی اسلامی نظام زندگی'' کے عنوان سے یہ کتاب مرتب کی، جسے ان کے ایک دوست حاجی عبدالغفور نے اپنے مالی تعاون سے شائع کیا اور اپنی مرحومہ شریک حیات جمیلہ کے ایصال ثواب کی نیت سے مفت تقسیم کروایا۔ (20)

موضوع کے اعتبار سے یہ اصلاحی نوعیت کی ایک مختصر کتاب ہے، جس میں مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی میں پھیلی برائیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس میں کل باسٹھ مضامین ہیں اور ہر مضمون میں مسلمانوں کی کسی نہ کسی سیاسی، سماجی یا اخلاقی برائی کا ذکر کر کے اس کا حل قرآن کی کسی آیت یا حدیث سے پیش کیا گیا ہے، بعض مضامین میں آثارِ صحابہؓ اور اقوال تابعینؒ بھی مذکور ہیں، آخر کے اکثر مضامین میں زمانہ کے وہ اثرات بھی نمایاں ہیں جن میں رہ کر صاحب قلم نے انہیں تحریر کیا تھا، نیز بعض مضامین سے ملک کے مستقبل کی بابت ان کے نظریہ کی توضیح بھی ہوتی ہے۔ کتاب کا مقدمہ مولانا سید محمد میاں کے قلم سے ہے، جس میں وہ اس کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ ہر وقت مسلمانوں کے پاس رہے اور وہ اس کا بار بار مطالعہ کریں۔''(21)

2۔افاداتِ حسن بصری

مذکورہ کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد اسی سال (1950ء میں) 56 صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ دائرہ ملیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے شائع ہوا، بعد ازاں اشاعت ثانی 2005ء میں فرید بک ڈپو نئی دہلی سے ہوئی۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اسے تقسیمِ ملک سے قبل مدرسہ احیاء العلوم کی عارضی مدرسی کے زمانہ میں مرتب کیا تھا۔(22)

کتابچہ کی ترتیب مضامین کے اعتبار سے کی گئی ہے، شروع میں اختصار کے ساتھ امام حسن بصریؒ کے حالات زندگی ہیں، پھر بالترتیب ان کے خطبات، مکاتیب اور ملفوظات کو رکھا گیا ہے۔ خطبات کے ضمن میں رسالہ میں قائم عناوین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کل تعداد بارہ ہے جن میں سے پہلے آٹھ خطبے عوامی ہیں، لیکن کون سا خطبہ کب، کہاں اور کس کے سامنے دیا گیا اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے، جب کہ بقیہ چار خطبے تین اموی حاکم (والئ عراق حجاج بن یوسف، عمر بن ہبیرہ اور گورنر بصرہ نظر بن عمر) کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں بصرہ کے گورنر نظر بن عمر سے دو مرتبہ خطاب کیا گیا تھا۔ تمام خطبات اصلاحی نوعیت کے ہیں جن میں دنیا و مافیہا سے بے رغبتی اور فکرِ آخرت سے دلچسپی موضوعِ گفتگو ہے اور مخاطب کو بار بار ''ابن آدم'' کہہ کر کوئی نہ کوئی نصیحت کی گئی ہے، مثلاً ایک وعظ میں امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

''ابن آدم! زمین پر چلتا پھرتا رہ، اس سے مانوس نہ ہو، کیونکہ عنقریب یہ تیری قبر بننے والی ہے۔ غور کر جب تو ماں کے شکم سے زمین پر آیا، اسی دن سے اپنی عمر گھٹا رہا ہے۔''(23)

خطبات کے بعد امام موصوف کے تین مکتوبات خلیفۂ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نام درج ہیں، جن میں وہ ایک حاکم کو رعایا کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور خلاف ورزی کی صورت میں انجامِ بد سے

ڈراتے ہیں۔آخری گیارہ صفحات میں ان کے ملفوظات مذکور ہیں،ان میں بھی نصیحت آموز پہلواختیار کیا گیا ہے۔

3۔حج کے بعد

39 صفحات پر مشتمل یہ مختصر سا کتابچہ قاضی اطہر مبارکپوری کی ان چند تقاریر کا مجموعہ ہے جو انہوں نے 1955ء میں حج سے فارغ ہونے کے بعد وطن لوٹتے وقت بحری جہاز میں حجاج کرام سے مخاطب ہوکر کی تھیں۔دو سال بعد 1957ء میں ان تقاریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے انجمن خدام النبیؐ کے زیر اہتمام عین ایام حج (8،9اور 10 ذی الحجہ) کے موقع پر شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔(24)

حج کے بعد اللہ کے نزدیک حجاج کرام کا کیا مقام و مرتبہ ہوتا ہے؟اور سماج کے تئیں ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ یہ دونوں سوالات رسالہ کا موضوع ومنشاء ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر خطیب نے حج سے متعلق چند احادیث، آثار صحابہؓ اور علامہ محمد ابن الحاج اندلسی کی کتاب ''**المدخل**'' کے بعض اقتباسات درج کر کے عوامی لب ولہجہ میں ان سب کی تشریح وتوضیح کی ہے،البتہ اندازِ بیاں تقریری ہے اور ضرورت کی حد تک ہی اس میں تبدیلی کی گئی ہے۔

اردو زبان میں اس موضوع پر لٹریچر نہ ہونے کے سبب عوام میں اسے بڑی مقبولیت ملی اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا،اس کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے علاوہ مدینہ منورہ،افریقہ اور برما وغیرہ ممالک سے بھی اس کی طلبی ہوئی،اس کے علاوہ بعض مجلّات میں اس پر تبصرہ بھی کیا گیا۔(25)اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں،جن میں پیش نظر نسخہ فرید بک ڈپو،نئی دہلی سے 2005ء میں شائع ہوا تھا۔

4۔معارف القرآن

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب ان کے ان منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جو''جواہر القرآن'' کے عنوان سے روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوتے تھے۔جواہر القرآن اس اخبار کا ایک مستقل دینی کالم تھا جس میں قاضی صاحب قرآن کی کسی آیت یا اس کے جزء کا ترجمہ مع تشریح بیان کرتے تھے،بسا اوقات آیت قرآنی کی روشنی میں حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔اسی کالم کے تقریباً سو مضامین کا انتخاب کر کے انہوں نے''معارف القرآن'' کے عنوان سے یہ کتاب مرتب کی،جو پہلی دفعہ ایجنسی تاج کمپنی ممبئی سے 1956ء میں شائع ہوئی،(26) جبکہ 143 صفحات پر مشتمل پیش نظر نسخہ گجرات کے ضلع بھڑوچ سے 2006ء میں شائع ہوا۔

توحید،رسالت،کتاب اور دینی زندگی کتاب کے جلی عنوانات ہیں،جن کے تحت انہی کی مناسبت سے

قرآنی آیات اوران کے ترجمہ وتشریح کو الگ الگ جمع کر دیا گیا ہے۔اس کتاب میں قرآنی آیات کے معنی ومفہوم سمجھانے کے لئے جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ مؤلف کی محض ذاتی آراء ہیں،جنہیں مسلمانوں کی اصلاح و دینی خدمت کے مقصد کے تحت لکھا گیا تھا اور تفسیر سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے،جیسا کہ خود مؤلف نے اس کی وضاحت حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

> ''میں نہایت صفائی سے عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ''معارف القرآن'' میں جو کچھ ہے، وہ نہ تفسیر ہے نہ تاویل، بلکہ قرآنی آیات کو سامنے رکھ کر ایک تحریر ہے، جو ہندوستان کے مسلمانوں پر موجودہ حالات کے پیش نظر تیار کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں کہیں کسی قسم کی نہ دقت ہے اور نہ وہ باتیں ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں ہوتی ہیں۔''(27)

البتہ جہاں تک اس کی افادیت واہمیت کا تعلق ہے تو بلاشبہ دینی واصلاحی اعتبار سے قارئین کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

5۔طبقات الحجاج

قاضی اطہر مبارکپوری کی فہرستِ کتب میں شامل ایک کتاب''طبقات الحجاج'' بھی ہے، جسے انجمن خدام النبی ؐ کمیٹی نے 1958ء شائع کیا تھا،اس وقت اس کی ضخامت 195 صفحات تھی۔(28)لیکن فرید بک ڈپو دہلی سے شائع شدہ اس کا جدید ایڈیشن 360 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں مصنف نے عالم اسلام کے مختلف خطوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے 189 علماء،فقہاء اور محدثین کی حیات وخدمات کا سرسری جائزہ لیا ہے اور ضمن میں سفرِ حج سے متعلق حالات وواقعات نقل کر دیئے ہیں، نیز بعض تراجم میں فضائل حج کے دور رس مقاصد بھی اشارۃً بیان کئے ہیں۔آخر کے چند صفحات میں''بنات حرم'' کے عنوان سے 18 خواتین کے احوال وکوائف بھی درج ہیں۔

مصنف کے ذہن میں اس کتاب کو ضابطہ تحریر میں لانے کا خیال حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "**الدر الکامنه فی اعیان المائة الثامنة**" کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔(29)لہٰذا انہوں نے امام موصوف کی مذکورہ کتاب اور بعض دیگر کتابوں کی مدد سے اس موضوع پر سلسلہ وار مضامین تیار کر کے مجلّہ''البلاغ''(اپریل 1956ء تا اپریل 1957ء) میں اسی عنوان سے شائع کئے۔(30)جب یہ مضامین مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی نظر سے گزرے تو ان کی بھی اس موضوع پر لکھنے کی خواہش ہوئی، جسے انہوں نے''اعیان الحجاج'' لکھ کر پورا کیا،اس کی تائید مولانا اعظمی نے خود مقدمۂ کتاب میں کی ہے اور لکھا ہے:

''اس تذکرہ (کتاب اعیان الحجاج) کو لکھنے کا داعیہ تو جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بہت دنوں سے تھا، مگر عزیزم قاضی اطہر مبارکپوری (رکن ادارۂ البلاغ بمبئی) کا ایک سلسلۂ مضامین جس کو انہوں نے البلاغ میں طبقات الحجاج کے عنوان سے شائع کرنا شروع کیا تھا، دیکھ کر یہ داعیہ قوی ہو گیا اور مدتوں کا ارادہ قوت کے فعل میں آیا۔'' (31)

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور قاضی اطہر مبارکپوری دونوں کی کتابیں 1958ء میں ایک ساتھ منصۂ شہود پر آئیں، البتہ ''طبقات الحجاج'' کی بہ نسبت ''اعیان الحجاج'' میں تفصیلات زیادہ ہے، پھر اس میں لوگوں کا تذکرہ ان کے مراتب و مناصب کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے، یعنی پہلے انبیاء کا تذکرہ ہے، پھر صحابہؓ، تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین میں مشہور ائمہ حدیث وفقہ اور بعض صوفیاء کو رکھا گیا ہے، جبکہ قاضی صاحب نے مختلف علوم وفنون کے ائمہ و رجال کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب پر کیا ہے جس میں زمان ومکان کی کوئی قید نہیں ہے، پھر بعض کو چھوڑ کر ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کی ذات ہندوستان کے علمی حلقوں میں غیر معروف رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہندوستان میں مقبول نہ ہو سکی، البتہ اس کے ذریعہ اسلاف کی معتد بہ تعداد کا تعارف ضرور ہوا۔

6۔ علیؓ وحسینؓ

1959ء میں ''خلافتِ معاویہؓ ویزیدؒ'' کے عنوان سے مشہور مصنف ومحقق محمود احمد عباسی کی کتاب منظر عام پر آئی۔ اس وقت کتاب کے موضوعات سے برصغیر کے علمی حلقوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا، جس سے اخبار ورسائل میں اس کی تائید وتردید میں مضامین کا سلسلہ شروع ہوا اور علمائے اہل سنت والجماعت حمایت ومخالفت کے لحاظ سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے۔ حامیوں میں ماہنامہ ''تجلّی'' دیوبند کے مدیر مولانا عامر عثمانی پیش پیش تھے، جبکہ دوسری طرف دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور دارالعلوم دیوبند جیسے علمی ودینی اداروں کے سربراہ اس کے مخالفین میں شامل تھے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کا تعلق بھی اسی گروہِ ثانی سے تھا، دوسرے مخالفین کی طرح انہوں نے بھی روزنامہ ''انقلاب'' میں کتاب ''خلافتِ معاویہؓ ویزیدؒ'' کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی اور صاحبِ کتاب کو ہدفِ تنقید بنایا۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' قاضی اطہر مبارکپوری کے انہی تنقیدی مضامین کا اضافہ شدہ مجموعہ ہے جو عباسی صاحب کی کتاب ''خلافت معاویہؓ ویزید'' کی تردید میں اب سے باسٹھ سال قبل روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی میں 7/ نومبر تا 17/ دسمبر 1959ء میں قسط وار شائع ہوئے تھے، بعد ازاں ان مضامین کو کتابی شکل میں دائرہ ملیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے مارچ 1960ء میں شائع کیا گیا۔ (32) اور دوسری مرتبہ یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی

دہلی سے 2007ء میں طبع ہوئی۔

296 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی رو سے ''خلافت معاویہؓ ویزیدؒ'' ایک فتنہ انگیز کتاب ہے، جس میں عمداً واقعات کو الٹ پھیر کر حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ پر اور یزید کو امام حسینؓ پر فضیلت دی گئی ہے، نیز خلافت کے لئے انہیں دونوں حضرات (حضرت امیر معاویہؓ اور یزیدؒ) کو زیادہ موزوں قرار دیا گیا ہے، اسی طرح امام طبری، مسعودی، ابن کثیر اور جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ علم وفن کی کتبِ تاریخ کو غیر معتمد بتایا گیا ہے، ان کے برعکس ابن خلدون اور امام ابن تیمیہ کو ثقہ مان کر ان کی کتابوں کی عبارتوں کو قطع برید کے ساتھ مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے، جگہ جگہ اشعار وعبارتوں کے ترجمے غلط کئے ہیں اور عبارتوں میں کاٹ چھاٹ کے بعد مفید طلب ٹکڑوں کو نقل کر کے مضر ٹکڑوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' کے صفحہ 17 سے 253 تک یہی ناقدانہ تحریریں شامل ہیں، البتہ جگہ جگہ سیر و احادیث کی کتابوں اور ان ماخذوں سے، کہ جن کی عبارتیں عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے مناقب وفضائل بیان کیے گئے ہیں، آخر کے چند صفحات میں دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے اپنے ترجمان مجلّات میں ''خلافت معاویہؓ ویزید'' کی تردید میں جو مضامین شائع کئے تھے، مصنف نے انہیں اپنی کتاب کی تائید وتوثیق میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس میں انہی ماخذ پر اکتفاء کیا ہے جن پر عباسی صاحب نے اپنی کتاب کی بنیاد رکھی اور ان ہی کے انداز میں ان کی بات کی تردید کی، اس حوالہ سے وہ خود بیان کرتے ہیں:

> ''راقم الحروف نے روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں 7/ نومبر تا 17/ دسمبر 1959ء 35 قسطوں میں اس کی اندرونی خرابیوں کو اجاگر کر کے صحیح باتیں بیان کرنے کی کوشش کی اور صرف انہی کتابوں تک دائرۂ بحث وتبصرہ رکھا جن سے اس کے مؤلف نے قطع وبرید اور خیانت کر کے اپنا ذہنی مطلب نکال کر اسے تحقیق اور ریسرچ بنانا چاہا تھا۔'' (33)

یہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ماہنامہ ''فاران'' کراچی، ہفت روزہ ''صدق جدید'' لکھنؤ جیسے رسائل واخبارات میں اس پر ستائشی کلمات لکھے گئے، خاص طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کے اندازِ تحریر وتحقیق پر گفتگو کرتے ہوئے ماہنامہ ''برہان'' میں لکھا:

> ''عباسی صاحب کی کتاب کے رد میں اب تک جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں، زیرِ تبصرہ کتاب

جامع اور معتدل نقطہ نظر اور سنجیدہ تحقیق وزبان کی حامل ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔" (34)

7۔تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں

130 صفحات کی یہ ایک مختصر کتاب ہے جسے قاضی اطہر مبارکپوری نے 1969ء میں ترتیب دیکر اپنے ایک عزیز مولانا نجم الدین احیائی کے تعاون سے شائع کیا تھا۔

چار جلی عنوانات (مسجدیں، بازار اور دکانیں، مسلمانوں کے مکانات، سفر وحضر اور راستے) پر منقسم اس کتاب میں علمِ دین کی اشاعت وتبلیغ سے متعلق صحابہؓ، تابعینؒ اور سلفِ صالحین کے حالات و واقعات مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کی کتاب "علمائے سلف اور نابینا علماء" کے طرز پر مستند ذرائع سے نقل کیے گئے ہیں، البتہ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں حصول علم کی طلب میں اسلاف نے جو صعوبتیں برداشت کیں ان کا تذکرہ ہے جبکہ دوسری میں انہی اسلاف کے طریقۂ تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔کتاب کی قابلِ ذکر بات اس کے صفحہ 32 تا 36 پر مذکور ایک سوتین اصحابِ صفہ کے وہ اسمائے گرامی ہیں جنہیں مصنف نے مدینہ منورہ کے کتب خانہ "شیخ الاسلام عارف حکمت" سے 1966ء میں نقل کیا تھا۔

اشاعت سے قبل اس کے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" کے بعض شماروں میں قسط وار شائع ہو چکے تھے، بعد میں اس کے کئی نسخے متعدد اداروں سے طبع ہوکر منظر عام پر آئے۔موجودہ نسخہ فرید بک ڈپوئی دہلی نے 2005ء میں شائع کیا تھا۔(35)

8۔مآثر ومعارف

زیرِ تبصرہ کتاب قاضی اطہر مبارکپوری کی اہم ترین تصانیف میں شامل ہے اور ان کے ان علمی وتاریخی مقالات کا منتخب مجموعہ ہے، جو مجلّہ "معارف" اعظم گڑھ اور ماہنامہ "البلاغ" ممبئی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ (36) 1971ء میں یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔

پچیس مقالات کا یہ مجموعہ 371 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے ابتدائی تین مقالات علم حدیث سے متعلق ہیں، جن میں سے پہلے مقالے کا عنوان "تدوین حدیث کے چار ادوار" ہے، اس کے تحت مصنف نے علم حدیث کی تدوین کے چار ادوار متعین کئے ہیں اور صحابہؓ وکبارِ تابعینؒ کے زمانہ کو پہلے دور میں شامل کر کے حدیث اور علم حدیث سے متعلق جو سرگرمیاں اس دور میں جاری تھیں ان کا جائزہ لیا ہے، نیز روایت حدیث کے سلسلہ میں وہ حضرات جو

شدید احتیاط برتتے تھے ان پر خامہ فرسائی کی ہے۔اس کے بعد تقریباًپورے اموی اور ابتدائی عباسی عہد کو دوسرا دور تسلیم کرتے ہوئے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کے جو فرامین جاری کئے تھے ان کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جن کتب حدیث کی تدوین عمل میں آئی، ان کا تعارف کرایا ہے، مزید برآں اس دور کی خصوصیات اور اسلامی قلمرو کے الگ الگ حصوں میں موجود علمائے حدیث کی فہرست بھی بیان کی ہے۔تیسرا دور حدیث کی مستقل تدوین اور اس دور کی تدوینی خصوصیات، صحیح اور غیر صحیح کتابوں کی تدوین کے علاوہ دیگر عناوین پر مشتمل ہے، جبکہ چوتھے دور میں علم حدیث کی تنقیح وتہذیب، چوتھی صدی کی مشہور و جامع کتب احادیث، احادیث کے احکام کی جامع کتابیں، صحت کے اعتبار سے کتب حدیث کی ترتیب وغیرہ عناوین شامل ہیں۔

دوسرے مقالہ ''چند اہم اور مشہور کتب احادیث'' میں قاضی صاحب نے حدیث کی آٹھ مشہور کتابوں کا تعارف اس طور پر کرایا ہے کہ سب سے پہلے مؤطا امام مالک اور مسند احمد ابن حنبل کو رکھا ہے، پھر صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی پر ترتیب وار تبصرہ کیا ہے، کتاب کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ہر کتاب کے ضمن میں اس پر لکھی گئی اہم شروحات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

تیسرا مقالہ ''علوم حدیث'' ہے، جس میں غریب الحدیث، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، ناسخ ومنسوخ، علم تلفیق، علل حدیث، مصطلح حدیث اور تخریج احادیث جیسے اصول حدیث کے فنون کا مختصر تعارف وتذکرہ ہے۔

حدیث کے موضوع پر مذکورہ بالا تین مقالات کے بعد چوتھا مقالہ بعنوان ''اسلامی تعلیم کا مکی مرکز دار ارقم'' ہے۔دار ارقم مکہ کی آبادی سے کچھ فاصلہ پر واقع صحابیٔ رسول حضرت ارقم مخزومیؓ کا دولت کدہ تھا، جسے اسلامی تاریخ میں اولین درسگاہ کی حیثیت حاصل ہے، عہد رسالتؐ سے بیسوی صدی کے درمیان اس گھر کی جو کیفیت رہی ہے، مقالہ نگار نے اس کے تمام تاریخی پہلوؤں پر معلومات فراہم کی ہے۔

پانچویں مقالہ ''مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار'' میں اس طریقۂ تعلیم سے بحث کی گئی ہے جو بعثت نبویؐ کے بعد مکہ میں اور ہجرت کے بعد مدینہ میں رائج تھا۔اور اس زمانہ میں جن مسجدوں اور گھروں میں تحصیل علم کی درسگاہیں قائم تھیں، ان سب کا مختصر تعارف اسلام کے ابتدائی مدارس اور عہد نبویؐ کے نظام تعلیم کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔

اس کتاب کا اگلا مقالہ ''ہر طبقہ وہر پیشہ میں علم اور علماء'' موضوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قاضی صاحب نے اس میں چرواہوں، کسانوں، دست کاروں، پارچہ بافوں، درزیوں، دھوبیوں، لوہاروں اور مزدوروں وغیرہ اکیس پیشوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کر کے ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والے ایسے علماء کا تعارف کرایا ہے

جو بیک وقت تعلیم وتدریس اور کسبِ معاش میں منہمک رہتے تھے اور انہیں ایک چیز دوسرے سے غافل نہیں کرتی تھی۔ یہ مقالہ ان علماء اور طلباء کے لئے مشعلِ راہ ہے جو تعلیم ہی کو ذریعۂ معاش سمجھتے ہیں یا یہ کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی پیشہ اختیار کرنے کو حقیر گردانتے ہیں، نیز اس کے مخاطب وہ لوگ بھی ہیں جو محض ایک خاص طبقہ ہی کو حصول تعلیم کا مستحق مانتے ہیں۔

ساتویں مقالہ ''علمائے اسلام کے القاب وخطابات'' میں عالم، علامہ، قاری، کاتب، مؤدب، منشی، استاذ، ملا، صاحب، جناب اور حضرت جیسے پچیس سے زائد عربی وعجمی القاب وخطابات پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کونسا لقب کب اور کس کے لئے استعمال ہوا، ہرایک کے ضمن میں اس کی توضیح کرتے وقت ان علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے لئے یہ القاب ماضی کے کسی حصہ میں مستعمل ہوئے، اسی طرح اس میں بعض ایسے القاب کا بھی ذکر ہے جو کسی ایک کے ساتھ ہی مخصوص تھے، جیسا کہ ''ترجمان القرآن'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ مخصوص تھا۔

ان سات مقالوں کے بعد اگلے دس مقالات (مقالہ نمبر 8 سے 17 تک) کا تعلق مختلف علوم وفنون کی ان کتابوں سے ہے جو قرونِ اولیٰ میں لکھی گئی۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ان مقالات میں ان کتابوں کا تعارف وتبصرہ پیش کیا ہے۔ ان میں سرِفہرست مقالہ ''امام محمدؒ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ'' ہے۔ یہ کتاب امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد کی تصنیف ہے، جسے حیدرآباد کے ایک علمی ادارہ ''**لجنة احياء المعارف النعمانيه**'' کے ذمہ داران نے تحقیق وتعلیق کے بعد شائع کیا تھا۔ کتاب کا موضوع مدینہ میں قیام کے دوران امام محمد اور اہل مدینہ کے درمیان ہونے والے مباحث ہے جنھیں موصوف نے قلم بند کرلیا تھا۔

اس کے بعد نواں مقالہ بعنوان ''امام محمد کی کتاب الآثار'' ہے۔ پچھلی کتاب کی طرح امام محمد کی یہ کتاب بھی ''**لجنة احياء المعارف النعمانيه**'' حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں امام محمدؒ نے صحابہ کرامؓ کے آثار فقہی ترتیب سے درج کئے ہیں۔

اگلے مقالے کا عنوان ''امام ابوبکر حمیدیؒ کی مسند حمیدی'' ہے۔ یہ کتاب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تعلیق و تحقیق کے بعد 1963ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھی۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس مقالہ میں کتاب پر تبصرہ کے علاوہ صاحبِ کتاب امام ابوبکر حمیدی (م 219ھ) کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

گیارہواں مقالہ ''امام سعید بن منصور خراسانی کی کتاب السنن'' ہے۔ امام ابوعثمان سعید بن منصور خراسانی (م 227ھ) بھی امام ابوبکر حمیدی کی طرح محدثین کے طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی کتاب السنن احادیث

رسولؐ کے ابتدائی سرمایہ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مسند حمیدی کی طرح اس کی طباعت واشاعت بھی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل سے ہوئی۔

بارہویں مقالہ ''فضل اللہ الصمد توضیح الادب المفرد'' میں مصنف نے امام بخاری کی کتاب **''الادب المفرد''** کی شرح ''**فضل الله الصمد توضيح الادب المفرد** '' کا تعارف وتبصرہ پیش کیا ہے، جسے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ایک استاد مولانا فضل اللہ گیلانی نے مرتب کیا تھا۔

تیرہواں مقالہ ''مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا (سورۃ یٰسین)'' خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کے اس مصحف قرآن سے متعلق ہے، جس کی تلاوت کرتے وقت انہوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ زیرنظر مقالہ میں سورۃ یٰسین پر مشتمل اسی مصحف قرآنی کے اس نسخے کا تعارف کرایا گیا ہے، جسے اس کے ناشر شیخ عبداللہ بن الیاس بن احمد شاہ بورغانی قریمیؒ نے انیسویں صدی کے آخر میں پٹرس برگ شہر کے شاہی کتب خانہ سے حیلہ سے حاصل کیا تھا اور قاضی اطہر مبارکپوری کے دوست جناب احمد غریب نے اسے حج کے دوران ایک روسی مہاجر سے خریدا تھا۔ مطبوعہ نسخہ کے آخر میں ناشر نے اس کے حصول اور مصحف عثمانی کی روداد بھی روسی زبان میں شائع کردی تھی، یہ مقالہ اسی روداد کا اردو ترجمہ ہے۔

چودھواں مقالہ ''قاضی رشید بن زبیر غسانی کی کتاب الذخائر والتحف'' ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ایک خط، قاضی صاحب کے مقالہ'' قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری''اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے مقالہ'' الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟'' کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خط اور قاضی صاحب کا مقالہ دسمبر 1960ء میں، جبکہ مولانا اعظمی کا مقالہ فروری 1961ء میں ''معارف'' میں شائع ہوئے تھے۔ **کتاب الذخائر والتحف** عہدِ عباسی کی لکھی ہوئی ایک کتاب ہے جسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے 1959ء میں ایڈٹ کرکے شائع کیا تھا، قاضی صاحب نے اس کتاب کو بنیاد بنا کر ''ہند وعرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات'' کے عنوان سے ایک مقالہ تیار کیا جو اپریل ومئی 1960ء میں معارف میں قسط وار شائع ہوا۔ اس مقالہ میں انہوں نے **کتاب الذخائر والتحف** کے مصنف قاضی رشید بن زبیر کے بارے میں تصریح کی تھی کہ وہ چھٹی صدی ہجری کے عالم تھے، ڈاکٹر صاحب کو ان کی اس بات پر تردد ہوا، کیونکہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں قاضی رشید بن زبیر کے نام سے ایک ہی خاندان میں دادا، باپ اور پوتا تین شخص گزرے تھے، **کتاب الذخائر والتحف** ان میں سے کس کی تصنیف ہے؟ اس سلسلہ میں دونوں کے مابین دسمبر 1960ء کے معارف میں بحث چھڑ گئی، قاضی صاحب نے اپنے مقالہ '' قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری'' میں یہ تحقیق پیش کی کہ یہ پوتے کی کتاب ہے، جن کا تعلق چھٹی صدی

ہجری سے تھا، جبکہ ڈاکٹر صاحب کا اپنے مکتوب میں خیال تھا یہ پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی تصنیف ہے اوران کا زمانہ پانچویں صدی ہجری ہے۔ بعد ازاں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مذکورہ بالا اپنا مقالہ محاکمہ کے طور پر پیش کیا، جس میں انہوں نے دونوں محققین کے دلائل کو سامنے رکھا اور فیصلہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں کرتے ہوئے **کتاب الذخائر و التحف** کو دادا کی تصنیف قرار دیا۔

اس کے بعد کے تین مقالات (یعنی پندرہواں، سولہواں اور سترہواں مقالہ) میں الگ الگ فنون کی تین کتابوں پر تعارف وتبصرہ ہے۔ پہلی علم اللغۃ پر امام ابوبکر بن قاسم انباریؒ (م 327ھ یا 328ھ) کی ''**کتاب الاضداد فی اللغة**''ہے، دوسری ادب کے موضوع پر ابواحمد عسکریؒ (متوفی چوتھی صدی ہجری) کی ''**کتاب المصون فی الادب**''ہے، اور تیسری کتاب ''**تحقیق النصرة بتلخیص معالم دار الهجرة**'' مدینہ منورہ کی تاریخ پر امام ابوبکر مراغی کی تصنیف ہے۔

ان تین کتابوں کے تعارفی تبصرے کے بعد اگلا مقالہ ''المنجد پر ایک تنقیدی نظر'' ہے۔ 1956ء میں عربی کی مشہور لغت المنجد کا جدید ایڈیشن'' **المنجد فی الآداب والعلوم** '' کے عنوان سے شائع ہوا، یہ لغت بیروت کے ایک عیسائی عالم فردنیان توتل نے مرتب کی تھی، کتاب مفید تھی لیکن اس میں بعض الفاظ وواقعات مثلاً آدم، اہل کتاب، بحیرا راہب، براق، خضر اور دارالاسلام وغیرہ کی تعریف وتشریح مصنف نے عیسائیت کے نقطۂ نظر سے کی تھی، اس لئے قاضی صاحب نے کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس میں موجود بعض غلطیوں کی نشاندہی کر کے'' المنجد کی غلطیاں اور افتراء پردازیاں'' کے عنوان سے یہ مقالہ لکھ کر اکتوبر 1956ء کے ''البلاغ'' میں شائع کیا۔ زیر نظر مقالہ میں اپنے مضمون کے علاوہ انہوں نے ایک مصری عالم عبد الستار احمد فراج کا اسی موضوع پر تنقیدی مضمون ''**المنجد معجم فی اللغة، نقد له لا مضر منه**'' بھی شامل کیا ہے۔

انیسویں مقالہ کا عنوان ''استشراق اور مستشرقین'' ہے۔ مقالہ نگار نے اس میں موضوع کی سرسری تاریخ بیان کی ہے، البتہ اس کے بعد والے مقالے ''ہنگری کے مستشرقین اور ان کے علمی کارنامے'' میں تفصیلات تھوڑی زیادہ ہے، جس میں ہنگری اور اس کے باشندوں کی تاریخ کے بعد وہاں کے چوبیس مستشرقین اور ان کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے، نیز مشہور مستشرق گولڈزیہر اور ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کے حالات وخدمات ذرا تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

اکیسواں مقالہ ''اسپین میں امام ابن حزمؒ کی نو سو سالہ یادگار تقریب'' ہے۔ یہ تقریب مئی 1963ء میں امام ابن حزمؒ کے وطن قرطبہ میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی۔ مقالہ میں پہلے امام ابن حزم کا تعارف، پھر

جشن کی روداد بیان کی گئی ہیں، جس میں امام موصوف پر مقالات پیش کرنے والے حضرات کے ناموں کی فہرست مقالات کے عناوین کے ساتھ درج ہے۔

بائیسواں مقالہ ''فرقۂ یزیدیہ'' ہے، اس فرقے کا تعلق عراق کے سرحدی اور پہاڑی علاقوں میں آباد ایک ایسی قوم سے ہے جس کے عقائد نہ تو اسلامی ہیں اور نہ دنیا کی کسی دوسرے مذہب سے ملتے جلتے ہیں، پھر مقالہ کی رو سے ان کے بارے میں لوگوں کی آراء بھی مختلف ہیں، بعض انھیں مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں اور بعض نہیں، خود اس فرقے کے مذہبی رہنما بھی پس وپیش میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا تیئیسواں مقالہ ''فرقہ صابئہ کی ایک شاخ'' ہے۔ یہ مقالہ عراق ہی میں دجلہ وفرات کے دوآبہ کے متصل آباد ایک قوم سے متعلق ہے، جو 'ماندی' کہلاتی ہے اور مقالہ نگار نے انہیں کواکب پرستی کی بنیاد پر فرقہ صابئہ کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

کتاب کا چوبیسواں مقالہ ''خانوادۂ نائبین قضاۃ مبارک پور'' خود مقالہ نگار کے اپنے خاندان کی تاریخ ہے۔ اس میں انہوں نے خاندان کے ان بزرگوں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو برطانوی عہد کے ابتدائی دور میں دارالقضاء محمد آباد کی طرف سے مبارک پور میں نیابت قضاء کے عہدے پر فائز تھے، ان برگزیدہ ہستیوں میں شیخ علی شہید، شیخ امام بخش بن شیخ علی، شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش، شیخ حسام الدین بن شیخ امام بخش اور شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا شامل ہیں۔ شیخ محمد رجب، جن کے بیٹے حاجی لعل محمد قاضی اطہر مبارکپوری کے حقیقی دادا تھے، مبارک پور کے آخری قاضی تھے، ان کے زمانہ میں انگریزوں نے سابقہ نظم ونسق منسوخ کر دیا تھا۔

اس کتاب کا آخری مقالہ '**لجنة احياء المعارف النعمانيه**'' ہے۔ یہ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی طرز کا ایک علمی ادارہ تھا، جسے اس کے سرپرست مولانا ابوالوفا افغانی نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ مل کر ائمہ احناف کی امہات الکتب شائع کرنے کے لئے 1929ء میں شہر حیدرآباد میں قائم کیا تھا۔ زیرنظر مقالہ میں قاضی صاحب نے اس ادارہ کے اغراض ومقاصد اور اس سے شائع ہونے والی تیرہ کتابوں کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔

9۔ تذکرہ علمائے مبارک پور

عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر نو کتابوں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری نے دو کتابیں اپنے وطن اور اس کے اطراف وجوانب کی علمی تاریخ پر بھی رقم کی تھیں، جن میں سے ایک زیر بحث کتاب ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' ہے۔ موصوف خطۂ اعظم گڑھ کے علماء وفضلاء کے احوال وکوائف پر ایک ضخیم کتاب لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ''تذکرہ مشاہیر اعظم گڑھ ومبارک پور'' کے عنوان سے اچھا خاصا مسودہ بھی تیار کر چکے تھے، مگر وقت کی قلت

اور دوسری مصروفیات کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے وطن مولد مبارک پور پر ہی اکتفاء کیا اور پچیس سال کے عرصہ میں یہ کتاب ترتیب دی، جو پہلی مرتبہ دائرہ ملیہ مبارک پور سے 1974ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ 368 صفحات پر مشتمل اس کا پیش نظر نسخہ مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن سے 2010ء میں شائع ہوا تھا۔

مصنف نے اس کی جمع وتدوین کا کام 1948ء میں ہفت روزہ اخبار ''انصار'' کی ادارت کے دوران بہرائچ میں شروع کیا تھا۔(37) ان کے ذہن میں اس کی تالیف کا خیال ''حیات شبلی'' کی مندرجہ ذیل عبارت سے پیدا ہوا، جس میں کہ سید سلیمان ندوی نے مبارک پور کے تعارف میں فقط اتنا لکھا ہے:

''محمد آباد کے قریب مبارک پور نامی بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔''(38)

قاضی اطہر مبارکپوری نے جب سید صاحب کے اس اجمال پر نظر ڈالی تو انہیں اپنی خاک کے ذرّوں میں کئی آفتاب و ماہتاب نظر آئے، جنہیں روشن کرنے کے لئے انہوں نے اس کتاب کی طرح ڈالی، کیونکہ مبارک پور کے بالمقابل اعظم گڑھ کے دوسرے قصبات کا تعارف حیات شبلی میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس حوالہ سے مولانا ابوعلی اپنے ایک مضمون میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک تقریب کے موقع پر یہاں (مبارک پور) کے مشہور عالم، قومی رہنما، مدرسہ احیاء العلوم کے فعال ناظم مولانا عبدالباری قاسمی اور ان کے احباب سے نیاز حاصل ہوا، ان احباب میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی بھی تھے، جو اس وقت کسی اور نام سے یاد کئے جاتے تھے اور جن سے میری کوئی جان پہچان نہیں تھی، مولانا عبدالباری نے بڑی بلند آہنگی سے فرمایا کہ آپ کے یہاں سے ابھی ابھی حیات شبلی شائع ہوئی ہے اس میں سید صاحب نے مبارک پور کا ذکر کرنے میں بڑے اجمال سے کام لیا ہے، اس میں موصوف نے نہ یہاں کے گذشتہ علماء و فضلاء اور ارباب درس وتدریس کا ذکر کیا ہے اور نہ اس قصبہ نے مدارس کے ذریعہ علوم عربیہ کی نشر واشاعت اور درس وتدریس کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے۔ سید صاحب کے اس اغماض سے ہم کو سخت رنج ہے حالانکہ ہمارا یہ صنعتی و تعلیمی قصبہ شہر اعظم گڑھ سے، جو سید صاحب کا مستقر ہے، سب سے زیادہ قریب تر ہے اور انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ انشاء اللہ اس کمی کو ہمارے یہ نوجوان (یعنی مولانا قاضی اطہر صاحب) پورا کریں گے، مجھے ان کی زبان سے یہ ادعا سن کر حیرت ہوئی۔''(39)

بہر حال اس کتاب کے شروع میں مصنف نے پہلے قصبہ مبارک پور اور اس کی نواحی بستیوں کی ساڑھے

چار سو سالہ سیاسی، سماجی، علمی و دینی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، بعدازاں اس سے تعلق رکھنے والے ڈیڑھ سو کے قریب مشائخ و بزرگانِ دین، علماء، فقہاء و محدثین، شعراء و ادباء اور اربابِ علم و فضل کے حالات و واقعات مسلک کی تفریق کئے بغیر پوری دیانت داری کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔

مصنف نے کتاب کی تالیف کے لئے معلومات حاصل کرنے اور حقائق کی تلاش و جستجو میں بڑی محنت و مشقت سے کام لیا ہے، تراجم کتب کے حوالہ سے پاپیادہ دور و نزدیک کے سفر کیے، اہلِ علم سے رابطہ رکھا اور متعلقین کے اہلِ خانہ اور واقف کاروں سے ملاقاتوں کے بعد جو کچھ معلومات انہیں حاصل ہوئی اس کی مدد سے قصبہ کی ساڑھے چار سو سالہ اجمالی تاریخ کا خاکہ ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' کی شکل میں مرتب کر دیا۔(40)

10۔آثار و اخبار

سابقہ کتاب ''مآثر و معارف'' کی طرح قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب بھی ماہنامہ ''البلاغ'' اور مجلّہ ''معارف'' میں شائع ہونے والے دس مقالات کا مجموعہ ہے، جسے انہوں نے 1984ء میں مرتب کیا تھا۔(41) دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی پہلی جلد، جس میں چار مقالات ہیں، ندوۃ المصنفین دہلی سے 1988ء میں شائع ہوئی تھی، جبکہ دوسری جلد منظرِ اشاعت ہی رہی اور اب تک منصۂ شہود پر نہ آسکی۔

اس پہلی جلد کی ضخامت 150 صفحات ہے، اس کے ابتدائی تین مقالات کا تعلق قدیم دور میں عرب کے مختلف شہروں میں آباد ہندی الاصل خانوادوں سے ہے، جن میں نسل در نسل کئی اساطین علم و فن پیدا ہوئے اور اپنی مسند درس سے علمی محفلوں کو چار چاند لگایا۔ آخری مقالہ امام ابوالحسن مدائنی کی حیات و خدمات پر ہے، جنہوں نے اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ پر تین مستقل تصانیف تحریر کی تھیں۔ چاروں مقالات کی اجمالی تفصیلات حسب ذیل ہے۔

پہلے مقالہ ''آل عبدالرحمٰن بیلمانی'' میں گجرات کے ساحلی شہر بھیلمان سے تعلق رکھنے والے خانوادے کا ذکر ہے، جو سالوں پہلے یمن کے علاقہ نجران میں آباد ہوگیا تھا۔ اس خانوادہ کے جد امجد عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی حضرت عمرؓ کے غلاموں میں سے تھے اور اپنے وقت کے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے لیکن محدثین نے ان کے ثقہ راوی ہونے میں کلام کیا ہے، یہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں فوت ہوئے تھے، ان کے صاحب زادے محمد بن عبد الرحمٰن بیلمانی کوفی علمائے نحو میں سے تھے، قاضی صاحب نے مقالہ میں دونوں کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں، ان کے بعد اختصار کے ساتھ حارث بیلمانی، محمد بن حارث بیلمانی اور محمد بن ابراہیم بیلمانی کا تذکرہ ہے۔

دوسرے مقالہ کا عنوان ''آل ابو معشر سندی'' ہے۔ سابقہ خانوادہ کی طرح اس کے افراد بھی طبقۂ غلاموں

میں سے تھے۔اس گھرانہ میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی (م 170ھ) کو خاص مقام ومرتبہ حاصل تھا، انہوں نے پوری زندگی مدینہ منورہ میں بسر کی اور عمر کے آخری حصہ میں خلیفہ مہدی کے ایماء پر بغداد چلے گئے، فن سیرومغازی پر ان کی ''**کتاب المغازی**'' اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس مقالہ کے اکثر صفحات انہی کے بارے میں ہیں، البتہ آخر کے چند صفحات میں ان کے بیٹے محمد بن ابومعشر سندی بغدادی اور دو پوتوں حسین بن محمد بن ابومعشر اور داؤد بن محمد بن ابومعشر کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔

تیسرے مقالہ'' آل مقسم قیقانی'' میں مذکور خانوادہ کا تعلق موجودہ افغانستان و پاکستان کے سرحدی علاقہ قلات ڈویژن سے ہے، عہد قدیم میں یہاں کیگان نامی شہر تھا، جسے اہل عرب قیقان کہتے تھے۔حضرت علیؓ یا امیر معاویہؓ کے زمانہ میں اس خاندان کے فرد اول مقسم کو اسیری کی حالت میں کوفہ لے جایا گیا، جہاں ان کی نشونما اور پرورش ہوئی، ان کے بیٹے ابراہیم نے بصرہ کی ایک آزاد عورت علیہ سے نکاح کیا، جس کے بطن سے ابراہیم کے تین بیٹے اسمعیل، ربعی اور اسحٰق پیدا ہوئے، ان میں اسمعیل کو علم وفضل کی بدولت بڑی شہرت ملی اور حدیث کے بڑے امام تصور کئے گئے، نیز ماں کی نسبت سے ''ابن علیہ'' کے لقب سے مشہور ہوئے، مقالہ میں انہی کے حالات قدرے تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، جبکہ ان کے والد، دادا، دونوں بھائیوں اور دو صاحب زادوں حماد اور محمد کا تعارف بہت مختصر ہے۔

ان تین علمی خانوادوں کے تذکرہ کے بعد چوتھا اور آخری مقالہ امام ابوالحسن علی بن محمد مدائنی (م 225ھ) کے حالات زندگی پر منحصر ہے۔یہ بصرہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے، بعد ازاں کچھ عرصہ مدائن میں مقیم رہے اور آخر میں بغداد منتقل ہوکر وہیں سپرد خاک ہوئے۔مختلف علوم وفنون پر دوسو سے زائد انہوں نے کتابیں لکھیں جو دست برد زمانہ ہوگئیں، انہی میں اسلامی ہند کی تاریخ پر مستقل تین کتابیں(**کتاب ثغر الهند**، **کتاب عمال الهند**، **کتاب فتح مکران**) بھی شامل تھیں، جن کے باعث قاضی صاحب نے یہ مقالہ تحریر کرکے موصوف کو اسلامی ہند کا اولین مؤرخ قرار دیا ہے۔

11۔اسلامی شادی

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں شامل اصلاحی نوعیت کا یہ ایک مختصر کتابچہ ہے، جو 1986ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔اس کے اقتباسات انہوں نے ممبئی میں قیام کے شروعاتی دنوں میں احادیث کی مختلف کتابوں سے اخذ کئے تھے، بعد میں جب انہیں موقع ملا تو انہی اقتباسات میں سے ازدواجی زندگی سے متعلق مضامین میں حذف و اضافہ اور کچھ ترمیم کرکے انہوں نے یہ کتابچہ ترتیب دیا۔(42)

اس کتابچہ میں انہوں نے نکاح کی ترغیب، ضرورت واہمیت، شرائطِ نکاح، نکاح سے پہلے دیکھ لینا، لڑکی کی رضامندی، صلاح ومشورہ، پسند ناپسند کا حق، رخصتی، جہیز، حق مہر اور دعوت ولیمہ جیسے عناوین قائم کرکے شادی بیاہ، زوجین کے حقوق اور ازدواجی زندگی سے متعلق احادیث نبویؐ، آثار صحابہؓ اور سلفِ صالحین کے واقعات بغیر کسی تبصرے کے نقل کردیے ہے، مثلاً ایک مقام پر ''لڑکی کی رضامندی'' کے ضمن میں کتاب ''**المجلّی**'' سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی لڑکیوں کے نکاح کے لئے ان سے مشورہ لیتے تھے۔'' (43)

اسی طرح رخصتی کے وقت حضرت فاطمہؓ اور ان کے جہیز کی کیفیت ایک انصاری کی زبانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''ایک انصاری کا بیان ہے کہ میری نانی حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھیں، ان کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے وقت ان کے جسم پر دو پرانی چادریں اور دو چاندی کے کنگن تھے، جو زعفران میں رنگے ہوئے تھے۔ جب ہم حضرت فاطمہ کو لیکر حضرت علیؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ایک چبوترہ پر ایک بکری کی کھال اور کھجور کے ریشہ سے بھرا ہوا ایک تکیہ، ایک مشک، ایک چھلنی، ایک تولیہ اور ایک بڑا پیالہ رکھا ہوا ہے۔'' (44)

یہ کتابچہ مختلف کتب خانوں سے کئی مرتبہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ 56 صفحات پر مشتمل پیشِ نظر نسخہ فرید بک ڈپو، نئی دہلی سے 2005ء میں شائع ہوا تھا، جس میں مؤلف کے دیباچہ کے ساتھ اصل کتابچہ کی ابتدا صفحہ 20 سے ہوتی ہے جبکہ شروع کے 19 صفحات میں مؤلف کے حالاتِ زندگی مذکور ہیں۔ اس طرح اصل کتابچہ محض 37 صفحات پر مبنی ہے، جس کا مقصد شادی بیاہ کے تعلق سے مسلم معاشرے میں پھیلی برائیوں کا ازالہ کرنا ہے۔

12۔ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

قاضی اطہر مبارکپوری کی فہرستِ کتب میں شامل ایک نام ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کا بھی ہے۔ یہ مختصر سا کتابچہ درحقیقت ان کی خودنوشت سوانح ہے، جس میں انہوں نے اپنی پیدائش سے لے کر تعلیم سے فراغت تک کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ فروری، مارچ 1979ء میں ماہنامہ ''البلاغ'' میں قسط وار شائع ہونے کے بعد یہ کتابچہ پہلی مرتبہ 1987ء میں دائرہ ملیہ مبارک پور، اعظم گڑھ سے چھپ کر منظر عام پر آیا، بعدازاں اس کے کئی ایڈیشن دوسرے مقامات سے بھی شائع ہوئے۔ (45) پیشِ نظر نسخہ مکتبہ صوت القرآن دیوبند کا شائع کردہ ہے۔

یہ ایک ذہن ساز کتابچہ ہے، جسے اس کے مصنف نے مدارس و جامعات کے ان طلبہ کے لئے لکھا ہے جو دوران تعلیم پڑھائی سے اکتا جاتے ہیں یا فراغت کے بعد جب انہیں روشن مستقبل کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تو مایوس و نا امید ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، چنانچہ پیش لفظ میں وہ اس کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خود اعتمادی اور خود سازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن و ماغ لیکر دار العلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تا کہ وہاں بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں مگر عام طور سے ان کو اپنے مقصد میں نا کام ہونے کے ساتھ اپنی بدنامی اور نالائقی کی سند ملتی ہے۔''

اور آگے بیان کرتے ہیں:

''ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لیکر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدو جہد کرنی چاہیے، میں نے اپنے طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خودنمائی کے لئے نہیں لکھی ہے، عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطۂ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔''(46)

مصنف نے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس میں واقعات نقل کرتے وقت اکثر مقامات پر والہانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، تا کہ پڑھنے والے اس کے سبق آموز واقعات سے عبرت حاصل کرسکیں۔

13۔ائمہ اربعہؒ

قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے ائمہ متبوعین (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کی مختصر حیات وخدمات پر یہ کتاب اردو زبان میں بیش بہا اضافہ ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے اس موضوع پر ماہنامہ ''قائد'' مراد آباد میں شائع ہونے والے اپنے مضامین کی مدد سے سوا سو صفحات کی ایک کتاب مرتب کی تھی، لیکن درمیان میں حائل کئی مشکلات کے سبب اس کا مسودہ ضائع ہو گیا، نصف صدی کے بعد انہوں نے اس کی تلافی یہ کتاب لکھ کر کی۔ اس کتاب سے متعلق واقعہ کی تفصیلی روداد قاضی صاحب نے ''کاروان حیات'' میں بیان کی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''ایک اور کتاب ائمہ اربعہ کے نام سے لکھی، جس کی بنیاد رسالہ قائد مراد آباد میں زمانۂ طالب علمی میں پڑی تھی، مرکز تنظیم اہل سنت نے اس کی کتابت کرائی، اس درمیان میں ملک تقسیم ہوا، میں اس سے پہلے وطن آ گیا تھا، کتابت شدہ کاپی میرے پاس مبارک پور ڈاک سے آئی، اس وقت ملک تقسیم ہوئے ہفتہ دو ہفتہ گزر رہا تھا اور پورا ملک خون اور آگ میں جل رہا تھا، میں نے اس حالت میں رجسٹری کے

ذریعہ تصحیح کے بعد روانہ کی جس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ پہنچی بھی یا نہیں، اس کی اصل میرے پاس تھی، بمبئی گیا تو سلطان پریس بھنڈی بازار کو دیا، اس کے مالک سلطان احمد مشرقی پاکستان چلے گئے اور اس کا پتہ نہ چلا، بعد میں اس کی تلافی ائمہ اربعہ لکھ کر کی، جس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے 1409ھ / مطابق 1989ء میں شائع کیا۔" (47)

پانچ جلی عنوانات پر مشتمل 256 صفحات کی یہ کتاب اس وقت شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی اشاعتی سرگرمیوں کا حصہ ہے۔ پہلا عنوان مقدمۂ کتاب کے نام سے موسوم ہے، جس میں عہدِ صحابہؓ و تابعین میں اسلامی فقہ کی تدوین و ترویج کی تاریخ بیان کرنے کے بعد بالترتیب اہل سنت والجماعت کے چاروں مسالک کا تعارف کرایا گیا ہے اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں دنیا کے کس حصہ میں کس مسلک کے کتنے پیروکار ہیں، اس کے اعداد و شمار سے بحث کی گئی ہے۔ بقیہ عناوین میں ان چاروں محسنین ملّت کی مختصر سوانح عمری، ان کے علمی کارنامے، شیوخ و اساتذہ کے تذکرے اور دیگر معلومات و مضامین معتبر تاریخی مآخذ سے نقل کر کے قلم بند کیے گئے ہیں۔

14۔ دیارِ پورب میں علم اور علماء

قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنے وطن اور اس کے اطراف و جوانب کی علمی تاریخ پر مبنی جو دو کتابیں رقم کی تھیں، زیر تبصرہ کتاب "دیار پورب میں علم اور علماء" انہی میں سے ایک ہے، جو پہلی دفعہ 1979ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے 482 صفحات میں شائع ہوئی۔ اس کا جدید ایڈیشن 2020ء میں البلاغ پبلیکیشنز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

مصنف نے اس میں مشرقی اتر پردیش یعنی الہ آباد، جون پور، غازی پور، اعظم گڑھ، فیض آباد، سلطان پور اور ان کے اطراف و جوانب کے علماء و فضلاء کی علمی تاریخ بیان کی ہے۔ عہد وسطیٰ میں یہ علاقہ، جس کے حدود کانپور و لکھنؤ سے لیکر موجودہ بہار تک وسیع تھے، پورب کے نام سے موسوم تھا، اس لئے مصنف نے کتاب کے لئے بھی یہی لفظ اختیار کیا، جیسا کہ وہ خود اس کی بابت مقدمۂ کتاب میں تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ اور صوبۂ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے تھے۔ ہر صوبہ میں دارالامارت، ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر، ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے۔ ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں تھے، جن میں عالیشان عمارتیں، شرفاء کے محلات، علماء، مشائخ مختلف قسم کے پیشہ ور، مدارس اور مساجد تھیں، جو جمعہ و جماعت سے معمور رہتی تھیں، اسی ملک کو ہم دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں۔" (48)

پیش نظر کتاب نو ابواب میں منقسم ہے، جس کے پہلے باب "دیار پورب کے چار علمی ادوار" میں مصنف

نے چار الگ الگ عناوین کے تحت اس علاقہ کی سات سوسالہ (چھٹی صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک) علمی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور علماء ومشائخ سے حکومت کے جو تعلقات استوار تھے ان پر واضح طور پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد بقیہ ابواب میں حسب ذیل علماء ومشائخ کے تذکرے لکھے ہیں:

1۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ (م849ھ)

2۔ حضرت راجہ سید حامد شاہ مانکپوریؒ (م901ھ)

3۔ میر علی عاشقان سرائمیریؒ (م950ھ)

4۔ ملا محمود جونپوریؒ (م1062ھ)

5۔ مولانا حافظ امان اللہ بنارسیؒ (م1133ھ)

6۔ مولانا شیخ غلام نقشبند گھوسویؒ (م1126ھ)

7۔ مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ (م1178ھ)

8۔ مولوی حسن علی ماہلیؒ (م1258ھ)

مصنف نے ان علماء ومشائخ کا تعارف اس دیار کے مشہور علمی ودینی خانوادوں کے سربراہ کی حیثیت سے کرایا ہے اور ضمن میں ہر خانوادے کے علماء، فضلاء، اساتذہ وتلامذہ اور معاصرین ومتعلقین کے حالات اس طور پر قلم بند کیے ہیں کہ اس دیار کا علمی ودینی ماحول سامنے آگیا ہے، جو سات سوسالہ تاریخ کی عکاسی کرتا ہے۔

علمائے پورب پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، جسے انہوں نے سابقہ پچاس سے زائد کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اشاعت سے قبل اس کے جملہ مضامین ماہنامہ "البلاغ" ممبئی اور مجلّہ "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہو چکے تھے۔

بہر حال کتاب کے توسط سے قاضی صاحب علمی حلقوں میں اس علاقہ کے علماء وفضلاء کے تذکرہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر ایک اہم ماخذ قرار پائی۔

15۔ تدوین سیر ومغازی

320 صفحات پر مشتمل قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو زبان میں اولین کتاب ہے، جس کی اشاعت شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے 1990ء میں عمل میں آئی اور آج بھی اس ادارہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا حصہ ہے۔

سیر ومغازی کے موضوع پر اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی نے قلم اٹھایا اور ''سیرت النبیؐ'' کے مقدمہ میں اس کے ابتدائی ماٰخذ سے بحث کی۔ان کے بعد محمد بن عمر واقدی کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر لکھا،مگر یہ دونوں مضمون ہیں نہ کہ مستقل تصانیف۔ان کے علاوہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ایک عرب مصنف حسین نصار کی کتاب'' **المغازی الاولیٰ و مؤلفوها** '' کا اردو میں ترجمہ''سیرت نبوی کی اوّلین کتابیں اور ان کے مؤلفین'' کے عنوان سے کیا۔اس کتاب کے اصل کے اصل مصنف ایک جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ھورووتس تھے،جنہوں نے اسے جرمن زبان میں لکھا تھا،اسی کا اردو ترجمہ قاضی صاحب کے زیرِ مطالعہ تھا جو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے بقول زیرِ تبصرہ کتاب''تدوین وسیر ومغازی'' کی تالیف کا سبب بنا۔(49) مختلف کاموں میں مصروفیت کے باعث قاضی صاحب نے اسے آٹھ سال کے عرصہ میں مکمل کیا،اس کی اشاعت سے قبل اس موضوع پر ان کا ایک مقالہ بعنوان''امام ابو معشر سندی صاحب المغازی'' مجلّہ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔بابِ اوّل''سیر ومغازی تدوین سے پہلے'' کے تحت مصنف نے سیر و مغازی کے معنیٰ ومفہوم،علمِ حدیث سے اس کا تعلق،مغازی کے خصوصی راوی اور رسول اللہؐ وصحابہؓ کے عہد میں اس موضوع سے متعلق مسلم معاشرے میں رائج مختلف طریقوں کا جائزہ لیا ہے۔اس زمانہ میں فن سیر ومغازی کی جو کیفیت تھی،قاضی صاحب ایک جگہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں سیر ومغازی کا تذکرہ مسلمانوں کا محبوب مشغلہ تھا اور وہ طرح طرح سے اٹھتے بیٹھتے،چلتے پھرتے،باتوں بات میں،عمومی اور خصوصی مجلسوں میں،مسجدوں میں باہمی ملاقاتوں میں،میدان جہاد میں ان کا مذاکرہ کرتے تھے،غزوات کے مقامات ومشاہد اور مقابر کی زیارت کرتے اور ان کے متعلق واقعات معلوم کرتے تھے،بعض اوقات اس سلسلہ میں سفر بھی کرتے تھے،اسی کے ساتھ فن مغازی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے لئے خصوصی درسگاہیں تھیں،جن میں اہل علم ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے،اور دینی علوم کے مرکزی مقامات مثلاً مدینہ منوّرہ،مکہ مکرمہ،بصرہ،کوفہ اور شام وغیرہ میں مغازی کا عام چرچا تھا اور مدینہ مدرسۃ المغازی تھا،اس کے علاوہ دور دراز مقامات وقبائل کے صحابہؓ اور مجاہدین اپنے اپنے حلقہ میں غزوات وسرایا کا تذکرہ موقع ومحل کی مناسبت سے کیا کرتے تھے اور مقامی لوگ اپنی قدیم روایات کے مطابق اپنے بزرگوں کے معرکوں کے واقعات نہایت ذوق وشوق سے سنتے اور یاد کرتے تھے۔''(50)

باب دوم''سیر ومغازی کا تحریری سرمایہ'' کے تحت قرآن حکیم کو اس فن کا اولین ماخذ قرار دے کر عہد صدیقی

میں اس کے جمع وتدوین کی تاریخ بیان کی گئی ہے، ساتھ ہی مکاتیب وخطوط اور معاہدات کی شکل میں ان تحریری سرمایوں کو بھی پیش کیا گیا ہے جو آپؐ نے مختلف مواقع پر صحابہ کرامؓ سے تحریر کروائے تھے اور محدثین نے احادیث کی کتابوں میں انہیں محفوظ کر لیا تھا۔

باب سوم ''تدوین سیر ومغازی کی ابتدا پہلی صدی کے نصف آخر میں'' میں مصنف نے مدینہ منورہ کو دو ادوار میں تقسیم کر کے اسے فن سیر ومغازی کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور یہاں کے تین علماء عروۃ بن زبیر، ابان بن عثمان اموی اور محمد بن شہاب زہری کو اس فن کا موجد بتایا ہے، کیونکہ انہوں نے ہی ''**کتاب المغازی** '' کے عنوان سے سب سے پہلے کتابیں لکھ کر اس فن کی بنیاد رکھی، پھر معاصرین میں سے جعفر بن محمد انصاری، عبداللہ بن ابوبکر بن حزم ،محمد بن سعد بن ابی وقاصؓ، علی بن حسین بن علیؓ وغیرہ نے ان کی پیروی میں اسی موضوع پر اپنی اپنی ''**کتاب المغازی** ''تحریر کیں، ان تمام اساطین علم وفن کا تعلق پہلے دور سے ہے۔ دوسرے دور میں انہی میں سے بعض کے ان چودہ تلامذہ کے حالات نقل کیے ہیں، جنہوں نے ''**کتاب المغازی** '' لکھ کر اس فن میں مزید اضافہ کیا، البتہ ان میں محمد بن اسحٰق، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی اور محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی ہی کو زیادہ شہرت ملی اور بعد والوں کے لئے مرجع قرار پائیں۔

باب چہارم ''مختلف شہروں کے علمائے سیر ومغازی اور مصنفین'' کے تحت کوفہ، بصرہ، بغداد، رے، مرو، بیہق، نیشاپور، دمشق اور صنعان ومصر کے ان 44 علما کے حالات اختصار کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں جنہوں نے پہلی سے تیسری صدی ہجری کے درمیان اس فن میں دلچسپی لیکر بیش قیمت لٹریچر تیار کیا، مگر ان میں سے بصرہ کے عبد الملک بن ہشام حمیری اور محمد بن سعد کی کتابیں ہی زمانہ کی ستم ظریفی سے محفوظ رہیں۔

باب پنجم ''سیر کی فقہی تدوین'' میں مصنف نے سیر ومغازی کی ان پندرہ کتابوں پر تبصرہ کیا ہے، جو فقہی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں، ان میں امام مالک کی الموطّا، امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر ،امام شافعی کی کتاب الام اور واقدی کی کتاب السیر معروف ومشہور ہیں۔

ان جملہ تصانیف سے عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں بعد کے علماء نے استفادہ کیا اور حالات وزمانہ کے مطابق سیرت کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ہندوستان میں بھی اس موضوع پر عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں تیار کی گئیں جن کا مرجع قرنِ اول کے متذکرہ بالا مصنفین کی کتابیں تھیں۔ شروع میں عہدِ نبویؐ کے جنگی میدان ہی اس فن کا حصہ تھے، بعد میں اس زمانہ کے عام حالات وواقعات کو بھی شامل کر کے سیرت کی کتابوں میں جگہ دی گئی

اور جب حدیث وفقہ جیسے دوسرے علوم وفنون پر کتابیں لکھی گئیں تو اس میں بھی توسیع ہوئی اور سیرت کا مفہوم صرف آپؐ کی حیات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب میں پہلی صدی سے تیسری صدی ہجری تک سیر ومغازی کی تدوین کے سلسلہ میں کی گئی خدمات کی ایک نہایت معتبر اور زرّیں تاریخ مرتب کی ہے، جس میں موضوع کے تمام گوشوں کا احاطہ کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہدِ تدوین سے قبل ان کاموں کی تاریخی حفاظت کا نظم ونسق کیا تھا اور عہدِ تدوین میں کس طرح یہ کارنامے انجام دیے گئے۔

16۔ خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم وتربیت

قاضی اطہر مبارکپوری نے علمی موضوعات پر جو چند کتابیں تحریر کیں، زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ 392 صفحات کی یہ کتاب 1995ء میں شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند سے شائع ہوئی۔

زمانۂ رسالت اور عہدِ صحابہؓ وتابعینؒ میں رائج نظامِ تعلیم وتربیت کتاب کا موضوع ہے۔ مصنف نے اس موضوع پر بہت پہلے معلومات جمع کی تھیں اور اس میں شامل ان کے دو مضامین ''اسلامی تعلیم کا مرکز دارِ ارقم'' اور ''مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار''، جو کتاب ''مآثر ومعارف'' میں بھی موجود ہیں، ماہنامہ ''البلاغ'' میں پہلے ہی شائع ہو چکے تھے، (51) مزید برآں ایک کتاب ''تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں'' 1969ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''عہد نبوی کی درسگاہیں'' ہے، اس میں مصنف نے عہدِ رسالتؐ میں رائج نظامِ تعلیم سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عہد نبویؐ میں مسلمان اپنے رہائشی مکانات اور مساجد کو بطور درسگاہ استعمال کرتے تھے، اس حوالہ سے اپنی بات کی تائید میں انہوں نے حرمین شریفین کی آٹھ ایسی درسگاہوں کا تذکرہ کیا ہے، جہاں جمع ہو کر صحابہؓ نے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ آٹھ درسگاہیں حسب ذیل ہیں:

مسجد ابوبکر صدیقؓ، بیت فاطمہ بنت خطابؓ، دار ارقم بن ابی ارقم، مسجد بنی زریق، مسجدِ قبا، نقیع الخضمات، درسگاہ غمیم اور مسجد نبویؐ۔

ان میں مرکزی حیثیت مسجد نبوی کو حاصل تھی، جہاں ملک وبیرون ملک کے بچے، بوڑھے اور جوان حصول تعلیم کے لئے مختلف اوقات میں جمع ہوتے تھے، یہ ان صحابہ کی قیام گاہ بھی تھی جن کا مدینہ میں ذاتی مکان نہیں تھا، البتہ عورتوں کی تعلیم کا انتظام اس سے مختلف تھا۔ تعلیم کے جملہ فرائض عموماً آپؐ بنفسہ انجام دیتے تھے، البتہ کبھی کبھی یہ ذمہ داری بعض صحابہؓ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ نصاب میں قرآن وحدیث کے علاوہ علم الانساب اور کتابت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

دوسرے باب ''عہد صحابہ کی درسگاہیں'' میں ان پچیس صحابہؓ (بشمول حضرت عائشہ صدیقہؓ) کی تعلیمی سرگرمیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے جو علوم قرآن وحدیث کے ماہر اور بارگاہ رسالتؐ سے سند یافتہ تھے۔ (52) خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسجد نبویؐ میں ان کی علمی مجلسیں لگا کرتی تھیں، جہاں صغار صحابہؓ اور کبار تابعینؒ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، بعد میں انہی میں سے بعض نے اپنا حلقۂ درس عالم اسلام کے دوسرے شہروں یعنی کوفہ، بصرہ، فسطاط اور دمشق وغیرہ میں قائم کئے اور ایک جم غفیر کو علوم نبوت سے روشناس کرایا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد ان کے علوم کے جانشین تابعین عظام ہوئے۔ مختلف ممالک وامصار میں پھیلے ہوئے ان حضرات کی تعداد ہزاروں میں تھی، انہی میں سے علم کے اعلیٰ مدارج پر فائز پچاس چنندہ افراد کو کتاب کے تیسرے باب ''عہد تابعین کی درسگاہیں'' میں شامل کیا گیا ہے اور ان کے مختصر حالات، کن صحابہ سے کسب فیض کیا اور کہاں درس وتدریس کی بزم سجائیں، ان تمام پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں حضرت سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، نافع مولیٰ ابن عمر، قاسم بن محمد بن ابوبکر اور حسن بصری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تابعین کی اسی فہرست میں مصنف نے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، مالک بن انس اور لیث بن سعد جیسے بعض ایسے حضرات کو بھی شامل کیا ہے جن کا شمار تبع تابعین کی جماعت میں ہوتا ہے۔

چوتھا اور پانچواں باب سابقہ دونوں ابواب کا تکملہ ہے۔ چوتھے باب ''مکاتب اور ان کا نظام تعلیم وتربیت'' کے ضمن میں ان مکاتب کا ذکر ہے جو خاص بچوں کی تعلیم کے لئے خلافتِ راشدہ اور اموی عہد میں اسلامی قلمرو کے الگ الگ حصوں میں قائم ہوئے، خصوصاً عہد فاروقی میں حضرت عمرؓ نے اس طرف خاص توجہ دیکر بچوں کی تعلیم کے لئے مکاتب جاری کئے اور بعد کے خلفاء نے ان کی پیروی میں اس میں مزید اضافہ کیا۔ ان مکاتب میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے معلم ہوا کرتے تھے جو انہیں قرآن وادب کی تعلیم دیتے تھے، البتہ نصاب ہر دور میں مختلف تھا ،خلفاء وامراء کے بچوں کی تعلیم ان کے قصور ومحلات میں ہوتی تھی۔

پانچویں باب ''مدینہ منورہ کی دینی وعلمی اور ادبی مجلسیں'' کے تحت خیر القرون کی ان دس مجلسوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو مدینہ کے حدود میں قائم تھیں اور صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعین ان میں مذاکرہ کیا کرتے تھے، ان میں مجلس القلادہ، مجلس فقہائے سبعہ اور مجلس اصحابِ شوریٰ اسلامی تاریخ میں زیادہ معروف ومشہور ہوئیں۔

17۔ خواتینِ اسلام کی دینی وعلمی خدمات

قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی سابقہ بعض کتابوں میں جہاں صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ ومجتہدین کے اوصاف و

کمالات بیان کیے ہیں، وہیں زیر نظر کتاب ''خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات'' میں عالمات، محدثات، فقیہات ، عابدات اور زاہدات وغیرہ کا تعارف کرا کران کے علمی و دینی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔

ان کی یہ کتاب پہلے پہل ''بنات اسلام کی دینی وعلمی خدمات'' کے عنوان سے 1980/81ء میں ممبئی کے مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہ سے 96 صفحات میں شائع ہوئی تھی۔ موقع ومحل کے اعتبار سے چونکہ ہندوستان کے مسلم معاشرے کے لئے یہ ایک انوکھا موضوع تھا اس لئے علمی حلقوں میں اسے بہت پسند کیا گیا، بعد میں مصنف نے اس کے طبقات وتراجم میں مزید اضافہ کیا اور ٹائٹل سے لفظ ''بنات'' حذف کر کے کتاب کا نام ''خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات'' رکھا۔ (53) 178 صفحات کا اضافہ شدہ یہ جدید ایڈیشن ان کی وفات سے چند روز قبل جون 1996ء میں شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے باب ''خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات'' میں علمِ حدیث کے حوالہ سے اس نظامِ تعلیم سے بحث کی گئی ہے جو قرونِ اولیٰ میں عورتوں کے لئے عالمِ اسلام کے مرکزی شہروں میں رائج تھا، اس زمانہ میں عورتوں کے لئے سماعِ حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور روایتِ حدیث کے سلسلہ میں وہ دور دراز علاقوں کا سفر بھی کرتی تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کا یہ سلسلہ صرف حدیث تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ قرآن، فقہ، شعروادب، خطاطی، کتابت وانشاء اور دیگر مروجہ علوم بھی انہیں سکھائے جاتے تھے اور ان علوم وفنون میں مہارت رکھنے والیوں کو ست الاجناس، ست الاہل، ست الشام، ست الوزراء، شجر الدر، معلّمہ، جلیلہ، شیخہ اور حرہ جیسے معزز القاب سے پکارا جاتا تھا۔ اسی باب میں ذیلی عنوان ''اولاد کی تعلیم وتربیت میں ماؤں کا کردار'' کے تحت امام بخاریؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، امام شعبہؒ اور امام شافعیؒ جیسے ان چند ائمہ فقہ وحدیث کی والدہ کا تذکرہ بھی ہے کہ جن کی بہترین تعلیم وتربیت سے ان کی اولاد نے علم کے اعلیٰ مراتب حاصل کئے، بعد ازاں ان خواتین کا تذکرہ ہے، جنھوں مدارس، مکاتب، خانقاہ اور رباط کی تعمیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دوسرے باب ''امت کی مشہور عالمات ومحدثات'' میں 90 سے کچھ زائد عالم اسلام کی ان عالمات و محدثات اور فقیہات وصوفیات کا مختصر تعارف ہے، جنھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں علوم وفنون کی بزمیں سجائیں اور کثیر تعداد میں لوگ ان سے مستفید ہوئے، ان میں سے بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

زینب بنت سلیمان بغدادیہ، خدیجہ ام محمد بغدادیہ، عباسیہ زوجہ امام احمد بن حنبل، عبدہ بنت عبدالرحمٰن حرانیہ، امۃ السلام بنت قاضی ابوبکر احمد، فاطمہ بنت ہلال، فاطمہ بنت محمد، ست العرب بنت یحییٰ، ست الکتبہ نعمت بنت علی،

صفیہ بنت احمد مقدسیہ، ست العجم بنت نفیس اور زمرؒ دخاتون وغیرہ۔

کتاب کے تیسرے اور آخری باب ''طبقۂ صحابہ میں فقیہات ومفتیات اور محدثات'' میں قاضی اطہر مبارکپوری نے ان ستائیس صحابیاتؓ کا تذکرہ کیا ہے جو زمانۂ رسالتؐ میں امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلم میں بھی مصروف رہتی تھیں۔ صحابیات کی اس فہرست میں پہلے سات امہات المؤمناتؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ اور پھر دیگر مہاجرین وانصاری صحابیات کا تذکرہ ہے۔

کتاب میں فقط ڈیڑھ سو کے قریب عورتوں کا ہی تعارف کرایا گیا ہے، حالانکہ طبقات وتراجم اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسی ہزاروں مسلم بنات وخواتین کے تذکرے موجود ہیں، جو مروّجہ علوم کو فروغ دینے میں مردوں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں تھیں، یہ کوئی قیاس آرائی نہیں بلکہ محقق بات ہے، کیونکہ حال ہی میں مشہور اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے 43 جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب ''**الوفاء باسماء النساء** ''میں دس ہزار محدثات کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں۔

18۔مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء

قاضی اطہر مبارکپوری کی تمام تصانیف میں یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے، جس کا مطالعہ اردو زبان سے واقفیت رکھنے والے ہر مسلم طالب علم کو کرنا چاہیے۔ مصنف کی بعض دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے اشاعتی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جو 1998ء میں پہلی دفعہ منظر عام پر آئی۔

اس عنوان سے قاضی صاحب کا مقالہ 1954ء میں ماہنامہ البلاغ کے خصوصی شمارہ ''تعلیمی نمبر'' (دسمبر 1954ء، جنوری وفروری 1955ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس نمبر کو برصغیر کے دینی وعلمی حلقوں میں بڑی پزیرائی ملی اور قارئین نے اس کے جن مضامین کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا ان میں زیر بحث مقالہ بھی شامل تھا، جسے پڑھ کر لوگوں نے اس پر نہ صرف تبصرے کیے بلکہ مقالہ نگار سے اس میں مزید اضافہ کی خواہش بھی ظاہر کی، چنانچہ ان کی اس خواہش پر مصنف نے مقالہ کو مزید وسعت دی اور نہایت سلیقہ سے اسے مرتب کیا، لیکن جب کتاب منظر عام پر آئی تو وہ افراد تو درکنار خود صاحبِ کتاب بھی راہیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔

یہ کتاب 232 صفحات پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں مصنف نے علم کی غرض وغایت اور اس کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر سلف صالحین کے بعض واقعات نقل کئے ہیں اور آخر میں موضوع کی مناسبت سے مولانا آزاد کے خطبہ سے ماخوذ ایک اقتباس درج کیا ہے۔ (54) اس کے بعد چرواہوں، کسانوں،

دست کاروں، پارچہ بافوں، درزیوں، دھوبیوں، لوہاروں، حلوائیوں، جلد سازوں، کلاہ فروشوں، رنگ ریزوں، رفوگروں، صفاروں، کمہاروں اور مزدوروں وغیرہ جیسے زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت کے سو سے زائد پیشوں کا تعارف کرایا ہے اور ہر پیشہ کے ضمن میں اس سے منسلک ایسے علماء کا تذکرہ ہے جو علم کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی کی تکمیل کسبِ معاش سے کرتے تھے، ایک چیز انہیں دوسرے سے غافل نہیں کرتی تھی اور نہ ہی علم کی بنا پر وہ اپنے پیشہ کو حقیر سمجھتے تھے، ان کے برعکس ہمارے معاشرے کا حال یہ ہے کہ فراغت کے بعد طلبہ فرش سے عرش پر پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے افراد انہیں حقیر وکمتر نظر آنے لگتے ہیں۔

بہر حال یہ کتاب ہر اس عالم اور طالب علم کے لئے مشعلِ راہ ہے جو تعلیم کو ہی ذریعۂ معاش سمجھتے ہیں یا یہ کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی پیشہ اختیار کرنے کو حقیر سمجھتے ہیں، نیز وہ لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں جو محض ایک خاص طبقہ ہی کو حصول تعلیم کا مستحق سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ پیشہ ور مزدور طبقہ حصول علم کے لائق نہیں ہے۔ انوکھے موضوع کی بنا پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب بلاشبہ قابلِ ستائش اور لائق تحسین ہے۔

تعلیقات وتراجم

(وہ کتب اور کتابچے جن کا قاضی اطہر مبارکپوری نے ترجمہ کیا یا ان پر تعلیق وحواشی لکھے)

مستقل تصانیف کے علاوہ اسی زمرے میں شامل ایک قسم ان کتب اور کتابچوں کی بھی ہے جو درحقیقت قاضی اطہر مبارکپوری کے نہیں ہیں بلکہ ان کے مصنفین دوسرے لوگ ہیں، قاضی صاحب نے ان کی کتابوں یا کتابوں کے بعض اجزاء کا صرف ترجمہ کیا ہے یا پھر ان پر حواشی وتعلیقات لکھے ہیں۔ مثلاً:

(1) مسلمان (2) صفاتِ نفس (3) **جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول** (4) **دیوان احمد** اور (5) **تاریخ اسماء الثقات**۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا ترجمہ یا حواشی وتعلیقات قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے ہیں جبکہ اصل تحریریں کسی اور کی ہیں۔ ان کتب اور کتابچوں کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:

1۔ صفاتِ نفس

قاضی اطہر مبارکپوری کی تالیفات میں شامل یہ کتابچہ مشہور فقیہ ومحدث امام ابن قیم (م 751ھ) کی ''**کتاب الروح**'' (55) کی چند اہم فصلوں کا مجموعہ ہے، جسے مؤلف نے اردو کے قالب میں ڈھال کر 1950ء میں شائع کیا تھا۔ اس کی اہمیت وافادیت کو پیش نظر رکھ کر قاضی سلمان مبشر (صاحب زادہ قاضی اطہر مبارکپوری) نے اسے 2015ء میں دوبارہ شائع کروایا۔ (56)

امام ابن قیم نے قرآنی آیات کی روشنی میں اس میں نفس کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ نفس انسانی ایک ہی ہے، البتہ اس کے احوال وصفات تین ہیں، احوال وصفات کا جو رنگ نفس پر غالب آتا ہے وہ اس کے ساتھ متصف ہو جاتا ہے، ان میں ''نفس امارہ'' انسانی نفس کی سب سے گری ہوئی شکل ہے، جس میں انسان گناہ کی طرف مائل رہتا ہے، اس کے بعد ''نفس لوامہ'' ہے جسے غلطی کے بعد اپنی حقیقت کا احساس وشعور ہوتا ہے اور پھر سب سے اونچا اور آخری مقام ''نفس مطمئنہ'' کا ہے، جو درحقیقت سعادت ابدی کی پہلی منزل ہے، اس مقام پر پہنچ کر انسان اپنے آپ میں اطمینان قلب محسوس کرتا ہے جس سے فیضانِ خداوندی کے دروازے اس کے اوپر کھل جاتے ہیں۔

نفس کی ان تینوں قسموں پر سیر حاصل بحث کے بعد اخیر میں موصوف نے روح اور نفس کے متعلق (یعنی روح اور نفس ایک ہیں یا ایک سے زیادہ؟) محدثین، فقہاء اور اربابِ تصوف کے اقوال جمع کیے ہیں، لیکن اس سلسلہ

میں خود ان کا کیا موقف ہے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔

بہرکیف معلومات میں اضافہ کے پہلو سے مخاطبین کے لئے یہ کتابچہ ایک گراں قدر سرمایہ اور مصنف و مترجم کی جانب سے قابل قبول خدمت ہے۔

2۔ مسلمان

64 صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ دراصل امام دارالہجرہ مالک بن انس (م 167ھ) کے اس رسالہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے خلیفہ ہارون رشید کی فرمائش پر لکھا تھا۔ (57) قاضی اطہر مبارکپوری نے اسے علاقہ کوکن کی تنظیم ''جمعیۃ المسلمین جنجیرہ'' کی خواہش پر 1952ء میں اس لئے ترتیب دیا کہ وہاں کے اسکولوں میں مسلم بچوں کے لئے اخلاقیات کے موضوع پر مناسب نصاب قائم کیا جاسکے۔ اس کتابچہ کی بابت وہ ''کاروان حیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''میری تیسری کتاب ''مسلمان'' جمعیۃ المسلمین جنجیرہ نے دسمبر 1952ء مطابق 1372ھ میں بڑے اہتمام سے شائع کی اور کوکن کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کیا، مجھے بمبئی آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے اور شہرت و مقبولیت عام ہو چکی تھی، جمعیۃ المسلمین جنجیرہ (بمبئی) نے بارہا میرے تبلیغی و اصلاحی دورے کا اہتمام کیا اور میں کوکن کے مختلف علاقوں میں آیا گیا، اسی مناسبت سے میری کتاب مسلمان شائع ہوئی اور اس کو اصلاحی کتب کی اشاعت کا پہلا اقدام بتایا۔'' (58)

اس کتابچہ میں نماز، روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ ارکان اسلام کے علاوہ معاملات کے مختلف پہلوؤں جیسے جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک، تکبر کی حقیقت اور اس سے پرہیز، اخلاق و خیر خواہی، مظلوموں کی دادرسی، کھانے پینے کے آداب، سفر کے آداب، سونے اور جاگنے کے آداب، وغیرہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتابچہ محض ایک ترجمہ نہیں ہے بلکہ مؤلف نے اس میں حذف و اضافہ اور ترمیمات بھی کی ہیں، مثلاً اصل رسالہ میں امام مالک خلیفہ ہارون رشید سے بلا کسی عنوان کے مخاطب ہیں اور زندگی کے اہم پہلوؤں پر معلومات انہوں نے احادیث کی روشنی میں درج کی ہیں، لیکن قاضی صاحب نے اس کے اردو ترجمہ میں 53 عنوانات قائم کئے ہیں اور ہر عنوان کے ضمن میں اس سے متعلق متن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کے علاوہ رسالہ کے آخر میں کچھ حصہ امام بخاری کی کتاب ''**الادب المفرد**'' سے بھی ماخوذ ہے، لیکن امام مالک نے رسالہ میں جو نصیحت آموز انداز اختیار کیا ہے، مترجم نے اسے پوری طرح برقرار رکھا ہے۔

مختصر ہونے کے باوجود یہ کتابچہ بہت ہی مدلل و مؤثر ہے، جسے پڑھ کر مسلمان اپنی زندگی میں بہتر اسلوب

پیدا کر سکتے ہے۔ مؤلف کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتابچہ کو بھی بڑی مقبولیت ملی اور کئی دفعہ اشاعت کے مراحل سے گزرا۔ پیش نظر نسخہ اس کی پانچویں اشاعت ہے جسے فرید بک ڈپوئی دہلی نے 2006ء میں شائع کیا تھا۔

3۔ دیوانِ احمد

قاضی اطہر مبارکپوری کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری عربی زبان وادب کے ماہر اور ایک بلند پایہ شاعر تھے۔(59) ان کے کچھ اشعار کاغذوں میں بکھرے ہوئے تھے، قاضی صاحب نے انہیں اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ کی مدد سے یکجا کر کے اپریل 1958ء میں ''دیوان احمد'' کے عنوان سے شائع کرایا۔

50 صفحات پر مشتمل یہ ایک مختصر دیوان ہے، جس میں حروف تہجی کی ترتیب پر اشعار کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں موجود زیادہ تر اشعار کی نوعیت قصیدہ کی ہے، لیکن بعض اشخاص کے مراثی بھی جگہ جگہ مذکور ہیں۔(60) اور دو ایک جگہ حمد یہ اور نعتیہ اشعار بھی آ گئے ہیں۔ شاعر نے کونسا قصیدہ کب اور کس موقع پر کہا؟ اشعار کے شروع میں اس کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

4۔ جواھر الاصول فی علم حدیث الرسولؐ

یہ ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فارسی (م 837ھ) کی تالیف ہے،(61) جسے قاضی صاحب نے تصحیح و تحقیق کے بعد شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بوسیدہ حالت میں رکھا ہوا تھا اور درمیان سے اس کے کچھ اوراق بھی غائب تھے، ممبئی کے زمانۂ قیام میں جب انہیں اس کا ایک دوسرا نسخہ ''محمدیہ کتب خانہ'' جامع مسجد میں ملا تو انہوں نے دونوں مخطوطات کا موازنہ کر کے اس کی تصحیح و تحقیق کی، ساتھ ہی ضرورت کے مطابق اصول حدیث کی دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔

یہ اصولِ حدیث کی بنیادی کتاب ہے، جس میں اس فن کے قواعد و ضوابط نہایت سہل انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں اس میں اصول حدیث کی تعریف، اس کے اغراض و مقاصد اور ضرورت و اہمیت پر ماہرین فن کے اقوال کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے، بعد ازاں چار فصلوں پر منقسم اس کتاب میں بالترتیب متن، سند، روایت حدیث کے طریقوں اور فن اسماء الرجال سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد خاتمہ میں اس فن سے متعلق بعض ضروری چیزوں کا احاطہ کیا گیا ہے، آخر میں مرتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی شامل ہے، جس میں انہوں نے کتاب اور صاحب کتاب کے علاوہ شروع زمانہ سے اس کتاب کی تالیف تک اصول حدیث پر لکھی گئی مشہور کتابوں کا اجمالاً تعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر نگار افشاں کے بقول اس کا پہلا ایڈیشن 1973ء میں شرف الدین الکتبی واولادہ سے جبکہ دوسرا ایڈیشن الدار السّلفیہ ممبئ سے شائع ہوا۔(62) پیش نظر نسخہ الدار السّلفیہ کا شائع کردہ ہے، لیکن اس میں سن اشاعت او رقم طباعت وغیرہ مذکور نہیں ہیں، مقدمہ میں 20 صفر 1393ھ ہی درج ہے جس کا مطلب ہے کہ قاضی صاحب نے اسے 1973ء میں مرتب کیا تھا۔

5۔تاریخ اسماء الثقات

ابوحفص عمر بن محمد ابن شاہین چوتھی صدی ہجری کے محدثین میں سے ہیں۔وہ بغداد کے رہنے والے تھے اور 385ھ میں وہیں فوت ہوئے۔(63) زیر تبصرہ کتاب ''**تاریخ اسماء الثقات**'' انہی کی تصنیف ہے، جس میں انہوں نے پندرہ سو سے زائد ثقہ راویان حدیث (جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے) کے اسماء کی فہرست حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کی ہے۔

1137ھ کا لکھا ہوا اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامع مسجد ممبئ کے محمدیہ کتب خانہ میں موجود تھا، قاضی اطہر مبارکپوری نے مسجد کے امام مولانا غلام محمد کے توسط سے کتب خانہ سے یہ نسخہ حاصل کر کے نقل کر لیا اور جب فرصت ملی تو دوسری کتابوں سے تحقیق وتصحیح کے بعد 1406ھ /1986ء میں شرف الدین الکتبی واولادہ ممبئ سے اسے شائع کروایا۔

موجودہ مطبوعہ نسخہ 235 صفحات پر مشتمل ہے، جس کے شروع میں مرتب کے قلم سے مصنف کا تعارف اور کتاب میں جگہ جگہ حواشی وتعلیقات کا اضافہ ہے۔

وفات کے بعد

شائع ہونے والی کتب اور کتابچے

قاضی اطہر مبارکپوری کی مذکورہ مستقل تصانیف اور تعلیقات وتراجم کے علاوہ بعض کتب اور کتابچے ایسے بھی ہیں جو ان کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئے ۔ یہ کتابیں دراصل ان کے قلم سے تحریر شدہ ان دینی وعلمی اور تاریخی مقالات ومضامین پر مشتمل ہیں جو ماہنامہ ''البلاغ''، مجلّہ ''معارف''، ماہنامہ ''برہان''، ہفت روزہ ''انصار'' اور روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوئے تھے، بعد میں مرتبین نے موضوع کی مناسبت سے انہیں ان اخبار ورسائل کے صفحات سے نقل کرکے الگ الگ عناوین کے تحت کتابیں شائع کیں، اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی نو کتابوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے، جن میں سے دو مصنف کے غیر شائع شدہ ناقص مسودات، ایک سفرنامہ ، ایک وفیات کا مجموعہ، ایک ضخیم دیوان اور کتابچوں کی صورت میں چند مقالات ہیں۔

1۔علمائے اسلام کی خونیں داستانیں

یہ کتاب قاضی اطہر مبارکپوری کی ابتدائی تصنیفات میں سے ایک ہے، جسے انہوں نے قیامِ لاہور کے زمانہ میں جناب احسان دانش کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ اس کی ضخامت تقریباً ساڑے چار سو صفحات تھی اور کتابت تک کے مراحل طے ہوچکے تھے، مگر تقسیم ملک کے ہنگامہ خیز حالات درپیش ہونے کے باعث یہ شائع نہ ہوسکی۔ اس کا کچھ حصہ، جو کہ ناقص تھا اور درمیان میں جگہ جگہ سے اوراق غائب تھے، لاہور سے وطن واپسی پر قاضی صاحب اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ (64) ساٹھ سال گزر جانے کے بعد ان کے بیٹے قاضی سلمان مبشر نے اس ناتمام مسوّدہ میں دلچسپی لی اور بذاتِ خود اسے ترتیب دے کر 2009ء قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

پیشِ نظر نسخہ 250 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں پہلی صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک کی اسلامی تحریکوں ،فتنوں اور علمائے اسلام پر ہونے والے مظالم الگ الگ ابواب کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ ہر باب ایک صدی پر محیط ہے اور جلی عنوانات جیسے'' فتنے اور تحریکیں، سربرآوردگانِ ستم، رسم ستم گری، سرخیل مظلومان ، مددگارانِ حق وصداقت اور اندازِ ستم نوازی'' وغیرہ تمام ابواب میں معمولی ترمیم کے ساتھ یکساں ہیں اور ہر عنوان کے ضمن میں ظالم ومظلومین کے ناعاقبت اندیش واقعات مجمل ومختصر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب کی ابتدا محمد ﷺ کی ذات اقدس سے گئی ہے، جنہوں نے اسلام کی خاطر اہل مکہ کے ظلم وستم برداشت کئے تھے، اسی طرح جن صحابہؓ نے آپؐ کے ساتھ مشرکین مکہ کے مظالم برداشت کیے، ان کے واقعات بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے تحت خلفائے راشدین کو سرخیل مظلومان قرار دے کر دوسرے ایسے صحابہؓ اور تابعین کے مختصر حالات ذکر کیے گئے ہیں، جن پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، اور ان کے بالمقابل عبداللہ بن سبا اور حجاج بن یوسف (کہ جن کے عتاب کا شکار کئی بے قصور صحابہ وتابعین ہوئے) کو سربر آوردگان ستم قرار دیا گیا ہے۔

دوسری صدی کے تحت بنوامیہ اور بنوعباس کے دور فتن کا تذکرہ ہے۔قاضی صاحب ایک جگہ ان کے ظلم و عدوان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علماء کو درّے لگائے گیے، سر بازار تشہیر کی گئی، قتل کئے گیے، جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں رکھا اور خفیہ زہر دینے کا رواج بھی شروع ہوگیا، بنوامیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو زہر دیا گیا اور بنو عباسیہ میں امام ابوحنیفہؒ کو قید خانہ میں زہر دیا گیا، قتل سے پہلے زبان کاٹی گئی، لوہے کے گرم طشت پر سر رکھ کر جان لی گئی۔'' (65)

تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی کا ذکر نہیں ہے۔اس کے بعد چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی کے علماء و مشائخ میں امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، فقیہ ابوالعباس فارسی، شیخ ظہیرالدین عمیمی، شیخ شمس الدین کوئلی، شیخ صلاح الدین درویش، شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی وغیرہم کے علاوہ دیگر مجاہدین ملت پر کیے گئے ظلم وستم کے واقعات مذکور ہیں، اسی طرح دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے تحت شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبد العزیز دہلوی، سید احمد بلگرامی، ملا قطب الدین سہالوی، حضرت شاہ فخرالدین دہلوی اور ملا نظام الدین وغیرہ علمائے ہند پر ڈھائے گئے مظالم سے بحث کی گئی ہے۔

2۔علمائے اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں

قاضی اطہر مبارکپوری کی وفات کے بعد ان کے جن مقالات ومضامین کو کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ان میں سے ایک زیر نظر مقالہ ''علمائے اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں'' ہے، جو پہلی دفعہ اپریل 1955ء میں ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع ہوا تھا، بعد ازاں مصنف نے اسے پچیس مقالات پر مشتمل اپنی کتاب ''مآثر ومعارف'' میں بھی معمولی ترمیم کے ساتھ شامل کیا اور تین دہائی گزر جانے کے بعد 2004ء میں یہی مقالہ

کتابچہ کی صورت میں فرید بک ڈپوئی دہلی سے شائع ہوا۔

اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں علوم وفنون کے ماہرین کے لئے استعمال ہونے والے عربی وعجمی القاب و خطابات جیسے عالم، مقری، قاری، علامہ، منشی، معلم، مکتب، مؤدب اور استاذ وغیرہ اس کتابچہ کا موضوع ہیں، جن کی مجموعی تعداد ستائیس ہے۔ کتابچہ میں ان القاب وخطابات پر بہت ہی اختصار کے ساتھ لسانی و تاریخی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، ساتھ ہی تاریخ وسیر کی کتابوں کے حوالہ سے ان شخصیات کا بھی تذکرہ ہے جوان میں سے کسی بھی لقب سے پکارے گئے، مثال کے طور پر لقب ''کاتب'' کے ضمن میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے حضرت حنظلہ بن ربیعؓ کے متعلق اس میں لکھا ہے:

> ''حنظلہ بن ربیعؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہﷺ کے لئے کچھ لکھا تو وہ کاتب ہی کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔(66)

اسی طرح ہر لقب کے ضمن میں اس کی لغوی تشریح، کب اور کس کے لئے وہ استعمال ہوا؟ اور موجودہ دور میں اس لقب کی معنوی حیثیت کیا ہے؟ یعنی وہ موجودہ زمانہ میں مروّج ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس سے کیا معنی مراد لئے جاتے ہیں، ان تمام باتوں پر تشفی بخش بحث کی گئی ہے، نیز بعض ایسے القاب کا بھی ذکر ہے جو تاریخ میں فردِ واحد کے لئے ہی مستعمل ہوئے، مثلاً ''ترجمان القرآن'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے، ''جاراللہ'' ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری کے لئے، ''زین العابدین'' امام علی بن حسینؓ کے لئے اور ''فقیہ الامۃ'' خاص طور پر امام مالکؒ کے لئے ہی استعمال کیے گئے تھے۔

مختصر ہونے کے باوجود کتابچہ بہت مفید اور معلومات افزا ہے، نیز اپنے انوکھے موضوع کے سبب علمی حلقوں میں کافی مقبول بھی ہے۔

3۔کاروان حیات

قاضی اطہر مبارکپوری نے 1987ء میں ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے عنوان سے اپنی تعلیمی زندگی کے حالات ایک کتابچہ کی شکل میں مرتب کئے تھے۔ اشاعت کے بعد علمی حلقوں میں اس کتابچہ کو جب مقبولیت ملی تو احباب و اہل خانہ کی ان سے فرمائش ہوئی کہ وہ آئندہ زندگی کے واقعات قلم بند کر کے اس ناقص سوانح کی تکمیل کریں، چنانچہ لوگوں کے اصرار پر انہوں نے اس طرف توجہ دی اور ''کاروانِ حیات'' کا عنوان دیکر اپنی سوانح کا اگلا حصہ (تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کے واقعات) شروع کیا اور فرصت کے اوقات میں گاہے بہ

گا ہے اس پر لکھنے لگے، لیکن ابھی نصف سے کچھ زائد حصہ ہی لکھا گیا تھا کہ ان کی حیات مستعار کا وقت پورا ہو گیا اور یہ داستان زندگی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ (67)

ان کی وفات کے بعد غیر مطبوعہ سوانح کے اس ناقص مسوّدہ کو مولانا ضیاء الحق خیر آبادی نے مارچ 2003ء میں ترتیب دے کر پہلے ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' شیخو پور، اعظم گڑھ کے خصوصی شمارہ'' قاضی اطہر نمبر'' میں شائع کیا، پھر چند دنوں بعد اسی ماہ کے آخر میں یہ مسودہ بعنوان'' کاروانِ حیات مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' فرید بک ڈپوئی دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ (68)

کتاب 238 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحہ 59 تک'' قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' زمانۂ طالب علمی کے احوال درج ہیں، اس کے بعد صفحہ 60 تا 179 پر زیرِ بحث غیر مطبوعہ سوانح ہے، جس میں تعلیم سے فراغت کے بعد حالاتِ زندگی کے اچھے برے پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے اور اس سے آگے کے صفحات میں مرتب نے ان کا ایک سفر نامہ اور متعلقین کے بعض خطوط و مضامین شامل کیے ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے اس میں اپنی زندگی کی جو روداد بیان کی ہے، وہ قیام ممبئی کے حالات تک ہی محدود ہے، بلکہ اس میں بھی بعض چیزیں مفقود ہیں اور آخر کے کچھ حصہ میں نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ زندگی کے مزید حالات قلم بند کریں مگر وقت اور فرصت دونوں نہ ہونے کے سبب وہ اس سے محروم رہے اور سوانح مکمل نہ ہو سکی۔ اگر یہ سوانح کسی طرح مکمل ہو جاتی تو اسے بھی مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی'' آپ بیتی'' کے ساتھ شمار کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال ناقص ہونے کے باوجود اس میں جو کچھ ہے وہ بہت خوب تو نہیں لیکن بہتر ضرور ہے، کیونکہ اس سے وقت کے ایک بڑے مؤرخ کی زندگی کے دو تہائی حصہ پر روشنی پڑتی ہے۔

4۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے سفر نامے

قاضی اطہر مبارکپوری کی وفات کے بعد روزنامہ'' انقلاب'' اور ماہنامہ'' البلاغ'' میں شائع ہونے والے ان کے مختلف مضامین کو ترتیب دینے کے بعد جو کتابیں منظر عام پر آئیں، ان میں سے ایک زیرِ تبصرہ کتاب'' قاضی اطہر مبارکپوری کے سفر نامے'' بھی ہے۔ یہ کتاب 2005ء میں قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کے مرتب مولانا ضیاء الحق خیر آبادی ہیں۔

350 صفحات کی یہ ضخیم کتاب 21 سفر ناموں پر مشتمل ہے، جن میں شروع کے اٹھارہ سفر نامے قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے ہیں اور ماہنامہ'' البلاغ'' میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے تھے، (69) جبکہ آخر کے تین سفر نامے

اور چند خطوط ان کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال کے تحریر کردہ ہیں، جنہیں مرتب نے ان کی اہمیت کے پیش نظر اس مجموعہ میں شامل کرلیا ہے۔ (70)

مشقت و پریشانی کے باوجود قدرت کے حسین مناظر کی سیر و سیاحت اور دور دراز علاقوں کا سفر انسانی زندگی کا ایک پر لطف حصہ ہے، جس میں وسیع و عریض معلومات مخفی ہوتی ہیں اور جن سے تجربات کی شکل ہی میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے اہم مشاغل کے علاوہ قاضی صاحب کی زندگی ضروری وغیر ضروری دیگر مصروفیات و ذمہ داریوں سے گھری ہوئی تھی، انہی میں ایک مشغلہ قریب و بعید اور معروف و مجہول علاقوں کا سفر اور وہاں کے عجیب وغریب، فطری و طبعی مناظر کی سیر و سیاحت ہے۔ اپنی اٹھتر سالہ زندگی میں انہوں نے ملک و بیرون ملک کے سیکڑوں سفر کئے اور ہر سفر سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا، مگر ان میں سے بعض اسفار ان کے نزدیک علمی و تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل اور ضبط تحریر میں لانے کے لائق تھے، اس لئے انہوں نے قلم اٹھا کر ان اسفار کی روداد کاغذ کے سپرد کردی، جو اصطلاح میں ''سفرنامہ'' کہلائیں۔

اس کتاب میں شامل پہلا سفرنامہ ''اہل حرمین سے ملاقاتیں'' ہے، اس کا تعلق مصنف کے دوسرے سفر حج سے ہے، جو انہوں نے 1965ء میں ادا کیا تھا۔ حج کے بعد حرمین شریفین میں دو ماہ قیام کے دوران وہاں ان کی جن دینی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کا جو موقع ملا، اس کی تمام روداد انہوں نے اس سفرنامے میں بیان کردی ہے۔ دوسرے سفرنامہ ''مکتوبات حجاز'' بھی اسی سفر حج کا ایک حصہ ہے، جس میں موصوف نے ساحل ممبئی سے جدہ کی بندرگاہ تک پانی کے جہاز سے سفر حج کا پورا نقشہ کھینچا ہے اور ان تمام مثبت و منفی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے جو اس زمانہ میں دوران سفر حجاج کے ساتھ جہاز پر پیش آتے تھے۔ موجودہ دور میں جو لوگ بحری جہاز کے ذریعہ سفرِ حج کے احوال و کوائف جاننے کے خواہش مند ہوں، یہ سفرنامہ ان کے لئے ایک اہم ماخذ ہے۔

پہلے دو سفرناموں کی طرح تیسرا سفرنامہ ''ایک ہفتہ قاہرہ میں'' کا تعلق بھی بیرون ملک سے ہے۔ 1978ء میں چوتھے حج کی ادائیگی سے فارغ ہونے کے بعد قاضی صاحب نے اپنے بیٹے مولانا خالد کمال کی معیت میں عرب ممالک اور شمالی افریقہ کے بلاد و امصار کا چھ ماہ تک سفر کیا، مصر بھی اسی سفر کا ایک حصہ تھا، جس کے دار الحکومت قاہرہ میں ایک ہفتہ تک ان کا قیام رہا، اس دوران انہوں نے جامعہ ازہر، شہر قاہرہ کے کتب خانے اور قدیم ترین عمارتوں (اہرام) کی شکل میں جو کچھ مصر میں دیکھا وہ سب اس سفرنامہ میں اختصار کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

متذکرہ بالا سفرناموں کے بعد صفحہ 72 سے 268 تک مذکور بقیہ 15 سفرناموں کا تعلق ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے یہ اسفار اکتوبر 1957ء اور جون 1979ء کے درمیان کیے تھے۔ جن شہروں یا علاقوں کا سفر کر کے انہوں نے ان کی روداد لکھی، ان میں ایلورا، دہلی، ناندیر، گجرات، جونپور، برہان پور، بھٹکل، ماتھران، احمد نگر، کوکن، غازی پور اور سوراشٹر وغیرہ علاقے شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر اسفار علمی ودینی نوعیت کے تھے، جنہیں مسافر نے ایک دو یا اس سے زائد افراد کے ساتھ طے کیا تھا۔

قاضی صاحب کی عادت تھی کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، اس کو اپنے مؤرخانہ انداز میں علم وتحقیق کے سانچے میں ڈھال لیا کرتے تھے، ان کا یہی مزاج ان اسفار کی روداد لکھنے کے دوران بھی رہا، چنانچہ سفرناموں کے اس مجموعے میں شہروں اور علاقوں کی سیر وسیاحت کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہاں کی تاریخ بھی رقم کی ہے، جس میں سابقہ بادشاہوں اور حکومتوں کا تعارف اور ان کی تعمیر کردہ عمارتوں کا تاریخی اور فنی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے، نیز جو علماء، مشائخ، بزرگان دین ان علاقوں میں گزرے یا دوران سفر جن کے مقبروں کی انہوں نے زیارت کی ان کے حالات بھی بڑی احتیاط کے ساتھ ان میں درج کیے گئے ہیں۔ یوں تو یہ نہج انہوں نے تمام سفرناموں میں اختیار کیا ہے مگر حسب ذیل سفرنامے تاریخی نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں:

1۔ بمبئی سے ایلورا تک
2۔ دہلی کا ایک یادگار سفر
3۔ مبارک پور سے جون پور تک
4۔ احمد نگر کا علمی ودینی سفر
5۔ بمبئی سے برہان پور تک
6۔ سفرنامہ رانڈیر۔

اس کتاب کے تعلق سے ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سفرناموں کے اژدحام میں یہ خواہ مخواہ کا اضافہ نہیں ہے بلکہ تاریخ وتمدن کی ایک مختصر انسائکلو پیڈیا ہے جس کو مسافر نے بچشم خود مشاہدہ کرنے اور تاریخی حیثیت سے جائزہ لینے کے بعد پوری دیانت داری کے ساتھ نہایت سادگی اور بے ساختگی سے قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

5۔ مئے طہور

تاریخ وسوانح کے مختلف موضوعات پر کتب وکتابچوں کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری کا ایک مطبوعہ دیوان بھی ہے، جو 2006ء میں ''مئے طہور'' کے عنوان سے فرید بک ڈپو نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔

طالب علمی اور عملی زندگی کے ابتدائی دور میں قاضی صاحب کو شعر وشاعری کا خاصا ذوق تھا اور دن میں کئی کئی نظمیں اور غزلیں کہا کرتے تھے، مگر بعد میں انہوں نے اس سے تعلق منقطع کر لیا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں وقت

اور ماحول کے لحاظ سے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نوعیت کی ہوتی تھیں، جنہیں وہ قصبہ میں منعقد ہونے والے جلسوں ،عوامی مجمعوں اور دوستوں کی محفلوں میں تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد یہ نظمیں اور غزلیں روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی اور سہ روزہ ''زمزم'' لاہور جیسے اخباروں میں بھی شائع ہونے لگیں۔ اس سلسلہ کی ان کی پہلی نظم ''مسلم کی دعا'' رسالہ ''الفرقان'' بریلی (بعد میں لکھنؤ) کے جمادی الثانیہ 1357ھ/1938ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا پہلا بند حسب ذیل ہے:

الٰہی پھر وہی ساقی وہی پیمانہ ہوجائے ‏ ‏ حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہوجائے

شبستانِ جہاں توحید کا کاشانہ ہوجائے ‏ ‏ ہراک فرد بشر اسلام کا دیوانہ ہوجائے

الٰہی پھر پتنگوں میں امنگ وسوز پیدا کر ‏ ‏ الٰہی پھر رخِ اسلام کو دنیا پر شیدا کر (71)

شعر وشاعری کے فن میں قاضی اطہر مبارکپوری کا کوئی استاذ نہ تھا، البتہ غزل گوئی میں اصغر گونڈوی اور نظم میں احسان دانش کے مطبوعہ دیوانوں سے اصلاح ضرور لیتے تھے اور بہت ہی ستھرے انداز میں شاعری کرتے تھے، ان کی بابت جناب احسان دانش اپنی سوانح عمری ''جہانِ دگر'' میں لکھتے ہیں:

''قاضی اطہر مبارکپوری شاعر بھی ہیں اور بہت ہی سنبھلا ہوا شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ابتذال نہیں ملتا اور انسانی اقدار ان کے ہر وقت پیش نظر رہتی ہیں۔'' (72)

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں (قاضی ظفر مسعود اور قاضی سلمان مبشر) کے توسط سے نعت نظم اور غزل کی شکل میں عہد شباب میں کہے گئے یہ اشعار مولانا قمر الزماں مبارکپوری نے ''مئے طہور'' کے عنوان سے مرتب کئے۔ (73) دیوان کی ضخامت 458 صفحات ہے، جس میں اظہار تشکر کے بعد مرتب کے قلم سے شروع میں سوا دو سو (صفحہ 11 تا 237) صفحات کا مقدمہ ہے، اس کے نصف اوّل میں قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کی جملہ تصانیف کا تعارف ہے جبکہ نصف آخر میں ان کی شاعرانہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے نعتوں، غزلوں، نظموں اور شخصی مرثیوں پر مبنی اس مجموعۂ کلام پر بحث ہے اور درمیان میں کہیں کہیں فنی لحاظ سے لب کشائی بھی کی گئی ہے۔

مقدمہ کے بعد حسب ذیل ترتیب پر قاضی اطہر مبارکپوری کا کلام ہے:

نعتیں:۔ سب سے پہلے نعتیں ہیں۔ ان کی کل تعداد آٹھ ہے جن میں سات اردو میں اور ایک ''بسوئے رحمۃ اللعالمین ﷺ'' کے عنوان سے فارسی میں ہے، انہی میں ایک نعت نامکمل بھی ہے۔

غزلیں:۔ نعتوں کے بعد بغیر کسی عنوان کے ساٹھ سے زیادہ اس میں غزلیں ہیں، یہ غزلیں مختصر بھی ہیں اور طویل بھی

نظمیں:۔غزلوں کے بعد اس مجموعہ میں انتیس نظمیں ہیں، جن میں سے بیشتر سیاسی و اصلاحی نوعیت کی ہیں اور ہر نظم ''لالۂ اطہر، اعلانِ آزادی، صبح آزادی، غازی، اشارات، ہمارا ماضی اور نوجوان مسلمان'' جیسے کسی نہ کسی عنوان کے تحت کہی گئی ہے۔

مرثیے:۔اسی مجموعے میں چار شخصی مرثیے بھی شامل ہیں۔ پہلا مرثیہ استاذ مولانا شکر اللہ مبارکپوری کا، دوسرا والدہ محترمہ کا، تیسرا امتیاز احمد نامی ایک صاحب کا اور آخری مرثیہ عربی میں سید سلیمان ندوی کا ہے۔

مجموعۂ کلام کے آخر میں ''اذان کعبہ'' کے عنوان سے وہ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں جو قاضی صاحب نے جامع مسجد مبارک پور کی تعمیر کے موقع پر گھر گھر جا کر قصبہ والوں سے چندہ وصول کرنے کے لئے پڑھی تھی، انہوں نے ممبئی میں قیام کے دوران انہیں مرتب کر کے مشہور شاعر انور صابری کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

6۔ ہندوستان میں علمِ حدیث کی اشاعت

برصغیر ہندو پاک میں علم حدیث اور محدثین کے موضوع پر قاضی اطہر مبارکپوری کا یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے، جو جنوری، فروری 1973ء میں پہلے مجلّہ ''معارف'' میں شائع ہوا، پھر 1984ء میں مقالہ نگار نے اسے ''ادبی سندھی کانفرنس''، سندھ، پاکستان میں پڑھا۔(74) بعد ازاں 2006ء میں اسے کتابچہ کی شکل میں مکتبۃ الفہیم مئو ناتھ بھنجن سے شائع کیا گیا۔

ہندوستان میں علمِ حدیث کی ترویج و اشاعت کی ابتدا کب ہوئی؟ اس سلسلہ میں عموماً علماء و محققین کا یہ موقف رہا ہے کہ ہندوستان میں اس کی باقاعدہ ابتدا چھٹی صدی ہجری اور اس کے بعد کے ادوار میں ہوئی، جبکہ عرب و ماوراء النہر کے علاقوں میں یہ فن پہلی صدی ہجری ہی میں رواج پا چکا تھا اور اسی دور میں وہاں اخبرنا و حدثنا کی صدائیں گونج اٹھی تھیں۔ علماء کے اسی موقف کی رد میں قاضی صاحب کا یہ مقالہ ہے، جس میں انہوں نے دلائل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ابتدائے عہد اسلام میں بلادِ اسلامیہ کے دوسرے علاقوں کی طرح ہندوستان میں بھی علم حدیث اور دوسرے مروجہ علوم کی ترویج ہو چکی تھی۔ مقالہ کے شروع میں وہ اپنے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو مختلف بلاد و امصار میں صحابہؓ و تابعینؒ دینی تعلیم کے لئے روانہ کیے گئے، جنہوں نے اپنے اپنے علاقے اور حلقے میں احادیث رسولؐ اور شرائع اسلام کی تعلیم عام کی، چنانچہ دیگر اسلامی ممالک کی طرح سندھ میں بھی ان حضرات کی تشریف آوری ہوئی اور علوم نبوت کے

ان چلتے پھرتے مدرسوں نے یہاں علمِ دین پھیلایا۔"(75)

پھر اپنے اس نظریہ کے تحت انہوں نے مقالہ میں ان صحابہؓ، تابعین، اور تبع تابعین کے اسماء درج کیے ہیں ،جنہوں نے اپنے پیروں سے اس ملک کی مٹی کو روندا اور یہاں علمی فضا قائم کی، اور دوران قیام ان کی بیان کردہ احادیث کو اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے، اس حوالہ سے کتابچہ کے صفحہ 16 اور 17 پر مذکور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ اور حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ کے واقعات میں انہوں نے ان سے مروی روایات بھی درج کی ہیں۔اس کے بعد آگے منصورہ، دیبل، لاہور اور قصدار وغیرہ ان شہروں کا تذکرہ ہے جو عباسی عہد میں اس ملک میں علوم وفنون کے مراکز تھے اور ملک و بیرون ملک کے طلبہ وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے، اس حوالہ سے حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد امام ربیع بن صبیح کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے جو جہاد کی غرض سے ہندوستان آئے اور 160ھ میں یہی فوت ہوئے، اسی طرح جو ہندوستانی محدثین عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں برسوں سے آباد تھے، وہ بھی اس مقالہ کا حصہ ہیں، چنانچہ زیرِ نظر کتابچہ میں اس حوالہ سے تین ہندوستانی خانوادوں یعنی آل ابی معشر سندھی، آل مقسم قیقانی اور آل بیلمانی کا تذکرہ کیا گیا ہے، مقالہ نگار کے مطابق ان تینوں خانوادوں میں نسل درنسل کئی علمی شخصیات پیدا ہوئیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے اس مقالہ میں ہندوستان کی چار سو سالہ علمی تاریخ پیش کی ہے، جس میں انہوں نے علم حدیث کی اس ملک میں اشاعت کا آغاز پہلی صدی ہجری سے کیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ چھٹی صدی ہجری میں اس علم کا چرچا ہندوستان میں ہوا، کم ازکم اس مقالہ کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

7۔مکتوباتِ امام احمد ابن حنبل

48 صفحات پر مبنی یہ بھی ایک مختصر کتابچہ ہے، جو قاضی اطہر مبارکپوری کی وفات کے بعد مکتبۃ الفہیم مؤناتھ بھنجن سے 2006ء میں شائع ہوا۔اس کے مرتب محمد صادق مبارکپوری ہیں ۔اس کتابچہ میں مذکور مضامین ستمبر و اکتوبر 1955ء میں ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہوئے تھے۔(76)

رسالہ کا نصف اول حصہ مشہور فقیہ و محدث امام احمد بن حنبلؒ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے، جس میں اختصار کے ساتھ اول تا آخر ان کی زندگی کے مختلف پہلو زیرِ بحث ہیں، البتہ مامون، معتصم اور واثق کے عہد میں فتنۂ خلق قرآن کے مسئلہ پر امام صاحب جن آزمائش و مصائب سے دوچار ہوئے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، **نیز** کتابچہ کے صفحہ 15 اور 16 پر ذیلی عنوان کے تحت موصوف کے تین ہندی تلامذہ (یعنی حبیش بن سندی قطیعی اور ابوبکر سندی الخواتیمی)اور دیگر معاصرین علماء کا تذکرہ بھی ہے جو عموماً کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن کتابچہ کا

اصل موضوع اردو زبان میں ترجمہ شدہ امام صاحب کے دس ایسے خطوط ہیں جن میں مذہبی عقائد و اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر قرآن وحدیث اور آثار صحابہؓ کی روشنی میں مکتوب الیہ کو جواب دیا گیا ہے۔

ابتدائی تین خطوط' جن میں سے ایک محدث مسدد بن مسرہد کے نام اور دو باالواسطہ عباسی خلیفہ متوکل کے نام ہیں' ذرا طویل ہیں، لیکن بقیہ سات خطوط بہت ہی مختصر اور نصیحت آموز قسم کے ہیں، ان میں ایک خط بھائی کے نام اور دو صاحب زادہ صالح کے نام ہیں۔(77) خطوط کے علاوہ کتابچہ کے آخر میں ایک وصیت نامہ بھی درج ہے، جس میں ورثاء کو چند نصیحتیں کی گئی ہیں۔

اولین تینوں خطوط میں مکتوب الیہ کو جو جوابات لکھے گئے ہیں ان میں مختلف عناوین قائم کر کے امام صاحب سوال کے ہر پہلو کا معقول و مدلل طریقہ سے جواب دیتے ہیں، مثلاً قرآن کے غیر مخلوق ہونے سے متعلق خلیفہ متوکل کے کچھ سوالات، جو عبداللہ بن یحیٰی بن خاقان کے واسطہ سے پوچھے گئے تھے، کے جوابی خط میں مندرجہ ذیل چھ عناوین قائم کیے گئے ہیں:

(1) قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے (2) دین میں جھگڑے سے بچنا اور سنت پر عمل کرنا (3) قرآن حکیم کلام اللہ ہے، یہ امر ہے خلق نہیں ہے (4) قرآن غیر مخلوق ہے (5) باریکیوں میں نہ پڑنا بلکہ کتاب وسنت کی اتباع کرنا اور (6) نیکی پر ثابت قدمی کی دعاء۔

پھر ہر عنوان کے ضمن میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں، مثلاً ''قرآن غیر مخلوق ہے'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ''ہم سے پہلے جو سلف صالحین رحمہم اللہ گزر چکے ہیں ان میں سے متعدد حضرات سے یہی مروی ہے:
>
> **القرآن کلام الله ولیس مخلوقاً .**
>
> ترجمہ:۔قرآن اللہ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔''(78)

ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف اپنے مکاتیب کے مضامین میں اختصار اور جامعیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے بہت ہی جچے تلے الفاظ استعمال کرتے تھے اور انداز تحریر ایسا تھا کہ اصل منشا کی ترجمانی میں کوئی فرق نہ آنے پاتا۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتابچہ بڑا دلچسپ اور وعظ ونصیحت سے پر ہے۔

8۔آسودگانِ خاک

یہ کتاب قاضی صاحب کے ان تعزیتی مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف اخبارات ورسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔272 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 196 شخصیات کی وفیات شامل ہیں، جنھیں محمد صادق مبارکپوری نے

حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب حافظ فاؤنڈیشن غازی پور سے 2021ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کا بیشتر حصہ عملاً صحافت کے میدان میں گزرا اور روزنامہ ''زمزم'' ہفت روزہ ''انصار'' روزنامہ ''جمہوریت''، روزنامہ ''انقلاب'' اور ماہنامہ ''البلاغ'' میں انہوں نے مفوضہ خدمات انجام دیں ۔جس زمانہ میں وہ ان اخبارات ورسائل سے منسلک تھے ان کے قلم سے دینی، علمی، ادبی اور سیاسی وتاریخی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے اور کبھی کبھی حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔اسی طرح جب کبھی کوئی قد آور شخصیت یا کوئی ایسا جن سے مضمون نگار کا قریبی رشتہ یا خاص تعلق ہو، اگر اس دنیا سے رخصت ہوجاتا تو مذکورہ بالا کسی اخبار یا رسالہ میں اس پر تعزیتی مضمون لکھ کر شائع کردیتے ،جس میں مرحوم کو اس کے نیک اعمال واخلاق کی بدولت یاد کر کے خراج تحسین پیش کرتے تھے۔

جن وفات یافتگان پر اپنے تأثرات مضمون نگار نے ان مضامین میں قلم بند کیے ہیں، ان کا تعلق سماج کے ہر طبقہ سے ہے، چنانچہ علماء میں مولانا حسین احمد مدنی ،مولانا شبیر احمد عثمانی ،مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ،مولانا ثناء اللہ امرتسری ،مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ،مولانا قاری محمد طیب ،ادباء وشعراء میں مولانا عبدالماجد دریابادی ،رام بابو سکسینہ ،علامہ انور صابری ، ماہرالقادری ،سیاست دانوں اور حکمرانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد ، پنڈت جواہر لعل نہرو ، جمال عبدالناصر ،شاہ افغانستان امان اللہ خان ،شاہ سعود بن عبدالعزیز آل سعود ،شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود ، عالمی شخصیات میں مفتی امین الحسینی ،مولانا بدیع الزماں سعید نورسی ،مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اعزہ واقرباء میں دادا حاجی اسداللہ ، والد حاجی محمد حسن مبارکپوری اور بھائی قاضی حیات النبیؒ وغیرہ ہر طبقہ کے اشخاص شامل ہیں۔مردوں کے علاوہ اس میں دو عورتوں یعنی رابعہ خاتون اور فاطمہ خاتون کا بھی تذکرہ ہے۔

وفیات کے اس مجموعہ میں شامل نصف کے قریب افراد سے مصنف کا براہ راست تعلق تھا ، اسی لئے دوسروں کے مقابلہ ان کے حالات زیادہ تفصیل سے درج ہیں اور درمیان میں کہیں کہیں ایسے واقعات کو بھی بیان کیا ہے جو جانبین کی زندگی میں ماضی میں پیش آئے تھے، مثلاً مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی کی وفات میں ہے:

> ''راقم سے مولانا مرحوم کے تعلقات اس وقت ہوئے ، جب کہ وہ 1947ء میں تقسیم کے بعد مدرسہ نورالعلوم بہرائچ میں نئے مدرس ہوکر تشریف لائے تھے اور مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی مرحوم نے جو اس وقت حکومت یوپی کے پارلیمنٹری سکریٹری تھے ، اپنی نگرانی میں بہرائچ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''انصار'' جاری کیا، راقم اس کا مدیر تھا اور مولانا عبدالحفیظ صاحب معاون مدیر تھے، تقریباً چھ ماہ ہم دونوں ایک جگہ بلکہ ایک ہی ساتھ رہتے تھے، اس مدت میں اکثر وبیشتر ساتھ ہی لکھنؤ آنا جانا ہوتا تھا، اس کے

بعد راقم بمبئی اور مولانا لکھنؤ چلے گئے۔'' (79)

ان مضامین کے مطالعہ سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قاضی صاحب کا قلم گروہی اور مذہبی عصبیت سے بالکل پاک تھا، لہذا جس خوش الحانی سے انہوں اپنے اساتذہ، اعزہ واقرباء اور دوسرے مسلمانوں کے مناقب بیان کیے، اسی خوش کن انداز میں انہوں نے بعض ہندو دانشوروں کا تذکرہ کیا ہے، اس کی واضح مثالیں پنڈت جواہر لعل نہرو اور رام بابو سکسینہ کے تراجم میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

9۔ جواہر القرآن

قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے تحریر شدہ مضامین پر مشتمل یہ کتاب حال (2022ء) ہی میں قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ موصوف روزنامہ ''انقلاب'' ممبئی میں ''جواہر القرآن'' کے عنوان سے قرآن کی کسی آیت یا اس کے جزء کا ترجمہ مع تشریح بیان کرتے تھے، جس میں بعض دفعہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ محمد صادق مبارکپوری نے اسی کالم سے قرآن کے پہلے پانچ پاروں کی آیات پر مشتمل مضامین کا انتخاب کر کے ترتیب وار اس کتاب میں درج کیا ہے۔

592 صفحات پر مبسوط یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، جس میں پارہ اوّل تا پنجم کی تقریباً 270 آیات یا ان کے اجزاء کا ترجمہ وتشریح شامل ہے۔ اس میں مضامین کی مجموعی تعداد 560 ہے اور اکثر مضامین میں تکرار ہے کیونکہ قاضی صاحب کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ بعض قرآنی آیات پر وقفہ وقفہ سے مضامین لکھتے تھے، اس لئے قارئین جب اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو جگہ جگہ ایک ہی آیت سے متعلق کئی مضامین ان کی نظر سے گزریں گے اور سیاق وسباق کے لحاظ سے ایک کو دوسرے سے مختلف پائیں گے، حتیٰ کہ آیت کے ترجمہ میں بھی لفظی فرق نظر آئے گا۔

مرتب نے اس کتاب کے مضامین کو تفسیر قرآن سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ قرآنی آیات کے معنی ومفہوم سمجھانے کے لئے جو کچھ اس میں ہے وہ مضمون نگار کی محض ذاتی آراء ہیں، جنہیں مسلم معاشرے کی اصلاحی ودینی خدمت کے لئے لکھا گیا تھا اور تفسیر قرآن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، خود قاضی صاحب نے بھی انہی مضامین پر مشتمل اپنی پہلی کتاب ''معارف القرآن'' کے ابتدائیہ میں صراحت کے ساتھ اس کے تفسیر ہونے سے انکار کیا ہے۔ (80) البتہ جہاں تک اس کی افادیت واہمیت کا تعلق ہے تو بلاشبہ دینی واصلاحی لحاظ سے قارئین کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

غیر مطبوعہ اور گم شدہ کتب اور کتابچے

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں ایک قسم ان کتابوں کی بھی ہے جو گم ہو گئیں یا پھر کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکیں، مصنف نے انہیں زمانۂ طالب علمی اور عملی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں لکھا تھا، مزید برآں بعض موضوعات ایسے بھی تھے جن پر عمر کے آخری حصہ میں وہ مواد جمع کر رہے تھے مگر پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے قبل ہی خود ان کی وفات ہو گئی اور یہ کام ناقص ہی رہ گیا۔ اس سلسلہ میں خود صاحبِ کتاب اور ان کے معاصرین کی تحریروں کے حوالہ سے جن چند کتب اور کتابچوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

1۔خیر الزاد فی شرح بانت سعاد

یہ کتابچہ قاضی اطہر مبارکپوری کی تصنیفی کوششوں کا نقش اولین ہے جسے انہوں نے 1936ء میں، جبکہ وہ طالب علم تھے، بڑے سائز کے بیس صفحات پر عربی زبان میں تحریر کیا تھا۔

مختصر سا یہ کتابچہ حضرت کعب بن زہیرؓ کے مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' (81) کی شرح ہے۔ اس کے شروع میں تین صفحے کا مقدمہ ہے، جس میں حضرت کعب بن زہیرؓ کے حالات، قصیدہ کا واقعہ اور اس کے اشعار کی تقطیع پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، بعد ازاں قصیدہ کے ایک ایک شعر کو علیحدہ علیحدہ لکھ کر اسی کے ضمن میں ہر لفظ کی لغوی تشریح اور معنی درج کر دیئے گئے ہیں، لیکن یہ ترتیب شروع کے اشعار ہی میں قائم ہے، بعد کے اشعار میں فقط الفاظ کی تشریح پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ غیر مطبوع شرح آج بھی ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

2۔اصحابِ صفہ

قاضی اطہر مبارکپوری نے طالب علمی کے زمانہ میں حفیظ جالندھری (م 1982ء) کی کتاب ''شاہنامہ اسلام'' کے طرز پر ''اصحابِ صفہ'' کے عنوان سے سوا دو سو اشعار کی ایک نظم تحریر کی، جس میں انہوں نے اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے اسماء و احوال بیان کیے تھے۔ لکھنے کے بعد انہوں نے اس کا مسوّدہ اپنے استاذ مولانا سید فخر الدین احمد اور مولانا سید محمد میاں کو دکھایا تو دونوں نے اسے پسند کیا اور جہاں کہیں اس میں خامی نظر آئی اس کی اصلاح کر دی۔ مسوّدہ جب پوری طرح تیار ہو گیا تو قاضی صاحب نے اشاعت کی غرض سے 1940ء میں اسے ممبئی کے ایک پبلیشرز کے پاس روانہ کر

دیا،اس کے بعد اس کا کیا ہوا؟ کچھ پتہ نہ چل سکا اور مسوّدہ کی جو نقل ان کے پاس موجود تھی، وہ بھی گم ہوگئی۔(82)

3۔ مرآت العلم

مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کے زمانہ میں قاضی صاحب نے جو پانچ کتابیں تحریر کی تھیں، ان میں سے ایک عربی زبان میں زیرِ بحث کتابچہ "**مرآت العلم**" بھی ہے۔ علم وفن کے حصول میں ہمارے اسلاف کی جو کدوکاوش رہی ہے اور عہد قدیم میں اس کے لئے انہوں نے جو مشقت و پریشانیاں برداشت کی تھیں، یہ کتابچہ ان سے متعلق مختصر معلومات وواقعات پرمبنی ہے۔

مؤلف نے زمانۂ طالب علمی میں اس کے لئے فہرست ابن ندیم، تذکرۃ الحفاظ، وفیات الاعیان اور تہذیب التہذیب سے اقتباسات نقل کیے، (83) اور جب مدرسہ احیاء العلوم میں مدرس ہوئے تو موضوع کی مناسبت سے انہی اقتباسات میں جگہ جگہ عناوین قائم کر کے یہ کتابچہ ترتیب دیا اور اس کا نام "**مرآت العلم**" تجویز کیا۔ اس حوالہ سے کتابچہ کے آخری صفحہ پر یہ عبارت درج ہے:

"کنت الفت هذاالکتاب فی زمن الطلب ثم بیّضتة و سمّیته "مرآت العلم". (84)

متوسط سائز کے 54 صفحات پر مشتمل یہ ایک شخصیت ساز کتاب ہے، جس کا طرز مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کتاب "علمائے سلف اور نابینا علماء" سے ملتا جلتا ہے، البتہ دونوں میں زبان اور ضخامت کا فرق ہے۔ قاضی صاحب نے اسے مدارس اسلامیہ ہند کے طلبہ کے لئے ترتیب دیا تھا اور مجلس ادارت مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور، اعظم گڑھ کے زیر اہتمام اس کی طباعت واشاعت کا ارادہ رکھتے تھے۔(85) لیکن یہ کتابچہ نہ شائع ہوا اور نہ ہی طلبہ اس سے فائدہ اٹھا سکے، بلکہ فقط ایک مسودہ ہی بن کر رہ گیا، جو آج بھی ان کے کتب خانے میں دوسری سیکڑوں کتابوں کی طرح الماری کی زینت ہے۔

4۔ الصالحات

قاضی صاحب کی گمشدہ تصانیف میں ایک کتابچہ "الصالحات" ہے، جسے انہوں نے تقسیم ملک سے قبل الاستیعاب، الاصابہ اور اسد الغابہ وغیرہ کتابوں سے صحابیات رضی اللہ عنہن کے دل آویز واقعات نقل کر کے خاص خواتین کے لئے تحریر کیا تھا۔(86) تکمیل کے بعد انہوں نے اس کا مسودہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کو چھاپنے کے لئے دیا، مگر وہ شائع نہ ہوسکا اور نہ ہی مسودہ انہیں واپس ملا، البتہ اس سے متعلق حسب ذیل تحریر ان کے پاس

محفوظ رہی، جس کی رو سے انہوں نے پچاس روپے کے عوض میں اشاعت کے تمام حقوق ناشر کو منتقل کردیے تھے:

> ''باعث تحریر ایں کہ: مبلغ پچاس روپے نصف جس کے پچیس روپئے ہوتے ہیں، بابت حق تصنیف و طباعت دائمی مسوّدہ ''الصالحات'' جو میرا تصنیف کردہ ہے فرم ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور سے وصول پائے۔ اقرار ہے کہ میں اس مسودہ کو نہ خود طبع کرونگا اور نہ کسی تاجر کتب یا پبلیشرز کو طبع کرنے کی اجازت دونگا، لہذا یہ رسید لکھ دی تا کہ سندرہے۔'' (87)

یہ تحریر گویا کہ کتابچہ کی رائلٹی تھی جو انہوں نے زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ اپنی کسی کتاب پر لی تھی اور مسودہ شائع نہ ہونے کی صورت میں انہوں نے اپنی علمی کاوش کو فروخت نہ کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

سطور بالا میں مذکور ان کتابوں کے علاوہ بعض موضوعات ایسے بھی تھے جن پر قاضی اطہر مبارکپوری مستقل تصانیف رقم کررہے تھے، لیکن انہیں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ بعض کتابیں زیر ترتیب تھی، بعض پر وہ کافی کچھ مواد جمع کرچکے تھے اور بعض کا بیشتر حصہ مسوّدہ کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنی خودنوشت سوانح ''کاروان حیات'' میں انہوں نے مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

(1) طب عربی (2) کتب اور کتب خانے (3) حیات امام احمد بن حنبل (4) حیات لیث بن سعد (5) اقوالِ حکماء (6) **المختار الادبی من الأمالی** (7) افادات امام احمد ابن حنبل (8) اموی خلفاء وامراء اور تدوین حدیث، اور (9) سیرت رسولؐ خود حضورؐ کی زبانی۔

ان کے علاوہ حسب ذیل کتابیں دوسروں نے ان سے منسوب کی ہیں:

(1) **خطبات الخلفاء الراشدین و مکاتیبھم و اقوالھم** (2) مکتوبات ائمہ اربعہ (3) اسلام میں قربانی کی حقیقت (4) علم حدیث کی مختصر تاریخ (5) حیات امام احمد (6) دروس النبیؐ اور (7) ندائے حرم۔

ان میں اول الذکر پانچ کتابیں ان کی موجودہ مطبوعہ کتاب ''حیات جمیلہ یعنی اسلامی نظام زندگی'' کے آخر میں مذکور فہرست کتب میں درج ہیں۔ نمبر چھ کا ذکر مجلّہ ''الحرم'' کے حوالہ سے ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی نے اپنی کتاب ''**القاضی ابو المعالی اطھر المبارکفوری**'' میں کیا ہے۔ (88) اور آخر الذکر کو پروفیسر شمس تبریز نے اپنے ایک مضمون میں قاضی صاحب کی کتاب بتایا ہے (89) حالانکہ ان میں سے کوئی بھی کتاب نہ دستیاب ہوئی اور نہ کسی پر کچھ تفصیلات ملی۔

حواشی وحوالہ جات

(1) مبارکپوری، قاضی اطہر، کاروانِ حیات، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء، ص:47

(2) اس سلسلہ کی فقط آخری کتاب ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' ہی قاضی اطہر مبارکپوری کے ممبئی سے مبارک پور واپس آنے کے بعد 1982ء میں شائع ہوئی تھی۔

(3) اس زمانہ میں سندھ کے جغرافیائی حدود آج کل کے صوبۂ سندھ سے بالکل مختلف تھے، اس میں موجودہ پاکستان کے علاوہ افغانستان، ایران، کشمیر، مغربی پنجاب اور راجستھان و گجرات وغیرہ کے بعض علاقے بھی شامل تھے، جیسا کہ مولوی عبدالحلیم شرر نے ''تاریخ سندھ'' کے ص:4 تا 6 پر اور سید ابوظفر ندوی نے اپنی کتاب ''تاریخ سندھ'' کے مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے۔

(4) اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لئے قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' ملاحظہ کیجیے۔

(5) دسنوی، سید ابوظفر، تاریخ سندھ (دیباچہ)، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2018ء، ص:19

(6) ادروی، اسیر، ''حدیث یار''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء، (مدیر: اسیر ادروی)، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس، ص:53

(7) مبارکپوری، قاضی اطہر، عرب و ہند عہد رسالت میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2004ء، ص:64

(8) مبارکپوری، قاضی اطہر، ائمہ اربعہ، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، 2017ء، ص:32،31

(9) ان احادیث کی بنا پر برصغیر کے بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ غزوۂ ہند ابھی نہیں ہوا۔

(10) مبارکپوری، قاضی اطہر، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، فیمس بکس، لاہور، 1989ء، ص:107

(11) ایضاً، ص:97

(12) مبارکپوری، قاضی اطہر، خلافتِ عبّاسیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1982ء، ص:317

(13) کاروان حیات، ص:113,112

(14) ''رجال السند والہند'' میں جن اہلِ علم حضرات کی تقریظیں شامل ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا ابوالوفاء افغانی، صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ، حیدرآباد (2) شیخ عبدالمنعم النمر عضو بعثۃ الازہر فی الہند (3) شیخ عبدالعال العقباوی، عضو بعثۃ الازہر فی الہند (4) شیخ احمد سباعی مکی، آڈیٹر وزارت مالیات حکومت سعودی عرب و مؤلف تاریخ مکہ (5) شیخ سلیمان دارانی، مدرس جامعہ بنی امیہ، دمشق (6) شیخ سعد بن عبداللہ الشملان،

بحرین (7) استاذ احمد فرید، مقیم ممبئی (8) شیخ محمود بن الندیر طرازی مدنی، مدرس حرم مکی۔

(15) مبارکپوری، قاضی اطہر، رجال السند والہند الی القرن السابع، المکتبۃ الحجازیہ ممبئی، 1958ء، ص:254

(16) ایضاً، ص:54

(17) ایضاً، ص:15

(18) ایضاً

(19) اوروی، اسیر، ''سخنہائے گفتنی''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص:5،6

(20) کاروان حیات، ص:117

(21) مبارکپوری، قاضی اطہر، اسلامی نظام زندگی، ادارہ فیضان معرفت بلساڑ، گجرات، 2004ء، ص:9

(22) کاروان حیات، ص:117

(23) مبارکپوری، قاضی اطہر، افادات حسن بصریؒ، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء، ص:36

(24) مبارکپوری، قاضی اطہر، مئے طہور، (مرتب: قمر الزماں مبارکپوری)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2006ء، ص:97

(25) مبارکپوری، قاضی اطہر، حج کے بعد، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء، ص:5

(26) نگارافشاں، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری حیات وخدمات، ایویروزا اکاڈمی، علی گڑھ، 2018ء، ص:111

(27) مبارکپوری، قاضی اطہر، معارف القرآن، کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور، بھڑوچ، 2006ء، ص:21

(28) مئے طہور، ص:98

(29) قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کی تصریح کتاب کے مقدمہ میں کی ہے۔

(30) البتہ ''بنات حرم'' کے عنوان سے اس کی آخری قسط ستمبر 1957ء اور جنوری 1958ء کے البلاغ میں شائع ہوئی تھی۔

(31) اعظمی، حبیب الرحمٰن، اعیان الحجاج، تنویر پریس لکھنؤ، 1958ء، ص:19،20

(32) مئے طہور، ص:88

(33) مبارکپوری، قاضی اطہر، علیؓ وحسینؓ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2007ء، ص:15

(34) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، ستمبر 1960ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص:189

(35) مبارکپوری، قاضی اطہر، تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء، ص:25

(36) کتاب ''مآثر ومعارف'' میں شامل تمام مقالات ماہنامہ ''البلاغ'' ممبئی اور ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں، نیز بعض کتابی شکل میں منظرِ عام پر بھی آ چکے ہیں۔

(37) کاروان حیات،ص:108

(38) ندوی،سید سلیمان،حیات شبلی،شبلی اکیڈمی دارالمصنفین ،اعظم گڑھ،2015ء،ص:113

(39) ابوعلی،''مولانا ا قاضی اطہر مبارکپوری اور حیات شبلی''،مشمولہ: ماہنامہ دارالعلوم، جولائی 1980ء،(مدیر: حبیب الرحمٰن اعظمی)،دارالعلوم،دیوبند،ص:32

(40) مبارکپوری،قاضی اطہر،تذکرۂ علمائے مبارک پور،مکتبہ الفہیم ،مئوناتھ بھنجن،2010ء،ص:44

(41) جیسا کہ مصنف نے مقدمۂ کتاب میں اس کی تصریح کی ہے۔مزید تفصیلات کے لئے کتاب'' آثار واخبار''،جلد اول،صفحہ 6ملاحظہ کیجئے۔

(42) کاروان حیات،ص:115

(43) مبارکپوری،قاضی اطہر،اسلامی شادی،فرید بک ڈپو،نئی دہلی،2005ء،ص:33

(44) ایضاً،ص:49

(45) مئے طہور،ص:100

(46) مبارکپوری،قاضی اطہر،قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک،مکتبہ صوت القرآن،دیوبند،سن اشاعت غیر مذکور،ص:8

(47) کاروان حیات،ص:98

(48) مبارکپوری،قاضی اطہر،دیارِ پورب میں علم اور علماء،البلاغ پبلیکیشنز،نئی دہلی،2020ء،ص:46

(49) صدیقی،ظفر احمد،'' قاضی صاحب بحیثیت مورّخ ومصنف''،مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام،''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''،ص:51-71

(50) مبارکپوری،قاضی اطہر،تدوین سیر ومغازی،شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم،دیوبند،1990ء،ص:42

(51) مبارکپوری ، قاضی اطہر ، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم وتربیت ، شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم ، دیوبند، 2017ء،ص:10

(52) صحابہ کی اس فہرست میں سیدنا ابی بن کعب ،عبادہ بن صامت ،سعد بن ابی وقاص ، براء بن عازب ، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ،امّ المومنین حضرت عائشہ،ابوسعید خدری، سہل بن سعد،زید بن ثابت ،عبداللہ بن مسعود،عبداللہ بن عمر،عبد اللہ بن عباس،عبداللہ بن عمرو بن عاص،ابودرداء،معاذ بن جبل،انس بن مالک،ابوموسیٰ اشعری،عقیل بن ابی طالب ،عمران بن حصین،عبداللہ بن مغفل ،عبدالرحمٰن بن غنم ،ابوامامہ باہلی ، واثلہ بن اثقع اور عقبہ بن عامر جہنی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء شامل ہیں۔

(53) قاضی اطہر مبارکپوری کے تمام سوانح نگاروں نے''بنات اسلام کی دینی وعلمی خدمات''اور''خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات'' دونوں کو دوالگ الگ کتابیں شمار کیا ہے،حالانکہ اس کا سب کو اعتراف ہے کہ مؤخر الذکر اوّل الذکر کا اضافہ شدہ

ایڈیشن ہے لیکن پھر بھی دونوں پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کیا ہے اور فہرست کتب میں بھی دونوں کو دو الگ الگ کتابیں شمار کیا ہے۔

(54) مولانا آزاد نے یہ خطبہ 8 جنوری 1951ء کو دار العلوم دیوبند میں طلبہ سے مخاطب ہو کر دیا تھا، جیسا کہ مصنف نے مقدمہ میں اس کی صراحت کی ہے۔

(55) امام ابن قیم کا پورا نام حافظ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابوبکر بن ایوب بن سعد بن حریز الزرعی الدمشقی ہے، لیکن صرف ابن قیم سے مشہور ہوئے۔ 691ھ میں دمشق کے قریب ''زرع'' نامی گاؤں میں آپ کی ولادت ہوئی اور 751ھ میں انتقال کر گئے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ آپ کے استاذ ہیں، مسلکاً حنبلی تھے اور ساٹھ سے زیادہ کتب آپ کی تصانیف میں شامل ہیں جن میں ''زاد المعاد، تلبیس ابلیس، اعلام المعوقین اور الطب النبوی'' مشہور کتابیں ہیں، انھی میں سے ایک ''کتاب الروح'' بھی ہے، جس میں آپ نے روح سے متعلق قرآن وحدیث میں جو کچھ مواد موجود تھا، اسے اس کتاب میں جمع کر کے اس کے مختلف مباحث پر بحث کی ہے، اسی میں روح کی ایک قسم ''نفس'' بھی زیر بحث ہے، جس کے تین احوال یعنی نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن کی سورۃ بروج میں کیا ہے۔ مصنف نے اسے موضوع بنا کر قرآن کی دیگر آیات کی روشنی میں اس کی تاویل وتشریح کی ہے اور قاضی اطہر مبارکپوری نے اسی کا اردو ترجمہ کتابچہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔

(56) مبارکپوری، قاضی اطہر، صفات نفس، نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند، 2015ء، ص:5

(57) مبارکپوری، قاضی اطہر، مسلمان، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2006ء، ص:12

(58) کاروان حیات، ص:129,128

(59) مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (م2009ء) قاضی اطہر مبارکپوری کے ایک علمی دوست اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں لکچرار کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے دار المصنفین سے مبارک پور کے اپنے ایک منظوم سفرنامہ میں مبارک پور کی دیگر مایہ ناز علمی شخصیات کے ساتھ ساتھ مولانا احمد حسین رسولپوری کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس میں انہیں علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے طرز کا شاعر بتایا ہے۔ یہ منظوم سفرنامہ انہوں نے قاضی اطہر مبارکپوری سے مخاطب ہو کر ایک خط کے انداز میں لکھا تھا، جو'' کاروان حیات'' میں موجود ہے، جبکہ مولانا احمد حسین رسولپوری کے تفصیلی حالات قاضی صاحب کی ایک دوسری کتاب ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' میں محفوظ ہیں۔

(60) صاحبِ دیوان کا مرثیہ بھی اسی کتاب کے صفحہ نمبر 9 پر مذکور ہے، جسے ان کے معاصرین میں سے ملا رحمت علی مبارکپوری نے ان کی وفات کے موقع پر لکھا تھا۔

(61) مؤلف کتاب کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔

(62) مولانا قاضی اطہر مبارکپوری حیات وخدمات، ص:119

(63) عمر بن احمد، ابوحفص، تاریخ اسماء الثقات، (تحقیق وتعلیق: قاضی اطہر مبارکپوری)، شرف الدین الکتبی واولادہ، ممبئی،

1986ء،ص:5

(64) مبارکپوری، قاضی اطہر،علمائے اسلام کی خونیں داستیں، (مرتب: قاضی سلمان مبشر)، قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ،2009ء،ص:10

(65) ایضاً،ص: 105

(66) مبارکپوری، قاضی اطہر،علماءِاسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں،فرید بک ڈپو،نئی دہلی، 2004ء،ص:14

(67) راقم کے خیال میں قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب کی ابتدا1987ء ہی میں کر دی تھی اور تا عمر وقفہ وقفہ سے اس میں لکھتے رہے،اس کی توضیح مطبوعہ کتاب کے صفحہ 131 پر مذکور اس عبارت ''اصل اس تحریر سے چار دن پہلے ان کا خط آیا کہ ان کی اہلیہ محترمہ 25 اکتوبر 1991ء کو انتقال کر گئیں، اللہ مغفرت فرمائے۔'' سے ہوتی ہے، اکتوبر 1991ء میں لکھی گئی یہ عبارت درمیان کتاب میں واقع ہے، اس کے لکھنے کے ساڑھے چار سال بعد 14 جولائی 1996ء کو موصوف اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

(68) یہ نسخہ نومبر 2003ء میں فرید بک ڈپو نئی دہلی سے شائع ہوا تھا، حالانکہ اسے ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' کے'' قاضی اطہر نمبر'' سے قبل شائع ہونا چاہئے تھا، کیونکہ فرید بک ڈپو والے نسخہ کے آخری صفحہ پر ماہنامہ ''ضیاءالاسلام'' کے اس خصوصی نمبر کا اشتہار موجود ہے۔

(69) البتہ پہلا اور دوسرا سفرنامہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

(70) مبارکپوری، قاضی اطہر، قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے، (مرتب: ضیاء الحق خیرآبادی)، قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ، 2005ء،ص:13

(71) مئے طہور،ص:119

(72) قاضی صاحب کی نظمیں لاہور کے سہ روزہ ''زمزم'' اخبار میں اسی عنوان سے شائع ہوتی تھی، لہٰذا مرتب نے اسی مناسبت سے یہ نام تجویز کیا۔

(73) احسان دانش، جہانِ دگر، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء،ص:453

(74) مبارکپوری، قاضی اطہر، ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت، (مرتب: محمد صادق مبارکپوری)، مکتبۃ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، 2006ء،ص:3

(75) ایضاً،ص:8

(76) مبارکپوری، قاضی اطہر، مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ، (مرتب: محمد صادق مبارکپوری)، مکتبۃ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، 2006ء،ص:3

(77) خط میں نام کی جگہ لفظ ''برادر'' مذکور ہے۔ ممکن ہے کہ امام صاحب دینی حیثیت سے کسی کو بھائی کہہ کر مخاطب ہوئے ہوں۔

(78) مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ، ص:40

(79) مبارکپوری، قاضی اطہر، آسودگانِ خاک، (مرتب: محمد صادق مبارکپوری)، حافظ فاؤنڈیشن، غازی پور، 2021ء، ص:138، 137

(80) معارف القرآن، ص:21

(81) قصیدہ ''بانت سعاد'' صحابیٔ رسولؐ حضرت کعب بن زہیرؓ کے اشعار کا مجموعہ ہے، جسے انہوں نے قبولِ اسلام کے وقت عفوودرگزر کی خاطر بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش کیا تھا۔ اس قصیدہ کو ''قصیدۃ اللامیۃ'' اور ''قصیدۃ بردہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قصیدہ زبان کی صفائی، ندرتِ خیال اور رفعتِ فکر کا ایسا نمونہ ہے کہ لغوی اور فنی اعتبار سے اس کو عربی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے، جس کے سبب ابتدا ہی سے علماء، ادباء اور ناقدین کی توجہ اس کی طرف مرکوز رہی ہے، اسی لئے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور شرح، حواشی وتعلیقات لکھے گئے۔ غیر ممالک کے اساطینِ علم کی طرح علمائے ہند نے بھی اس کی جانب خاص توجہ مبذول کی اور عربی، فارسی اور اردو میں اس کا ترجمہ وتشریح کی۔ اس حوالہ سے مولانا عبدالحی حسنی نے ''**الثقافة الاسلامیه فی الهند**'' میں پانچ شروحات کا، جبکہ مولانا عاصم اقبال مجیدی نے اپنی کتاب ''قصیدہ بانت سعاد'' (اردو) میں نو کا تذکرہ کیا ہے۔

(82) کاروانِ حیات، ص:51، 50

(83) ایضاً، ص:50، 49

(84) مبارکپوری، قاضی اطہر، مرآت العلم، غیر مطبوعہ، ص:54

(85) کاروانِ حیات، ص:64

(86) لیکن ''مئے طہور'' کے مرتب قمر الزماں مبارکپوری نے اس کتاب کو قاضی اطہر مبارکپوری کی شائع شدہ کتابوں میں شامل کیا ہے اور غالباً انہی کی پیروی ڈاکٹر نگار افشاں نے اپنے تحقیقی مقالہ ''مولانا قاضی اطہر مبارکپوری: حیات و خدمات'' میں کی ہے، حالانکہ ''کاروانِ حیات'' کے صفحہ 50، 95 اور 96 پر اس رسالہ سے متعلق جو کچھ درج ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس کی مزید تحقیق کے لئے صاحبِ کتاب کے پوتے قاضی عدنان سے جب اس کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا ''کہ فی الحال ہمارے پاس اس کی کوئی کاپی موجود نہیں ہے، اگر کسی سے حاصل ہوئی تو آپ کو اطلاع کریں گے۔''

(87) کاروانِ حیات، ص:95

(88) اعظمی، ڈاکٹر اورنگ زیب، القاضی ابوالمعالی اطہر مبارکفوری، مرکزی پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2020ء، ص:91

(89) شمش تبریز، ''مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص:50

باب چهارم

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات
کا تجزیاتی مطالعہ

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ

پچھلے باب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی خدمات کا تفصیلی تعارف ہے۔اس باب میں ان کی انہی علمی خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

قاضی اطہر مبارکپوری خالص علمی آدمی تھے اور اپنی پوری زندگی انہوں نے لکھنے پڑھنے ہی میں صرف کی تھی ۔وہ سماجی کاموں میں بھی مصروف رہتے ،مگر یہ ان کی زندگی کا ایک جزوی پہلو تھا جس میں وہ بہت کم دلچسپی رکھتے تھے۔تعلیم کا ذوق ان میں اس حد تک تھا کہ ممبئی کے زمانۂ قیام میں کتابیں ان کے کمرہ میں ہمیشہ چٹائی پر بکھری ہوتیں اور وہ ان کے مطالعہ میں منہمک رہتے ،دوست واحباب میں سے کوئی ان سے ملاقات کے لئے آتا تو وہ ان کو اسی حال میں پاتا تھا۔ ہمہ وقت لکھنے پڑھنے کے اس ماحول کا نقشہ انہوں نے خود ڈاکٹر عبدالمنعم النمر سے منسوب درج ذیل واقعہ میں کھینچا ہے،جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ''وہ (عبدالمنعم النمر) میرے کمرے میں آنے جانے لگے، پہلی بار آئے اور چٹائی پر کتابوں اور اخبارات کو بکھرا ہوا دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے " **یا سلام ! تأهلت بالكتب والكتابة** " ۔یہ جامع جملہ میرا بہترین اور جامع تعارف ہے۔''(1)

علمی کاموں میں مصروفیت کے سبب جو کچھ قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے منظر عام پر آیا اس کا تفصیلی تعارف سابقہ باب میں کرایا جا چکا ہے۔اس باب میں ان کے اس طریقۂ کار سے بحث کی جائے گی جو انہوں نے اپنی تحریروں میں اختیار کیا تھا،اس کے علاوہ محققین نے ان کے جن تحقیقی کاموں پر تنقیدیں کیں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی ،ساتھ ہی ان تحریروں کو بھی پیش کیا جائے گا جن میں اہلِ علم حضرات نے ان کے علمی و تحقیقی کاموں کا اعتراف کیا ، پھر ان علمی و تحقیقی کاموں کی بنا پر انہیں علمی دنیا میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا، آخر میں معاصر علماء و محققین کے خطوط کے حوالہ سے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا اسلوب تحریر

قاضی اطہر مبارکپوری کا علمی سرمایہ ان کے وہ تمام مقالات ومضامین ہیں، جو متعدد علمی و تحقیقی رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئے یا پھر وہ کتابیں جو مختلف اداروں سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں۔ عناوین کے لحاظ سے یہ تمام تحریریں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، البتہ موضوع کے اعتبار سے ان کی نوعیت تاریخی ہے، جن میں حکمرانوں، علاقوں، ائمہ رجال، علوم وفنون اور عوام الناس کے حالات وواقعات بیان کیے گئے ہیں، لیکن ان میں ایک بڑا فرق معیار کا ہے جس کے تحت ان کی تمام تحریروں کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول:۔عوامی یا اخباری تحریریں

اس سے مراد وہ مقالات ومضامین اور کتابیں ہیں، جو قاضی اطہر مبارکپوری نے فن تحقیق کے اصول و ضوابط کا لحاظ رکھے بغیر محض معلومات فراہم کرنے کی غرض سے تحریر کیے۔ اصطلاح میں اس کے لئے ''غیر تعلیمی تحریریں'' (Non Academic Writings) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے جو مضامین روزنامہ انقلاب میں ''جواہر القرآن'' اور ''احوال ومعارف'' کے عنوان سے شائع ہوتے تھے وہ اسی نوعیت کی عوامی تحریریں ہیں، ان میں فراہم کردہ معلومات گرچہ حقائق پر مبنی ہیں، لیکن ان میں کہیں بھی حوالوں کا ذکر نہیں ملتا، جو کہ فن تحقیق کا ایک لازمی عنصر ہے، اسی طرح ان میں مضمون نگار کے تاثرات بھی شامل ہیں، پھر اس اخبار کے مخصوص کالم ''جواہر القرآن'' کے حوالہ سے خود مضمون نگار کی رائے بھی یہی ہے جس کی تصریح انہوں نے اسی کالم کے منتخب مضامین پر مشتمل اپنی کتاب ''معارف القرآن'' کے مقدمہ میں کی ہے، چنانچہ اس حوالہ سے وہ رقم طراز ہیں:

> ''میں نہایت صفائی سے عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ''معارف القرآن'' میں جو کچھ ہے، وہ نہ تفسیر ہے نہ تاویل، بلکہ قرآنی آیات کو سامنے رکھ کر ایک تحریر ہے، جو ہندوستان کے مسلمانوں پر موجودہ حالات کے پیش نظر تیار کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں کہیں کسی قسم کی نہ دقت ہے اور نہ وہ باتیں ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں ہوتی ہیں۔''(2)

اسی طرح الگ الگ موضوعات پر مبنی ان کی بعض وہ کتابیں بھی اس زمرہ میں شامل ہیں، جن کے مضامین روزنامہ ''زمزم'' یا ماہنامہ ''البلاغ'' وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں، مثلاً اسلامی نظام زندگی، آسودگانِ خاک، حج کے بعد، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک اور قاضی اطہر مبارکپوری کے سفر نامے۔ یہ وہ کتابیں ہیں، جن میں مصنف نے عوامی اسلوب تحریر اختیار کیا ہے، اس کی توضیح مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے جو کہ موصوف کی کتاب ''قاضی

اطہر مبارکپوری کے سفرنامے'' سے ماخوذ ہیں۔ وہ اس میں اپنے سفرناموں کا معیار قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی نئے مقام پر دو چار دن رہ کر وہ بھی ہنگامی حالات میں وہاں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے، اس لئے بھٹکل یا اہلِ بھٹکل کے بارے میں یا اور معلومات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک چلتا پھرتا تاثر ہے۔''(3)

دوم:۔ علمی و تحقیقی تحریریں

اس سے مراد قاضی اطہر مبارکپوری کے وہ مقالات و مضامین اور کتابیں ہیں، جنہیں لکھنے کے دوران انہوں نے فن تحقیق کے اصول وضوابط کا لحاظ رکھا، یعنی بنیادی مآخذ کا استعمال کرتے ہوئے ہر بات دلائل کے ساتھ پیش کی۔ فن تحقیق کی اصطلاح میں اسے ''علمی تحریریں'' (Academic Writings) کہا جاتا ہے۔ مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''برہان'' دہلی، ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند اور ماہنامہ ''البلاغ'' ممبئی میں شائع ہونے والے ان کے اکثر مقالات اور ان پر مبنی بعض کتابیں یعنی'' مآثر ومعارف، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت، تدوین سیر ومغازی، دیارِ پورب میں علم اور علماء، آثار واخبار اور طبقات الحجاج'' وغیرہ اسی نوعیت کی علمی تحریریں ہیں، نیز عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر مشتمل ان کی نو کتابیں بھی اسی زمرے کا سب سے اہم حصہ ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے ان میں سے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کے بنیادی اور قدیم ترین مآخذ کی روشنی میں معلومات فراہم کی۔ اس سلسلہ میں ان کا اسلوب یہ تھا کہ ایک ہی موضوع پر مختلف مصنفین کی روایتوں کو یکجا کرتے، اگر کسی موضوع پر مؤرخین کے مابین اختلاف ہوتا تو ان کی مختلف فیہ عبارتوں کو بیان کر کے ان کا موازنہ کرتے اور جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا اس کو اختیار کرتے، اگر بات پھر بھی واضح نہ ہوتی تو تمام اقوال کو ایک جگہ جمع کر دیتے، اسی طرح ایک عبارت سے موضوع کے مختلف پہلوؤں کی تخریج، روایتوں میں جرح وتعدیل اور مصنفین پر ان کی کسی عبارت کو لے کر کے تنقید کرنا بھی ان کے تحقیقی اسلوب کا ایک حصہ تھا، جسے انہوں نے اپنی اس دوسری قسم کی تحریروں میں اختیار کیا تھا، پھر ان میں بھی طریقۂ تحقیق کا یہ اسلوب انہوں نے عرب و ہند کی اسلامی تاریخ پر مبنی کتب ومقالات میں سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس موضوع کو زیرِ بحث لاکر اس پر تیس سال صرف کیے اور اس کے نتیجہ میں جو نو کتابیں منظرِ عام پر آئیں، علمی میدان میں انہیں متعلقہ موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ دیا گیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس موضوع پر ان کی پہلی کتاب'' **رجال السند والھند**'' کو ایک اکیڈمی کے کام سے تعبیر ہوئے لکھتے ہیں:

''ملک کے نامور انشاپرداز صحافی قاضی اطہر مبارکپوری کی جس کتاب کے لیے ہم چشم براہ تھے، شکر ہے کہ چند دن ہوئے وہ نہایت آب و تاب سے ٹائپ کے خوش نما حرفوں میں بمبئی سے شائع ہو گئی، یہ کتاب غیر منقسم بلکہ وسیع تر ہندوستان کے اہلِ کمال پر بہت تلاش اور تتبع سے لکھی گئی ہے، مدتوں سے اہلِ علم اور ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طبقہ میں اس کا چرچا تھا، اشاعت کی خبر پاتے ہی ہم نے اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اور بہت غور و فکر سے اس کا مطالعہ شروع کیا، اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب کی محنت و کاوش قابلِ داد ہے اور قاضی صاحب اس لحاظ سے مستحق مبارک باد ہیں کہ جو کام علمی اداروں کے کرنے کا تھا، وہ محض ذاتی دلچسپی و شوق کی بنا پر انہوں نے تنہا انجام دیا۔'' (4)

اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اس موضوع کی آخری کتاب ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' میں ان کی تحقیقی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''موصوف (قاضی اطہر مبارکپوری) نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے اور ان کی ان گرانقدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا اور نادر خزانہ کہا جا سکتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب منزلِ مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ لے کر آئے۔'' (5)

خود قاضی اطہر مبارکپوری بھی اپنے اس کام کو علمی میدان میں بیش بہا اضافہ تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی توضیح ان کی حسب ذیل تحریر سے ہوتی ہے:

''اس دور میں ہندوستان کے اسلامی ادب عالی میں عربی زبان میں جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور شائع ہوئی ہیں، ان میں فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد از مولانا فضل اللہ صاحب گیلانی، مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از مولانا عبیداللہ صاحب مبارکپوری، امانی الاخبار شرح معانی الآثار از مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، رجال السند والہند اور العقد الثمین از قاضی اطہر مبارکپوری خاص طور سے نمایاں ہیں اور پورے عالم اسلام کے علمی و دینی کارناموں میں شمار کی جانے کے قابل ہیں۔'' (6)

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر مبنی کتابوں کی روشنی میں قاضی اطہر مبارکپوری کے اسلوبِ تحریر سے بحث کی جائے اور ان کے اس طریقۂ تحقیق کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے ان کتابوں میں اختیار کیا تھا اور جن کی بنا پر ان کتابوں کو علمی دنیا میں اہمیت دی گئی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے جو طریقے اختیار کیے، وہ مختلف عناوین کے تحت ذیل میں مذکور ہیں:

1۔اولین اور معتبر مآخذ پر اعتماد

تحقیقی و علمی کاموں میں قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ سب سے اہم خوبی رہی ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، اس کے اولین اور معتبر مآخذ کا انتخاب کرتے اور انھیں کو بنیاد بنا کر اپنی کتاب یا مقالہ کو ترتیب دیتے تھے۔ ان کے یہاں ثانوی مآخذ کا استعمال بہت کم پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انہیں اگر عہدِ رسالتؐ سے متعلق معلومات جمع کرنی ہو تو وہ سب سے پہلے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کے بعد زمانہ ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے طبقات و سیر اور تاریخ کی کتابوں میں مواد تلاش کرتے ہیں، یعنی پہلے سیرت ابن اسحاق کو، پھر سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری اور فتوح البلدان وغیرہ کو دیکھتے ہیں۔

مآخذ کے اعتبار سے تمام تحقیقی کتابوں میں قاضی اطہر مبارکپوری کا یہی اسلوب رہا ہے، اس کی وضاحت ان فہرستِ کتب سے بھی ہوتی ہے، جو ''مراجع ومصادر'' کے عنوان سے ان کی اس نوعیت کی تمام کتابوں (رجال السند و الهند ، **العقد الثمین** ،**الهند فی عهد العباسیین** ،خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت بنوامیہ اور ہندوستان، ائمہ اربعہؒ، تدوین سیر و مغازی اور طبقات الحجاج وغیرہ) کے شروع یا آخر میں مذکور ہیں۔ ان فہرستِ کتب کی خاصیت یہ ہے کہ ان میں شامل ہر کتاب متعلقہ موضوع پر بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

2۔واقعہ سے متعلق روایات کی جمع وتطبیق

اولین مآخذ کے انتخاب کے بعد علمی تحریروں میں قاضی اطہر مبارکپوری کا جو طریقہ تحقیق رہا ہے، ان میں سے ایک متعلقہ موضوع پر واقعہ سے متعلق متعدد روایتوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حسب ذیل طریقے اختیار کرتے ہیں:

اول:۔ موضوع کے ایک ہی پہلو سے متعلق روایتیں انہیں جتنی کتابوں میں ملتی ہیں، سب کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں، مثلاً کتاب ''اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ'' کے صفحہ 64 پر حضرت حکم بن ابی العاص الثقفیؓ کو بحرین کے امیر بنائے جانے والے واقعہ میں ابن اثیر کی ''اسد الغابہ''، امام ذہبی کی ''تجرید اسماء الصحابہ'' اور علامہ بلاذری کی ''فتوح البلدان'' سے ماخوذ مندرجہ ذیل روایتیں ترتیب وار نقل کی ہیں:

1. ''كان اميراً على البحرين.''

ترجمہ:۔ حکمؓ بحرین کے امیر تھے۔

2.'' وأمر علی البحرین . ''

ترجمہ:۔اور بحرین کے امیر بنائے گئے۔

3.'' فوجہ اخاہ الی البحرین ومضی الی عمّان. ''(7)

ترجمہ:۔عثمانؓ نے اپنے بھائی کو بحرین روانہ کیا اور خود عمان گئے۔

ان تینوں روایتوں کا ایک ہی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ بحرین کے امیر بنائے گئے تھے۔

اسی طرح ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' میں ایک جگہ طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام اور تاریخ طبری کے حوالہ سے بنوحارث کے ایک وفد کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا واقعہ نقل کرنے کے بعد طبقات ابن سعد کے حوالہ سے مندرجہ ذیل حدیث بیان کرتے ہیں:

'' من ھٰولاء القوم الذین کانھم رجال الھند . ''

ترجمہ:۔یہ کون لوگ ہیں جو گویا ہندوستان کے آدمی ہیں؟

پھر اس کی توثیق میں ابن کلبی کے حوالہ سے اصابہ کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:

'' من ھٰولاء کانھم من الھند . ''(8)

ترجمہ:۔یہ کون لوگ ہیں گویا کہ ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں؟

دوم:۔متعلقہ موضوع پر روایتوں میں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے تو ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد اختلافات کی وضاحت کرتے ہیں، جیسا کہ عہد فاروقی میں ہندوستان کے تین ساحلی شہروں یعنی تھانہ، بھڑوچ اور دیبل پر حملہ کا واقعہ ہے۔ یہ حملے بحرین وعمان کے امیر حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ نے اپنے بھائی کی معیت میں پندرہ تا اکیس ہجری کے درمیان کیے تھے۔اس واقعہ سے متعلق علامہ بلاذری، یعقوبی، امام ابن حزم، علی بن حامد کوفی اور یاقوت حموی وغیرہ کے بیانات میں تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ کتنے شہروں پر حملے کیے گئے تھے؟ یہ حملے عہدِ فاروقی میں ہوئے یا عہدِ صدیقی میں؟ اور حضرت عثمانؓ خود ان غزوات میں شریک ہوئے تھے یا صرف اپنے بھائی حضرت حکمؓ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا؟۔قاضی صاحب نے ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے صفحہ 74 تا 80 پر تمام مؤرخین کے بیانات نقل کر کے ان کے ضمن میں اختلافات کی تصریح کر دی ہے۔(9)

اسی طرح مذکورہ کتاب کے صفحہ 112 تا 118 پر محمد بن قاسمؒ کے تذکرہ میں ان کی وفات کی بابت تاریخ ابن خلکان، تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ یعقوبی اور چچ نامہ کی روایات نقل کرنے کے بعد ان کے اختلافات پر روشنی ڈالی ہے۔(10)

سوم:۔ کبھی کبھی ایک ہی کتاب سے عبارت نقل کرنے کے بعد اس سے متعلق دوسری کتابوں کا ذکر متن میں کر دیتے ہیں، جیسا کہ کتاب ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' کے صفحہ 110 پر عہدِ فاروقی میں فتح مکران کے ضمن میں حضرت حکم بن عمرو ثعلبیؓ کی زبانی تاریخ طبری کے حوالہ سے چند اشعار نقل کر دیئے ہیں اور حوالوں کی جگہ پر تاریخ طبری کے علاوہ ابن اثیر کی الکامل اور تاریخ ابن خلدون کے حوالے درج کیے ہیں۔(11)

چہارم:۔ اور بعض دفعہ کوئی عبارت نقل نہیں کرتے، بلکہ اپنے الفاظ میں واقعہ بیان کرنے کے بعد جس کتاب میں وہ واقعہ مذکور ہوتا ہے صفحہ کے آخر میں اس کا حوالہ دے دیتے ہیں، مثلاً کتاب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' میں ایک مقام پر ابن سعد کی طبقات اور بلاذری کی انساب الاشراف کے حوالہ سے متن میں حسب ذیل عبارت نقل کرنے کے بعد صفحہ کے آخر میں ان کا حوالہ دیا ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو قینقاع کے اسلحہ سے تین تلواریں ملی تھیں، جن میں سے ایک ہندوستان کے شہر کلہ کی (سیف قلعی)، دوسری بتار اور تیسری حتف نامی تھی۔''(12)

3۔نقد وجرح کا طریقہ

قاضی اطہر مبارکپوری اپنی تحریروں میں کسی بھی کتاب سے روایت جوں کی توں اخذ نہیں کرتے، بلکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے پہلے اس کے لفظی و معنوی پہلو کی تہہ میں جاتے ہیں اور اگر کسی عبارت میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو جرح و تعدیل کا طریقہ اختیار کر کے عقلی و نقلی دلائل سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقد و جرح کا یہ طریقہ انہوں نے عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ کی تمام کتابوں میں اختیار کیا ہے، لیکن اس کی سب سے واضح دلیل کتاب ''اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ'' میں محمد بن قاسمؒ اور حجاج بن یوسف کے مابین قائم رشتہ داری کا واقعہ ہے، جس کی بابت ''چچ نامہ'' کی ایک مختصر عبارت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد بن قاسمؒ حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی تو نہیں ہیں، البتہ خاندان اور رشتہ میں چچازاد بھائی ضرور ہوتے ہیں، لیکن یہ جو مشہور ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے داماد بھی ہیں اور حجاج کی بیٹی ان سے بیاہی تھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف چچ نامہ میں اس کا ذکر افسانوی رنگ میں پایا جاتا ہے، اس میں ہے کہ ''محمد بن قاسم پسر عم او بود، وداماد نیز بود۔'' پھر ایک حکایت درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حجاج نے خوش ہو کر محمد بن قاسمؒ سے کہا کہ تم مجھ سے اپنی کوئی حاجت طلب کرو، محمد بن قاسمؒ نے کہا کہ آپ مجھے کسی مقام کا امیر و حاکم بنا کر اپنی صاحب زادی سے میری شادی کر دیں، یہ سن کر حجاج

نے خفگی میں محمد بن قاسم کے سر پر چھڑی ماری، جس کی وجہ سے ان کا عمامہ گر گیا، پھر حجاج نے وہی بات کہی اور محمد بن قاسم نے اپنی بات دہرائی، اور جب تیسری بار یہ گفتگو ہوئی تو حجاج نے کہا کہ اچھا میں اس شرط پر تم سے اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہوں کہ تم لشکر لے کر فارس یا ہندوستان جاؤ اور اس کو فتح کر کے نظم و ضبط قائم کرو اور مال غنیمت بھیجو۔"

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد اس کا جواب اگلے پیرایہ میں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"حجاج بن یوسف کے رعب و داب اور محمد بن قاسم کی ذات سے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے، پھر انساب و تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں حجاج کی بیٹی سے محمد بن قاسم کے نکاح کا واقعہ نہیں ملتا، بلکہ حجاج کی اولاد میں اس کی کسی بڑی لڑکی کا ذکر نہیں ہے، ابن قتیبہ نے حجاج کی اولاد میں یہ نام دیئے ہیں (1) محمد (2) ابان (3) عبدالملک (4) ولید اور (5) جاریہ (ایک بچی)۔"

اور ابن حزم نے ان کے یہ نام لکھے ہیں (1) محمد (2) عبدالملک (3) ابان (4) سلیمان۔ اس میں ولید کے بجائے سلیمان ہے اور کسی بچی کا نام بھی نہیں ہے۔" (13)

قدیم عرب مؤرخین و مصنفین کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری اپنی تحریروں میں بعض مقامات پر واقعات کی تحقیق کے حوالہ سے مستشرقین پر اعتراضات کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر میں مستشرقین کی تحقیقات بالکل بے بنیاد ہوتی ہیں، جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں کیا ہے، مثلاً کتاب "خلافتِ راشدہ اور ہندوستان" میں صفحہ 74 پر ایک واقعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے راجوں مہاراجوں نے ہر موقع پر ایرانیوں کی مدد کر کے مسلمانوں سے مقابلہ کیا اور ان کے دشمنوں کو پناہ دی، جس کا لازمی نتیجہ ہندوستان پر براہ راست حملہ کی شکل میں نکلا، بعض مغربی اور مقامی مؤرخوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت ہندوستان کی طاقت منتشر تھی، یہاں کے راجے مہاراجے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ آپس میں لڑتے تھے اور اپنے مقامی دشمن کے مقابلہ میں عرب مسلمانوں کی مدد کرتے تھے، بلکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، مکران سے لے کر سرندیپ تک قدیم زمانہ سے کئی بڑی بڑی خاندانی حکومتیں قائم تھیں اور ان کے افراد مدتوں سے حکومت کرتے تھے ان کے پاس فوج اور سامان جنگ کی فراوانی تھی۔" (14)

اسی طرح کتاب "اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ" میں چچ نامہ کے حوالہ سے راجہ داہر کی دو بیٹیوں اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ہاتھوں محمد بن قاسم کے قتل کا واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یوروپ کے مریضان فکر و نظر مستشرقین و محققین اسی افسانوی روایت کو محمد بن قاسمؒ کی موت کے

بارے میں بیان کرتے ہیں اوراس کو صحیح قرار دینے میں اپنا سارازور صرف کرتے ہیں۔"(15)

اور"بمبئی سے بھٹکل تک" والے سفرنامہ میں مستشرقین کی کوتاہیوں پرنقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی شہر میں نو وارد مسافر کے لئے پورے طور پر حالات کا پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے، وہ اپنی اچٹتی نگاہوں سے ہر چیز کو دیکھتا ہے اوراپنے ذوق کے مطابق نظریہ قائم کرتا ہے، ایسے سیاحوں کی ڈائریاں تاریخ کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں، بلکہ ان کے تاثرات وانطباعات کو پیش کرتی ہیں، مگر یوروپ کے اہل علم وتحقیق اس معاملہ میں بڑے سادہ لوح یا بڑے مکار ہوتے ہیں، وہ کسی اجنبی ملک کا دو چار ہفتے دورہ کر کے ضخیم کتاب تیار کرتے ہیں اورادھرادھر کی دیکھی دکھائی چیزوں پر اپنا نظریہ قائم کر کے اسے ملک کی قدیم اور روایتی چیز بتاتے ہیں اور بعض مؤرّخ ومصنف ایسی کتابوں سے اقتباس لیکراستدلال کرتے ہیں، یہ یوروپ کی مورّخانہ کمزوری اور سطحیت ہے کہ وقتی چیزوں کو دیکھ کران کو کسی ملک کی قدیم اور عام چیز بتایا جائے۔"(16)

اسی سے ملتے جلتے الفاظ ایک دوسرے سفرنامہ "بمبئی سے برہانپور تک" میں بھی درج ہیں۔(17) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حوالہ سے انہوں نے کہیں بھی کسی ایک مستشرق کی نام کے ساتھ وضاحت نہیں کی اور نہ کسی ایسے موضوع کی تصریح کی ہے جسے کسی مستشرق نے زیر بحث لاکراس کی غلط تاویل کی ہو، حالانکہ مستشرقین کے تعلق سے ان کے دو مستقل مقالات یعنی "استشراق اور مستشرقین" اور "ہنگری کے مستشرقین اوران کے علمی کارنامے" کتاب "مآثرو معارف" میں شامل ہیں۔ان میں سے کسی مقالہ میں انہوں نے ایک نام تک ذکر نہیں کیا، بلکہ آخرالذکر میں ہنگری اور اس کے باشندوں کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے بعد وہاں کے چوبیس مستشرقین اوران کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے، نیز مشہور مستشرق گولڈزیہر اورڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کے حالات وخدمات ذراتفصیل سے بیان کیے ہیں۔(18)

4۔ایک روایت سے متعدد پہلوؤں کی تخریج

قاضی اطہر مبارکپوری کے اسلوبِ تحریر کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ روایتوں کو نقل کرنے کے بعد ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔فنِ تحقیق کی اصطلاح میں اسے مفروضہ یاHypotheses کہا جاتا ہے، اس طریقہ کا استعمال انہوں نے سب سے زیادہ اپنی کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" میں کیا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ کتاب اسی طریقہ پر مبنی ہے، اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان میں قائم عربوں کی جن پانچ حکومتوں کا تذکرہ کیا ہے ان کے متعلق سابقہ تصانیف میں بہت کم معلومات ملتی ہے۔انہوں نے اسی مختصر معلومات کی روشنی میں ان حکومتوں اوران کے حکمرانوں کی تاریخ رقم کی ہے، مثلاً کتاب کی ابتداوہ سنجان کی "دولتِ

ماہانیہ'' سے کرتے ہیں ۔اس حکومت کے متعلق جو کچھ تفصیلات انہیں ملی وہ علامہ بلاذری کی فتوح البلدان سے ماخوذ مندرجہ ذیل عبارت تک ہی محدود ہے:

" وحدثنی منصور بن حاتم ، قال: کان الفضل بن ماهان مولیٰ بنی سامة فتح سندان ، وغلب علیها ، وبعث الی المامون رحمه الله بفیل ، وکاتبه ودعا له فی مسجد جامع اتخذه بها ، فلما مات قام محمد بن فضل بن ماهان مقامه فسار فی سبعین بارجة الیٰ مید الهند فقتل منهم خلقاً وافتتح فالی و رجع الیٰ سندان وقد غلب علیها اخ له یقال له ماهان بن الفضل وکاتب امیر المؤمنین المعتصم بالله ، واهدیٰ الیه ساجاً لم یر مثله عظماً وطولاً ، وکانت الهند فی أمر أخیه فمالوا الیه ، فقتلوه وصلبوه ، ثم ان الهند بعد غلبوا علیٰ سندان ، فترکوا مسجدها للمسلمین یجمعون فیه ، ویدعون للخلیفة . "(19)

ترجمہ:۔منصور بن حاتم کا بیان ہے کہ فضل بن ماہان مولیٰ بنی سامہ نے سندان کو فتح کر کے اس پر غلبہ حاصل کرلیا اور خلیفہ مامون کی خدمت میں ہاتھی کا تحفہ بھیجا اور اس سے خط وکتاب جاری رکھی اور اس کے لیے سندان کی جامع مسجد میں، جسے اس نے تعمیر کیا تھا، دعا کی، جب فضل بن ماہان کا انتقال ہوا تو اس کا لڑکا محمد بن فضل بن ماہان جانشین ہوا اور ستر جہازوں کا بحری بیڑا لے کر ہندوستان کے مید یعنی سمندری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے نکلا اور ان کی بہت بڑی تعداد کو ختم کیا اور پالی (تھانہ،سوراشٹر) کو فتح کیا،مگر جب سندان واپس آیا تو اس کا بھائی ماہان بن فضل بن ماہان حکومت پر قبضہ کر چکا تھا اور اس نے امیر المؤمنین معتصم باللہ سے تعلق پیدا کر کے مراسلت جاری کر لی اور اس کی خدمت میں ساگوان کا تحفہ بھیجا، جو اتنی بڑی اور لمبی تھی کہ اس کی مثال دیکھنے میں نہیں آئی،مگر ہندوستان کے لوگ اس کے بھائی محمد بن فضل کے طرفدار تھے،اس لئے انہوں نے ماہان بن فضل کو قتل کر کے سولی دیدی،اس کے بعد اہل ہند سندان پر قابض ہوگئے اور وہاں کی جامع مسجد کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا،تا کہ اس میں وہ جماعت سے نماز وجمعہ پڑھیں اور خلیفہ کے لئے دعا کریں۔

اس عبارت سے قاضی اطہر مبارکپوری نے دولت ماہانیہ کے تعلق سے حسب ذیل نتائج اخذ کیے:

1۔یہ حکومت خلیفہ مامون رشید کے عہدِ حکومت میں 198ھ کے قریب قائم ہوئی اور معتصم باللہ کے عہد میں 227ھ کے آس پاس اس کا زوال ہوگیا۔

2۔اس خاندان میں تین حکمراں ہوئے (1) فضل بن ماہان (2) محمد بن فضل بن ماہان اور (3) اور ماہان

بن فضل، ان میں محمد سب سے طاقتور حکمراں تھا۔

3۔مسلکاً یہ امراء اہل سنت والجماعت تھے اور جمعہ میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔

4۔ان کے یہاں ڈاک کا بہتر انتظام تھا، اس لئے خلیفہ سے ہمیشہ ان کی خط وکتابت رہا کرتی تھی۔

5۔اس حکومت میں رعایا کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی اور وہ عباسی خلیفہ کی عزت کرتی تھی۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے یہی طرزِ تحریر کتاب میں مذکور دوسری حکومتوں یعنی منصورہ کی دولتِ ہباریہ، ملتان کی دولت سامیہ، مکران کی دولت معدانیہ اور طوران کی دولت متغلبہ کی تاریخ رقم کرنے میں بھی اختیار کیا ہے، کیونکہ کتابوں میں ان کے بارے میں بہت کم تفصیلات ملتی ہیں۔

5۔موضوع اور غیر معتبر روایات کی تصریح

قاضی اطہر مبارکپوری اپنی کتابوں میں جو روایات وواقعات بیان کرتے ہیں، ان کے تعلق سے متقدمین کی کتابوں میں اگر کوئی نقص پایا جاتا ہے تو وہ اس کی وضاحت بھی کردیتے ہیں تاکہ قاری اصل حقیقت سے واقف ہوسکے۔اس حوالہ سے کتاب ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' کے شروع میں ''بعض منکر روایات'' کے عنوان سے انہوں نے نو ایسی روایتوں کا تذکرہ کیا ہے، جنہیں فن اسماء الرجال کے ماہرین نے موضوع اور غیر معتبر بتایا ہے۔ (20) مثلاً حضرت تمیم داریؓ کے ہندوستان آنے کی جو مشہور روایت ہے، اس کے موضوع ہونے کی بابت لکھتے ہیں:

> ''حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کے متعلق چلتی ہوئی روایت ہے کہ وہ جنوبی ہند میں تبلیغِ اسلام کے لئے تشریف لائے اور یہیں انتقال فرمایا اور نواحی مدراس میں ان کی قبر موجود ہے، حالانکہ اس کا ذکر انکار کے انداز میں بھی کسی کتاب میں نہیں ملا اور نہ ہی حضرت تمیم داریؓ کے ملک عرب سے باہر جانے کی کوئی صریح روایت ہے، البتہ صحیح مسلم وغیرہ میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت تمیم داری لخم اور جذام کے تیس افراد کو ایک چھوٹی سی کشتی میں لے کر بحرِ روم کے سفر پر نکلے اور ایک جزیرہ میں دجال کو دیکھا۔ حضرت تمیم داری 9ھ میں مسلمان ہوئے، ان کا وطن خاص مدینہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر کے مطابق ان کو ملک شام میں جاگیر دی گئی، جہاں انہوں نے عینون نامی بستی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، یہ مقام بیت المقدس کے قریب تھا، ان کا بحرِ روم کا سفر زمانۂ رسالت میں ہوا تھا، بعد میں عینون ان کا مستقل مقرّ ومستقر تھا۔'' (21)

اور حضرت آدم کے ہندوستان میں اتارے جانے والے واقعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''حضرت آدم علیہ السلام کے ہندوستان کے جزیرۂ سرندیپ یا سرزمین دجنا میں اترنے کے بارے

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو اقوال منسوب کیے گئے ہیں، اصول حدیث کی رو سے ان کی صحت غیر مسلّم ہے، البتہ حضرت ابن عباس وغیرہ کے آثار و اقوال کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ علماء نے بھی اس روایت کو منکر قرار دیا ہے:

"ان آدم هبط بالهند، ومعه السندان والمطرقة والكلبتان واهبطت حواء بجدة." (22)

ترجمہ:۔ حضرت آدم ہندوستان میں اتارے گئے، ان کے ساتھ گھن، ہتھوڑا اور دو چمٹے بھی تھے اور حوا جدہ میں اتاری گئیں۔

یہ روایت نقل کرنے کے بعد ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''لسان المیزان'' کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:

''حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ ابراہیم بن سالم کے پاس منکر احادیث ہیں اور من جملہ ان کے مذکورہ بالا حدیث کو ان میں شمار کیا ہے۔'' (23)

اس کے بعد حضرت آدم اور ہندوستان سے متعلق دیگر مشہور روایات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان ہی منکرات میں وہ باتیں بھی ہیں جنہیں عام طور سے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے ہندوستان میں اتارے گئے، تو ان کے جسم پر جنت کے پتوں کا لباس تھا، بعد میں وہ پتے خشک ہو کر ادھر ادھر اڑے اور زمین پر گرے، جس کی وجہ سے ہندوستان کے درخت خوشبودار ہو گئے، مثلاً عود، صندل، مشک، عنبر، کافور وغیرہ میں انہی پتوں کی وجہ سے خوشبو آئی۔ علامہ محمد طاہر پٹنی نے تذکرۃ الموضوعات میں نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کا راوی امام سفیان ثوری کا بھانجہ سیف کذاب ہے اور یہ خبر منکر ہے۔'' (24)

6۔ روایتوں کی تکرار

قاضی اطہر مبارکپوری کا تحریری اسلوب یہ بھی رہا ہے کہ وہ ایک ہی عبارت کو مختلف مواقع پر بیان کر دیتے ہیں۔ یہ اسلوب تحریر دراصل اسلام کے ابتدائی زمانہ میں علمائے محدثین کا تھا، جسے وہ احادیث کی کتابوں میں استعمال کرتے ہوئے ایک حدیث کو مختلف ابواب و فصول میں ذکر کرتے تھے، اس کی واضح مثالیں صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے غالباً محدثین کا یہی طرز اپنی تحریروں میں اختیار کیا اور اس کے تحت کسی کتاب کے مصنف کی ایک ہی روایت متعدد مقامات پر متعلقہ موضوع کی توضیح میں بیان کی۔ اس اسلوب کے مندرجہ ذیل دو طریقے ان کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں:

اول:۔ ایک عبارت کو ایک ہی کتاب میں متعدد مقامات پر بیان کرتے ہیں، جیسا کہ کتاب ''خلافتِ امویہ اور ہندوستان'' کے صفحہ 29 اور 30 پر مذکور ''البداية والنهاية'' کی مندرجہ ذیل عبارت ہے:

" كانت سوق الجهاد قائمة فی بنی امیه ، لیس لهم شغل الا ذلک. قد علت كلمة الاسلام فی مشارق الارض و مغاربها ، وبرها و بحرها ، وقد اضلوا الكفر و اهله و امتلئت قلوب المشركين من المسلمين رغباً ، لا يتوجه المسلمون الى قطر من الاقطار الا اخذوه ، و كان فی عساكرهم و جيوشهم فی الغزو الصالحون والاولياو وال علماء من كبار التابعين ، فی كل جيش منهم شرذمة عظيمة ينصر الله بهم دينه . "(25)

ترجمہ:۔ بنوامیہ کے دورِ خلافت میں جہاد کا بازار گرم رہا کرتا تھا، اس کے علاوہ ان کو کوئی کام ہی نہیں تھا۔ مشرق و مغرب اور بحر و بر میں اسلام کا کلمہ بلند تھا۔ انہوں نے کفر اور اہل کفر کو یوں رام کر لیا تھا کہ مشرکوں کے دل مسلمانوں کے رعب و داب سے لرزتے تھے، جس سمت بھی مسلمان رخ کرتے تو اسے فتح کر لیتے، غزوات میں ان کے ہر لشکر کے ساتھ کبار تابعین کے صلحاء، اولیاء، علماء کی بڑی جماعت ہوا کرتی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے اپنے دین کی نصرت کرتا تھا۔

یہ عبارت انہوں نے اسی کتاب کے صفحہ 183، 219، 411 اور 429 پر الگ الگ عناوین کے تحت درج کی ہے۔ اسی طرح علامہ بلاذری کی کتاب ''فتوح البلدان'' کی حسب ذیل مختصر عبارت ملاحظہ کیجیے:

" و كانت جماعة سيابجة موكلين ببيت مال البصره ، يقال انهم اربعون ، ويقال اربع مئة . " (26)

ترجمہ:۔ بصرہ کے بیت المال پر سیابجہ کی ایک جماعت تعینات تھی، جن کی تعداد چالیس یا چار سو تھی۔

یہ عبارت کتاب ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' کے صفحہ 224 اور 280 پر مذکور ہے۔

دوم:۔ دوسری صورت اس طریقہ کی یہ ہے کہ کسی عبارت یا واقعہ کو دو یا دو سے زیادہ کتابوں میں بیان کرتے ہیں، مثال کے طور پر غزوۂ ہند کے متعلق سنن نسائی کی مندرجہ ذیل حدیث کو دیکھئے:

" قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ، عصابتان من امتى احرزهما الله من النار ، عصابة تغزو الهند و عصابة تكون مع عيسى بن مريم عليهما السلام .(27)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے، ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کریگا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہوگا۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے یہ روایت کتاب ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کے صفحہ 152 کے علاوہ ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' کے صفحہ 35 پر بھی ذکر کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات و واقعات

اور عبارتیں ہیں، جنہیں انہوں نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، مثلاً محمد بن قاسم کا تذکرہ ان کی کتاب **رجال السند و الهند**، **العقد الثمین**، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ اور خلافت امویہ اور ہندوستان میں مذکور ہے۔

7۔استدراکات

طریقۂ تحقیق میں قاضی اطہر مبارکپوری کا ایک اسلوب یہ بھی رہا ہے کہ وہ کسی موضوع پر تحقیقی کام انجام دینے کے بعد خاموش نہیں بیٹھتے، بلکہ مزید اس کی دریافت میں لگے رہتے ہیں، اگر اس سے متعلق کوئی نئی بات کہیں سے انہیں معلوم ہوتی یا کوئی ایسی بات جسے پیش کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہوتو ایسے میں وہ کسی مناسب مقام پر ''استدراکات'' کا عنوان قائم کر کے اس کی تصحیح یا توضیح فرما دیتے ہیں۔ اس کی دو واضح مثالیں کتاب ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' اور ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' کے آخر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اول الذکر کتاب خلافت امویہ اور ہندوستان میں ''استدراکات'' کے عنوان سے انہوں نے جو معلومات فراہم کی ہے، اس کی مندرجہ ذیل دو قسمیں ہیں:

اول:۔معلومات میں مزید اضافہ۔

دوم:۔سابقہ تحقیقات کی اصلاح۔

پہلی صورت میں انہوں نے حسب ذیل باتوں کا اضافہ کیا ہے:

1۔مرزبانی کی ''**معجم الشعراء**'' کے حوالہ سے محمد بن قاسم کی بابت بتایا ہے کہ وہ ایک شاعر بھی تھے اور ان کے چند اشعار سن کر (جنہیں قاضی صاحب نے ضمن میں بیان کیا ہے) سلیمان بن عبدالملک نے انہیں معاف کر دیا تھا، حالانکہ مشہور روایت یہ ہے کہ وہ واسط کے جیل خانہ میں فوت ہوئے تھے۔(28)

2۔ **رجال السند و الهند** اور **العقد الثمین** وغیرہ میں انہوں نے منظور بن جمہور کلبی کا تذکرہ طبری کے حوالہ سے بہت ہی اختصار سے کیا تھا۔ یہاں کتاب'' **اسماء المغالتین من الاشراف فی الجاهلية** '' کے حوالہ سے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔(29)

3۔خلیفہ بن خیاط کی طبقات کے حوالہ سے ایک محدث عبید اللہ بن عبداللہ بن معمر قرشی اور طبقات فحول الشعراء کے حوالہ سے اموی عہد کے ایک شاعر ذوالرمہ کے ہندوستان آنے کی تصریح کی ہے۔(30)

4۔امام ذہبی کی تاریخ الاسلام اور جاحظ کے رسائل سے قاضی اطہر مبارکپوری کو ابوامیہ عبدالرحمٰن السندی اور منتجع بن نبہان طائی کا ہندالاصل ہونا معلوم ہوا۔اس سے قبل انہوں نے ان لوگوں کا ذکر سابقہ کتابوں میں کہیں نہیں کیا تھا۔(31)

5۔اور عربی شاعری میں ہندی عورت کے بارے میں انہیں جو کچھ ابوالفرج اصفہانی کی ''**الاغانی**'' میں ملا، اسے یہاں نقل کر دیا۔(32)

دوسری صورت میں قاضی صاحب نے محمد بن قاسمؒ کے بیٹے عمرو بن محمد کی بابت کتاب '' **اسماء المغتالین**'' کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ''انہیں سندھ کے امیر عزان نے قید کر کے خفیہ طور پر ایک آدمی کے ہاتھوں قتل کرا دیا تھا۔''(33) حالانکہ اس سے قبل ان کی کتابوں میں جہاں بھی عمرو بن محمد بن قاسمؒ کا ذکر آیا ہے، تاریخ طبری کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے خودکشی کر لی تھی۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے کتاب خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان میں جو ''استدرات'' بیان کئے ہیں، وہ خلافت امویہ اور ہندوستان کے حسب ذیل چار مضامین سے متعلق معلومات میں اضافہ یا تصحیح ہے:

1۔سابقہ کتاب (خلافت امویہ اور ہندوستان) کے صفحہ 55 پر انہوں نے چچ نامہ کے حوالہ سے 41ھ میں ارمائیل کی فتح کا ذکر کیا تھا، یہاں جمہرۃ انساب العرب کی عبارت بیان کر کے اس کی توثیق کی ہے۔(34)

2۔خلافت امویہ اور ہندوستان کے صفحہ 322 پر بلاذری کے حوالہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے غیر مسلم ہندی راجاؤں سے جو تعلقات تھے، وہ بیان کئے ہیں۔ یہاں اسی کی توثیق میں ابوعبید قاسم بن سلاّم کی کتاب ''**غریب الحدیث**'' سے ایک ہندی غیر مسلم کا واقعہ بیان کیا ہے، جو خلیفہ سے امان لے کر عدن میں داخل ہوا تھا مگر ایک مسلمان نے اسے قتل کر دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاتل سے پانچ سو دینار دیت میں لئے اور اسے قید کی سزا دی۔(35)

3۔سابقہ کتاب کے صفحہ 361 پر قاضی صاحب نے فتوح البلدان کی عبارت ''**فاقاموا المحمد العلوفة**'' کا ترجمہ یوں کیا تھا کہ ''اہل نیرون نے محمد بن قاسم کی فوج کے جانوروں کے لئے چارہ حاضر کیا۔''(36) یہاں انہوں نے اسے غلط قرار دیتے ہوئے صحیح ترجمہ یہ بتایا ہے کہ ''اہل نیرون نے محمد بن قاسم کی دعوتِ طعام کی''۔(37)

4۔ چوتھا اور آخری استدراک جامع مسجد ملتان کے تعلق سے یہ ہے کہ کتاب خلافت امویہ اور ہندوستان کے صفحہ 372 پر قاضی صاحب نے کتاب الہند کے حوالہ سے اس مسجد کو اموی دور کی جامع مسجد لکھا تھا۔ یہاں انہوں نے اس مسجد کو دولت سامیہ کے بانی محمد بن قاسم بن منبہ سامی کی تعمیر کردہ مسجد بتایا ہے، جسے اس نے تیسری صدی ہجری میں تعمیر کیا تھا، لیکن کس بنا پر انہوں نے اس کی تصحیح کی اس کی وجہ نہیں بتائی، فقط اتنا لکھا ''کہ البیرونی کی طرح ہم نے بھی بے خیالی میں اسے اموی عہد کی مسجد تصور کر لیا تھا۔''(38)

یہ وہ چند طریقے ہیں جنہیں اختیار کر کے قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تحریروں کو تحقیقی انداز میں پیش کیا اور اسلامی تاریخ کے مختلف موضوعات پر کئی گرانقدر کتابیں لکھیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری
کی تحریروں پر اہلِ علم کی تنقید

قاضی اطہر مبارکپوری نے پوری محنت اور بھرپور اجتہادی صلاحیت کے ساتھ کتابوں کی تدوین وتالیف کی، لیکن پھر بھی وہ ایک انسان تھے اور اسلامی نقطۂ نظر سے کتابِ الٰہی کے علاوہ روئے زمین پر کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ہے جس کے مصنف سے کچھ فروگذاشت یا غلطی نہ ہوئی ہو، چنانچہ ان سے بھی دورانِ تحقیق علمی کاموں میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں، جن کی نشاندہی ان کے ہمعصر محققین نے ان کی تحریروں کونقدوجرح کی کسوٹی پر پرکھ کرکی۔

جن معاصر اہلِ علم نے ان کی بعض تحریروں پر تنقیدیں کی ہیں، ان میں مولانا ابومحفوظ الکریم، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے ان کی دو کتابوں یعنی ''**رجال السند والهند**''، ''علیؓ وحسینؓ'' اور ایک مقالہ ''ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت'' پر نقد کیا ہے، پھر ان میں سے بھی اولین دو لوگوں نے صرف **رجال السند والهند** پر تنقید کی ہے، جبکہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے تینوں تحریروں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ان علماء کی معقول تنقید واستدراکات کا اعتراف کرتے ہوئے مصنف نے اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرلی، ورنہ بصورت دیگر اپنے موقف پر برقرار رہتے ہوئے اس کی مزید توضیح کی یا پھر خاموش رہے۔ ذیل میں ان ناقدین کی تحریروں کے حوالہ سے الگ الگ عناوین کے تحت مذکورہ دونوں کتابوں اور مقالہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

1۔رجال السند والهند

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ سب سے مشہور کتاب ہے جو ممبئی کے مکتبۃ الحجازیہ سے 1958ء میں شائع ہوئی تھی۔ منظرِ عام پر آتے ہی اس نے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل کی اور قارئین نے اس پر مصنف کو دادوتحسین سے نوازا، مگر اس کے بالمقابل مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا ابومحفوظ الکریم اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جیسے مبصرین نے نہ صرف اس کتاب کا گہرائی وگیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، بلکہ اپنی علمی دانست کی بنا پر مصنف کی جو کوتاہیاں اس کے تراجم میں نظر آئیں، انہیں سپردِ قلم کرکے شائع کردیا۔ ان حضرات کی موضوع سے متعلق تحریریں حسب ذیل ہیں:

(1) کتاب ''**رجال السند والهند**'' پر سب سے پہلے مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تنقید کی۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے مشہور فاضل اور ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے مدیر تھے، اس کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فیکلٹی آف تھیولوجی کے ایک زمانہ تک مہتمم وصدر رہے ہیں۔ مارچ 1959ء میں انہوں نے ''برہان'' کے اداریہ میں کتاب ''**رجال السند و الهند**'' پر شاندار تبصرہ کیا، جس میں انہوں نے موضوع کی اہمیت اور کتاب کا اجمالی تعارف کرانے کے بعد آخر میں بعض کمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

''اتنی ضخیم کتاب میں ناموں اور بیانات میں غلطیوں کا ہونا مستبعد نہیں ہے، چنانچہ اس میں بھی ہیں، مثلاً باب الالف کے پہلے صفحے پر ہی دوسرے پیراگراف کی سطر 2 میں بجائے ربیع بن العمان کے سریج بن النعمان۔ پیراگراف 3 سطر اول میں سندی بن بحر کے بجائے سندی بن الحسن ہونا چاہیے، اسی طرح ص: 54 پر احمد بن السندی کے تذکرہ میں یہ عبارت لکھی ہے، ''**وذکرہ انه سمع بالبصرہ**'' یہاں لفظ سمع کے بعد عنہ ہونا چاہیے، (خطیب بغدادی، ج 4، ص 187) علاوہ ازیں مشہور امامِ لغت الحسن بن محمد الصغانی جیسے مشاہیر کے تذکرے میں مزید تحقیق وتفتیش کی گنجائش تھی۔''(39)

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف: ۔اس تبصرہ میں مولانا اکبرآبادی نے کتاب کے چار مقامات پر تصحیح واصلاح کے لئے نشاندہی کی ہے۔قاضی اطہر مبارکپوری نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں موصوف کے آخرالذکر نکتہ کو ملحوظ رکھ کر محمد بن حسن صغانی کے ترجمہ پر نظرِ ثانی کے بعد بہت کچھ حذف واضافہ کیا، جبکہ ''ربیع بن العمان'' اور ''وذکرہ انہ سمع بالبصرہ'' میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ ان میں اول الذکر ''سریج بن النعمان'' کی بابت دارالعلوم دیوبند کے ایک استاذ مولانا عبداللہ معروفی اپنے مضمون ''سندھ وہندھ کی علمی تاریخ۔ رجال السند والہند'' میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے تبصرہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راقم عرض کرتا ہے کہ ''سریج بن العمان'' ہی صحیح ہے اور تاریخ بغداد میں اسی طرح (سریج بن العمان) ہے، یہ ایسے راوی ہیں جن کے طریق سے خطیب بہ کثرت روایتیں تخریج کرتے ہیں، معلوم نہیں مؤلف نے دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کیوں نہیں کی؟۔''(40)

اور ثانی الذکر عبارت کے سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قاضی اطہر مبارکپوری کی اپنی عبارت نہیں ہے، بلکہ انہوں نے اسے خطیب بغدادی کی کتاب ''تاریخ بغداد'' سے نقل کیا ہے۔ جہاں تک ''سندی بن بحر'' کا تعلق ہے تو مولانا عبداللہ معروفی نے اس میں بیٹے کو باپ کی بجائے دادا کی طرف منسوب بتایا ہے۔(41) جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نام میں حنبل امام صاحب کے دادا کا نام ہے، جبکہ والد کا نام محمد تھا۔

(2) **رجال السند والهند** پر دوسرا تنقیدی مضمون مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کا ہے۔ یہ عربی زبان کے ادیب اور مدرسہ عالیہ کلکتہ (عالیہ یونیورسٹی) کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھے، انہوں نے کتاب **رجال**

السند والهند کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس میں جو نکات قابلِ اعتراض نظر آئے، انہیں ''سندھ و ہند کا ایک علمی وثقافتی تذکرہ (رجال السند والہند الی القرن السابع)'' کے پیشِ عنوان ضبطِ تحریر میں لاکر ایک طویل مضمون کی شکل دے دی۔ یہ مضمون جولائی تا ستمبر 1959ء میں ماہنامہ ''برہان'' دہلی میں قسطوار شائع ہوا تھا۔

مولانا معصومی نے اپنے اس مضمون میں مصادر و مراجع کو سامنے رکھ کر باریکی سے **رجال السند والهند** کا تجزیہ کیا اور مندرجہ ذیل نکات کی تخریج کی:

اول:۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی تحقیقات کی رو سے مولانا معصومی نے سندھ کے علاقہ ''بامیان'' اور ''داور'' پر تنقید کرتے ہوئے اپنے مقالہ میں بتایا کہ یہ دونوں علاقے سندھ کا حصہ نہیں تھے، اس لیے مؤلف کتاب کو چاہیے کہ انہوں نے کتاب میں ان دونوں علاقوں کے جن علماء کا تذکرہ کیا ہے، انہیں سرے سے خارج کردیں۔ اصل عبارت حسب ذیل ہے:

> ''مؤلف نے سندھ و ہند کو قدیم عرب مؤرخین اور جغرافیین کی مقررہ عادت کے مطابق دو مستقل اقلیموں کی حیثیت دی ہے، ہمارے ناقص خیال میں صحیح طریقہ کار بھی یہی تھا، البتہ انہوں نے بعض ایسے علاقوں کو بلادِ سندھ میں شامل کرلیا ہے جن کی بابت قدیم عرب جغرافیہ نگاروں کا قول ثبوت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔''(42)

بعد ازاں ان علاقوں میں بامیان، داور اور بیرون کا ذکر کرکے قدیم مؤرخین و جغرافیہ نویسوں کی کتابوں کے حوالے اپنے نکات کے ثبوت میں درج کئے ہیں اور آگے چل کر احید بن الحسین بن علی البامیانی، محمد بن علی بن احمد ابوبکر البامیانی وغیرہ بامیانی علماء، جن کے تراجم **رجال السند والهند** میں شامل ہیں، کے نام ذکر کرکے لکھا ہے کہ انہیں داخلِ کتاب کرنا صحیح نہیں ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف:۔ کتاب کی اشاعتِ دوم میں بامیان کو سندھ کا علاقہ قرار دینے کی بابت قاضی صاحب اپنی جگہ مطمئن رہے، ساتھ ہی انہوں نے اس میں مزید ایسے تراجم کا بھی اضافہ کیا، جنہیں داخلِ کتاب کرنے کا مشورہ مولانا معصومی نے اپنے مقالہ میں دیا تھا، مثلاً انہوں نے لکھا تھا کہ بامیان کو سندھ کا حصہ قرار دینے کی صورت میں مؤلف کو حکیم افضل بامیانی کو بھی شاملِ کتاب کرنا چاہیے، لہٰذا ان کا تذکرہ بھی کتاب کے جدید ایڈیشن میں صفحہ 73 پر آگیا ہے۔

دوم:۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تحقیقات کی بنا پر بیرون کو سندھ کا حصہ مانتے ہوئے **رجال السند**

و الهند میں ابو ریحان البیرونی کا تذکرہ کیا ہے۔مولانا معصومی نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اول تو بیرون ''ن'' کے ساتھ نیرون ہونا چاہئے تھا اور مؤلف نے ابو ریحان البیرونی کو جو ہندی الاصل مان لیا ہے، غلط ہے، کیونکہ البیرونی ہندی نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق خوارزم سے تھا۔ بیرون کے متعلق ناقد کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> ''سندھ کے مشہور متنازعہ فیہ شہر بیرون کے نام میں قدیم تصحیف برقرار رکھی گئی ہے، مؤلف کے نزدیک بیرون کی (ب یائے موحدہ) صحت غیر مشکوک ہے۔''(43)

اور آگے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں یہ شہر نیرون (بالنون) تھا، جیسا کہ اہلِ تحقیق لکھتے ہیں۔''(44)

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف :۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے بیرون کو بیرون اس لئے لکھا ہے کہ اکثر مستند مؤرخین نے اسے ''ن'' کے بجائے ''ب'' کے ساتھ ہی تحریر کیا ہے۔ رہا سوال ابو ریحان البیرونی کے ہندی الاصل ہونے کا تو اس کی تائید میں انہوں نے کتاب کی اشاعت ثانی کے متعلقہ ترجمہ میں ابن ابی اصیبعہ اور حموی وغیرہ کی وہ روایات نقل کی ہیں، جن سے البیرونی کا سندھی ہونا اور خوارزمی نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔(45)

سوم:۔ **رجال السند و الهند** میں مؤلف نے جن سندھی یا ہندی رجال کے تراجم قلم بند کئے ہیں، ان سے متعلق مقدمۂ کتاب میں کچھ اصول بھی بیان کیے ہیں، جن میں سے ایک اصول یہ ہے:

> **"و مرادنا برجال السند و الهند الذين ولدوا و عاشوا فيهما سواء ماتوا فيهما او في الخارج ، والذين كانوا من طينتهما و ولدوا في الخارج وماتوا فيه ، " ولم نذكر اللذين جائوا الى الهند و تأهلوا وتوطنوا فيها ، ومن حقوقهم علينا ان نذكرهم ايضاً وهم كثيرون .''(46)**
>
> ترجمہ:۔ رجال سندھ و ہند سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہاں پیدا ہوئے اور نشونما پائی، خواہ ان کی وفات ملک و بیرون ملک میں کہیں بھی ہوئی ہو۔ اسی طرح وہ لوگ بھی مراد ہیں جن کے آباء واجداد یہیں کے تھے، لیکن ان کی پیدائش اور وفات کسی اور ملک میں ہوئی۔ جو لوگ باہر سے ہندوستان آئے اور پھر شادی کرکے یہیں کے ہوگئے، ایسے لوگوں کا تذکرہ ہم نے اس کتاب میں نہیں کیا ہے، حالانکہ ان کے تئیں ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ان کا بھی تذکرہ کریں اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مندرجہ بالا پیرایہ میں مذکور اولین دو شرطوں کو پیشِ نظر رکھ کر مولانا ابو محفوظ الکریم نے مؤلف کو ہدفِ تنقید بنایا اور اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ مؤلفِ کتاب نے مذکورہ دونوں شرطوں کا لحاظ کئے بغیر ایسے لوگوں کو سندھی یا ہندی علماء و رجال میں شمار کیا ہے جن کا تعلق دور تک اس علاقہ سے نہیں تھا، ان شرطوں کے تحت

مؤلف نے خاص طور پر ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کے ناموں کے ساتھ سندی، ہندی، ابوالسندی اور ابوالہندی وغیرہ جڑا ہوا تھا۔ مولانا معصومی نے تنقیدی زاویہ نگاہ سے اس پہلو پر کئی صفحات رقم کرنے کے بعد درمیان میں ایسے 23 افراد کے اسماء کی فہرست درج کی ہے، جن کے نام کا جزء سندی، ہندی، ابن الہندی، ابوالسندی اور ابوالہندی ہیں، مثلاً احمد بن سندی بن حسن بن بحر، ابن السندی احمد بن القاسم، ابراہیم بن علی بن السندی، اسماعیل بن محمد بن رجاء السندی، رجاء بن سندی النیساپوری ابومحمد، ابوالسندی سہل بن ذکوان وغیرہ، اور لکھا ہے کہ یہ وہ افراد ہیں، جنہیں قاضی اطہر مبارکپوری نے سندھی یا ہندی سمجھ کر کتاب میں شامل کرلیا ہے، حالانکہ ان کا یا ان کے آباء واجداد یا کسی اور رشتہ دار کا سندھ یا ہند سے کوئی تعلق نہیں تھا، پھر اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ مؤلف نے شعوری یا لاشعوری طور پر مذکورہ ناموں میں سندھی یا ہندی کو نسبت مان کر اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے، حالانکہ وہ ان کی نسبت نہیں تھیں، بلکہ اصل نام یا کنیت تھیں، جنہیں سندھ یا ہند کی جانب نسبت مان کر ہندی وسندی الاصل سمجھا گیا۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف:۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے سندی، ابوالسندی، ہندی، ابوالہندی اور ابن الہندی وغیرہ کے متعلق مولانا معصومی کی تحقیق ناقابلِ قبول سمجھیں، اس لئے طبع ثانی کے نسخہ میں ان تراجم کے ساتھ کوئی ترمیم نہیں کی، البتہ فاضل ناقد کی نشاندہی کے مطابق انہوں نے ابوالہندی محدث اور ابوالہندی الکوفی الشاعر دونوں ہم نام تراجم، جو بالترتیب طبع اول کے نسخہ میں صفحہ 286 اور 287 پر مذکور تھے، سرے سے حذف کر دیے، شاید کہ انہیں ان کے ہندی ہونے کا کوئی ثبوت نہ ملا ہو۔

چہارم:۔ **رجال السند والهند** کے تراجمِ ابواب کے سلسلہ میں مولانا ابومحفوظ الکریم نے اپنے تحقیقی مقالہ میں ایک نقد اس لحاظ سے بھی کیا ہے کہ عالم اسلام میں بعض شہروں کے نام ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جس سے بسا اوقات طبقات وتراجم کی کتابوں میں ان ناموں سے منسوب افراد کے تراجم کا مطالعہ یا تذکرہ کرتے وقت قاری، مصنف یا مؤلف لاشعوری طور پر انہیں غلط جگہ سے منسوب کرلیتا ہے، جس سے اس کی پہچان میں فی الواقع تبدیلی آجاتی ہے۔ مولانا ابومحفوظ الکریم کے مطابق "دیبل" سے منسوب افراد کے تراجم کے سلسلہ میں قاضی اطہر مبارکپوری سے غلطی اس طرح سرزد ہوئی کہ انہوں نے بعض ایسے افراد کے تراجم، جن کا تعلق شام کے "دیبل" سے تھا، ان کو سندھ کا "دیبل" سمجھ کر شاملِ کتاب کرلیا۔ اس حوالہ سے فاضل ناقد کی تصریح حسب ذیل ہے:

> "تیسرے شک کے ماتحت ہمیں کئی تراجم سے مفصل بحث کرنا ہے، ہم نے گزشتہ سطور میں بتایا ہے کہ دیبل السندھ کے دھوکہ میں مؤلف نے کئی ایسی شخصیتوں کو سندھی سمجھ رکھا ہے جو دراصل دیبل

(بتقدیم الباء) سے منسوب ہیں۔" (47)

یہ عبارت درج کرنے کے بعد احمد بن محمد ھرون المقرئ الدیبلی ،شعیب بن محمد ابوالقاسم الدیبلی المصری ،محمد بن عبداللہ الدیبلی الشامی اور علی بن احمد بن محمد الدیبلی ، کہ جن کا تذکرہ **رجال السند والھند** میں ہے، پر اپنے موقف کے ثبوت میں طبقات ورجال کی قدیم کتابوں سے دلائل پیش کیے ہیں ۔ بعدازاں "دیبلی" ہی سے منسوب پانچ اشخاص کے نام کی فہرست درج کی ہے ،جنہیں موصوف طلبِ تحقیق کے زمرہ میں خیال کرتے ہیں۔

دیبل کی طرف منسوب ان افراد کے علاوہ **رجال السند والھند** میں شامل جن لوگوں کی نسبت بوقان اور منصورہ سے ہے، موصوف نے ان پر بھی اسی طرح کے سوالات اٹھائے ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف:۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے مولانا ابومحفوظ الکریم کے اس تنقیدی پہلو کا اعتراف کیا اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمہ میں لکھا:

> **" وما حاولت من نفسي تسنيد الرجال و تهنيدهم الا من وجدت نسبته الى السند و الهند صراحة فى كتب القوم ، ومع هذا فانا فى شک من بعض الديبليين ، اهو من ديبل السند : بالياء المثناة ثم الباء الموحدة ، او من دبيل الشام : بالباء الموحدة ثم الياء المثناة ، و كذلک من بعض البوقانيين اهو من بوقان السند بالباء الموحدة ،او من نوقان بالنون ، او من توقان بالتاء المثناة . " (48)**
>
> ترجمہ:۔ میں نے جان بوجھ کر کسی کو سندھی یا ہندی نہیں بتایا ہے، بلکہ متقدمین کی کتابوں میں جن کی نسبت صراحت کے ساتھ سندھ یا ہند کی طرف کی گئی ہے میں نے انہیں لیا ہے اور یہیں وجہ ہے کہ مجھے بھی بعض دیبلی نسبت والوں پر شک ہے کہ آیا وہ سندھ والے دیبل سے ہیں یا شام کے علاقہ دبیل کی طرف منسوب ہیں ،اسی طرح مجھے بعض بوقانی لوگوں پر بھی شک ہے کہ وہ سندھ کے علاقہ بوقان کی جانب منسوب ہیں یا نوقان وتوقان میں سے کسی کی طرف منسوب ہیں۔

پنجم:۔ مذکورہ چار نکات کے علاوہ مولانا معصومی نے اپنے مقالہ میں کچھ ایسے ناموں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کے تراجم **رجال السند والھند** میں ہونے چاہیے تھے ،مگر مؤلفِ کتاب نے وہ تراجم رقم نہیں کئے، اس لیے انہوں نے مشورہ کے طور پر ان لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی مقالہ میں درج کی ہے، نیز بعض تراجم کے حوالہ سے مؤلف کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ان پر بعض مفید مواد فلاں کتاب میں موجود ہے، لہٰذا مؤلف کو ان سے بھی استفادہ کرنا چاہیے، تاکہ ترجمہ مفید تر ہوجائے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف:۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ان کے پہلے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے دوم السندیہ البغدادیہ، عبدالرحمٰن بن ابی یزید مولیٰ عمر بن خطابؓ اور ابوحفص عمر بن محمد بن سلیمان المکرّانی کے تراجم کو کتاب میں شامل کرلیا۔ یہ تراجم بالترتیب دوسرے ایڈیشن کے صفحہ 113، 164، اور 179 پر درج ہیں۔

اور دوسرے مشورہ کے تحت ابراہیم بن السندی بن علی بن بہرام، جن کا تذکرہ طبع اول میں صفحہ 68 پر "**حلیة الاولیاء**" کے حوالہ سے کیا گیا تھا طبع دوم میں صفحہ 59 پر ابونعیم اصفہانی کی کتاب" " سے بھی بعض چیزیں اخذ کرکے متعلقہ ترجمہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔

(3) تنقیدی نقطۂ نظر سے **رجال السند و الهند** پر قلم اٹھانے والے تیسرے شخص مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ہیں۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے علمائے کبار میں ہوتا ہے، علمِ حدیث کی کئی معرکۃ الآراء کتابوں پر ان کی مفید شروحات ہیں۔

مولانا اعظمی نے متعدد مقالات و کتب پر تنقیدی نقطۂ نظر سے مضامین سپرد قلم کئے تھے، جو" مقالات ابو المآثر" کے عنوان سے 2014ء میں دار الثقافۃ الاسلامیہ مئو سے تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقالات کے اس مجموعہ کی تیسری جلد میں ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون بعنوان "رجال السند والہند پر ایک نظر" صفحہ 243 تا صفحہ 252 پر درج ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے "لفظی خامیاں" اور "معنوی خامیاں" کے عناوین قائم کر کے **رجال السند و الهند** میں موجود بعض غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

معنوی خامیاں اس مضمون میں وہی ہیں جن کی نشاندہی مولانا ابومحفوظ الکریم نے برہان میں شائع ہونے والے اپنے طویل مضمون میں کی تھیں، البتہ لفظی خامیاں، جن کی کل تعداد 12 ہے، ذیل میں اختصار کے ساتھ ترتیب وار ذکر کی جاری ہیں:

1۔ کتاب **رجال السند و الهند** کے صفحہ 144 پر قاضی اطہر مبارکپوری نے " **كان في ديوانه نحو ألفين شعراً** " لکھا ہے، اس میں **ألفين شعراً** کے بجائے **ألفي شعرٍ** اور شعر کے بجائے **بيت** ہونا چاہیے تھا۔

2۔ صفحہ 197 پر "**وأتي الثعالبي من اشعاره في صفحتين** "میں "من" کے بجائے حرفِ جر "ب" ہونا چاہیے تھا۔

3۔ صفحہ 276 میں مؤلف نے" **كان جميع اشعار أبي الصلع السندي مأتين و الفا شعراً** " لکھا ہے۔ اس جملہ میں بھی نمبر 1 والی دونوں غلطیاں دہرائی گئی ہیں۔

4۔صفحہ 124 میں مؤلفِ کتاب' ' خمسة عشر ملوکا '' لکھتے ہیں، حالانکہ اس میں 'ملکاً'' ہونا چاہیے تھا۔

5۔صفحہ 123 پرایک جگہ'' أن یعمموا الدعوة '' ہے، جسے مؤلف نے''دعوت کوعام کریں'' کے معنیٰ میں لیا ہے، جو کہ غلط ہے۔

6۔''فی ھذا الاختصاص ببعض الانسان ''صفحہ 120 پرنا قابلِ فہم ہے،اس کی جگہ'' فی اختصاص بعض النفوس بأمر غریب ''ہونا چاہیے تھا۔

7۔مؤلف نے صفحہ 138 پر'تولّی علی عرش السند '' لکھا ہے، جو کہ عربیت کی رو سے بے حد سقیم ہے،اس کے بعد مولانا اعظمی نے اسی صفحہ کے دواور جملوں میں نحوی غلطیوں کی نشاندہی ہے۔

8۔'' قبض اولا علی عرش المنصورة و بعد مدة قلیلة علی جمیع السند '' کی ہندیت محتاج بیان نہیں ہے۔

9۔صفحہ 123 پر'قبل سنین أثاروا'' کی عربیت میں بھی بہت کچھ محل کلام ہے۔

10۔کتاب کے صفحہ 261 پر'لم أقف علیه غیر ما ذکرته '' کو'لم أقف منه علی غیر ما ذکرته ''ہونا چاہیے۔

11۔عربیت کی رو سے صفحہ 241 پر مذکور''من علمها ھذه الحلیة منکسر عنقه ''میں بھی بہت کلام ہے۔

12۔صفحہ 86 پر'أقرب عهداً و موعضاً من النبی ﷺ '' کی بجائے'' بالنبی ﷺ'' ہونا چاہیے تھا۔(49)

قاضی اطہر مبارکپوری کا موقف:۔مندرجہ بالالفظی خامیوں کا اعتراف کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارکپوری نے رجال السند والہند کی طباعتِ ثانی میں مذکورہ تمام نکات کی اصلاح کی ،سوائے نمبر 7 اور نمبر 12 کے، ان میں مؤلف نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، چنانچہ یہ دونوں جملے طبع اول کی طرح کتاب کی طبع دوم میں بھی ہو بہو موجود ہیں۔

2۔علیؓ وحسینؓ

قاضی اطہر مبارکپوری نے 1959ء میں محمود احمد عباسی کی کتاب''خلافتِ معاویہؓ ویزید'' کی تردید میں سلسلہ وار مضامین تحریر کیے، جو 7/نومبر تا 17/دسمبر کے درمیان روزنامہ''انقلاب''میں شائع ہوئے۔تین ماہ بعد جب یہ

مضامین ''علیؓ و حسینؓ'' کے نام سے کتابی شکل میں چھپ کر منظرِ عام پر آئے تو علمی حلقوں میں انہیں بہت پسند کیا گیا اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے انہیں مذکورہ کتاب کے رد میں لکھی گئی تحریروں میں سب سے بہتر تحریر قرار دیا۔(50)

قاضی اطہر مبارکپوری کے علاوہ جن لوگوں نے کتاب ''خلافتِ معاویہؓ و یزید'' کی تردید میں قلم کو جنبش دی، ان میں سب سے اہم نام دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب کا ہے، جنہوں نے اس کے جواب میں ''شہید کربلا و یزید'' تحریر کی تھی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اہلِ سنت والجماعت کی اکثریت نے اسے پسند کیا، البتہ بعض افراد ان میں ایسے بھی تھے جنہوں نے اس پر اعتراض کیا اور قاری صاحب کے اس کام کو ایک غیر سنجیدہ فعل قرار دیا، ساتھ ہی اس پر تنقیدی تبصرے کیے۔ نقد کرنے والی چند گنی چنی شخصیات میں سے ایک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بھی تھے۔ موصوف نے قاری صاحب کی کتاب کے جواب میں ایک مختصر کتاب ''تبصرہ بر شہید کربلا و یزید'' لکھ کر اس میں موجود کوتاہیوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔

اسی کتاب کے آخر میں بیس صفحات پر مشتمل مولانا اعظمی ہی کے قلم سے ایک مضمون بعنوان ''عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے'' بھی شامل ہے۔ اس مضمون کے دوسرے پیراگراف میں انہوں نے قاضی صاحب کی کتاب ''علیؓ و حسینؓ'' کا تعارف کرانے کے بعد ان علمائے اہلِ سنت کے خلاف تمہید باندھی ہے، جنہوں نے محمود احمد عباسی اور ان کی کتاب ''خلافتِ معاویہؓ و یزید'' کا رد لکھنے میں غلو سے کام لیا اور انھیں غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھے جو عباسی صاحب سے سرزد ہوئی تھیں۔ متعلقہ پیراگراف حسب ذیل ہے:

> '' قاضی اطہر کی یہ کتاب 336 صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں انہوں نے اپنے خیال میں عباسی صاحب کی تقریباً ہر بات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، ہم عباسی صاحب کے حامی نہیں ہیں، ہم مانتے ہیں کہ ان کی کتاب میں بہت سی غلطیاں ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ پر انہوں نے جس انداز سے لکھا ہے، وہ انداز پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح انہوں نے یزید کے باب میں بھی غلو سے کام لیا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ہمارے علماء ہاتھ دھو کر جو عباسی کے پیچھے پڑے ہیں اس سے بھی ہم کو اتفاق نہیں ہے، اتنی بات میں تو کوئی حرج نہیں تھا، بلکہ اس حد تک ضروری تھا کہ عباسی کی کتاب میں جس حد تک مسلک اہل سنت سے انحراف پایا جاتا ہے، بس اس حد تک ہمارے علماء اس کتاب کے رد میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے، اس سے آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر آگے بڑھنے پر اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور تھے تو جن بے عنوانیوں کی شکایت ان کو عباسی سے ہے، ان کا ارتکاب خود نہ کرتے، یعنی عبارتوں میں قطع و برید سے پرہیز کرتے، غلط ترجمے نہ کرتے، صرف مفید

مطلب ٹکڑوں کو نقل کرنے پر اکتفاء نہ کرتے اور اپنے لیے مضر ٹکڑوں کو حذف نہ کرتے، نیز کسی صحابیؓ کی نسبت ایسا کوئی لفظ اپنی تحریر میں نہ آنے دیتے جو صحابہؓ کی حرمت کے خلاف ہوتا، مگر ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عباسی کا رد کرنے والوں نے ان باتوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔'' (51)

محمود احمد عباسی یا علمائے اہلِ سنت سے سرزد ہونے والی جن غلطیوں کا ذکر مولانا اعظمی نے مندرجہ بالا پیراگراف کی آخری سطور میں کیا ہے، یہی غلطیاں دراصل اس مضمون کا موضوع ہے، مطلب یہ کہ ان کے خیال میں قاضی اطہر مبارکپوری نے کتاب ''علیؓ و حسینؓ'' میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر جو غلطیاں کی تھیں وہ اسی نوعیت کی ہیں، یعنی انہوں نے بھی عبارتوں میں قطع و برید سے کام لیا، غلط ترجمے کیے، اپنے مطلب کے مفید ٹکڑوں کو نقل کرنے پر اکتفاء کیا اور مضر ٹکڑوں کو حذف کر دیا، نیز مضمون نگار کے دلائل کی رو سے کتاب میں تین جگہ حضرت امیر معاویہؓ، جو کہ صحابیِ رسول ہیں، پر الزام تراشی کی گئی اور بعض مقامات پر عباسی صاحب کو غلط ٹھرایا گیا ہے، حالانکہ وہ اپنی جگہ بالکل درست تھے۔

اس طرح انہوں نے اپنے اس مضمون میں عدم احترام صحابہ، افسانہ تراشی، عبارت فہمی کا فقدان اور غلط نسبت، حضرت ابن عمرؓ وغیرہ پر طنز اور متضاد بیانات وغیرہ ذیلی عناوین قائم کر کے قاضی اطہر مبارکپوری کی بیسیوں لفظی و معنوی غلطیوں کی تصریح کی ہے، ان میں بھی دس صرف ایسی ہیں کہ جن میں غلط ترجمہ کیا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ غلط ترجمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ص: 91 پر ''مالک معهم أمر'' کا ترجمہ قاضی صاحب نے یہ کیا ہے کہ ''آپ کا ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں ہے''۔ حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی قوم کو دیکھ رہا ہوں کہ ان کے ساتھ (یعنی ان کے ہوتے ہوئے) آپ کا کوئی حکم نہیں ہے۔'' (52)

اور ایک دوسرے مقام پر ''حضرت ابن عمر وغیرہ پر طنز'' کا عنوان قائم کر کے بیان کرتے ہے:

> ''قاضی اطہر کی کتاب کا وہ مقام نہایت جگر گراش ہے، جہاں انہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو 'مردان حق اور ارباب صدق وصداقت کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں لڑائی سے الگ رہنے والے حضرات مثلاً ابن عمرؓ وغیرہ کو ''مردانِ آخر بیں'' اور ''حامیان امن وصلح'' کے لفظ سے یاد کرتے ہوئے ان لفظوں کو واوین کے درمیان لکھا ہے جو عموماً اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ طنزیہ لفظ ہے (ملاحظہ ہو کتاب علی وحسین ص: 119)۔'' (53)

مولانا اعظمی نے بیس صفحات کے اپنے اس مضمون میں قاضی اطہر مبارکپوری کی جن غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان میں بعض ایسی بھی ہیں جو اصلاً غلطیاں نہیں ہیں، بلکہ مولانا اعظمی نے اپنی فہم وفراست سے غلطی سمجھ لیا ہے

۔اوپر مذکور اقتباس کا موازنہ کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' کی عبارتوں سے کیا جائے تو نتیجہ اس کے برعکس ہی ہوگا جو مولانا اعظمی نے بیان کیا ہے، اس کی اصل وجہ یہ موضوع ہے جس میں متعدد سوالات کا اطمینان بخش جواب ملنا تقریباً ناممکن ہے۔

3۔ ہندوستان میں علمِ حدیث کی اشاعت

برصغیر میں علمِ حدیث کی ابتدا اور محدثین کے موضوع پر قاضی اطہر مبارکپوری کا یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے، جس کی اشاعت 1973ء میں ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے جنوری اور فروری کے شماروں میں قسطوار ہوئی تھی ۔ ہندوستان میں علمِ حدیث کی اشاعت کے حوالہ سے علماء ومحققین کا یہ موقف رہا ہے کہ اس علم کی ابتدا برصغیر میں چھٹی صدی ہجری یا اس کے بعد میں ہوئی، اس کے برعکس اپنی تحقیقات کی روشنی میں قاضی اطہر مبارکپوری نے اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں اس ملک میں صحابہؓ وتابعینؒ کی آمد کے ساتھ حدیث کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، کیونکہ صحابہؓ وتابعینؒ کی یہ روایت تھی کہ جن علاقوں میں وہ جاتے وہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائے بلند کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس روایت کو اصول بنا کر اس مقالہ میں ہندوستان آنے والے صحابہؓ کے روایتِ حدیث پر مبنی واقعات کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے، بلکہ انہیں بنیاد بنا کر برصغیر سے علمِ حدیث کا تعلق خیر القرون کے دور سے جوڑا ہے، اس کے علاوہ اس زمانہ میں مسلم دنیا میں موجود ہندی الاصل جو علماء اور خاندان علم حدیث کی تعلیم وتدریس میں مصروف تھے، انہیں بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، ساتھ ہی ہندوستان کے ان شہروں کا تعارف کرایا ہے جو اس زمانہ میں علم کے مراکز تھے اور وہاں علمِ حدیث کا چرچا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے علمِ حدیث کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس مقالہ کے جواب میں ''ہندوستان میں علمِ حدیث اور قاضی اطہر'' کے عنوان سے دس صفحات کا ایک مضمون لکھا، جس میں انہوں نے ہندوستان میں علمِ حدیث کی اشاعت کے حوالہ سے قاضی صاحب کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور جن دلائل پر انہوں نے اپنے مقالہ کی بنیاد رکھی ہے، مولانا اعظمی نے انہیں خارج کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے خلاف تقریباً 34 نکات پیش کئے ہیں۔ اس جواب کا ماحصل ان کے مقالہ کا اولین پیرایہ ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں علمِ حدیث'' ایک عنوان ہے، جس پر ہندوستان کے کئی عالموں نے تحقیقی مقالات لکھے ہیں، سب سے آخر میں قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس عنوان کا مفہوم سمجھنے سے پہلے مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ اس مضمون کا مطلب ہے: ہندوستان میں علمِ حدیث کا درس، یا اس علم میں تصنیف

وتالیف، یا اس علم کی کتابوں کی اشاعت، وغیرہ۔ کسی خطیب کا خطبہ میں کسی حدیث کو پڑھ دینا، یا دورانِ گفتگو کسی حدیث کو ذکر کر دینا، یا کسی ہندوستانی قیدی کا عرب پہنچ کر مسلمان ہو جانا اور اس کی نسل سے کسی محدث کا پیدا ہونا، یا ہندوستان سے کسی کا عرب جا کر حدیث حاصل کرنا اور وہیں اس کی روایت کرنا ،اس عنوان کے مفہوم میں ہرگز داخل نہیں ہے۔'' (54)

اس اقتباس میں جن نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے قاضی اطہر مبارکپوری کے مقالہ میں ہو بہو وہ نکات پائے جاتے ہیں اور دونوں مقالات کا موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے جو کچھ اپنے مقالہ میں بیان کیا ہے وہ گرچہ حقائق پر مبنی ہے، لیکن موضوع کے شرائط اس میں پورے نہیں پائے جاتے، اس لئے یہ کہہ دینا کہ ہندوستان میں علمِ حدیث کے درس وتدریس کی بنیاد پہلی صدی ہجری میں ہی پڑ چکی تھی ایک بے بنیاد بات ہے، البتہ اس کے امکانات ضرور رہوئے ہوں گے، جس کی توثیق خود مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بھی کرتے ہیں۔ (55)

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں پر
اہلِ علم کے تبصرے

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں پر جہاں بعض لوگوں نے تنقیدیں کیں، وہیں ایک تعداد ایسے افراد کی بھی ہے، جنہوں نے ان کی کتابوں اور تحریروں پر ستائشی کلمات کہے۔ ان لوگوں نے الفاظ کو اخبار ورسائل کے صفحات اور خطوط میں منتقل کر کے ان کی کتابوں پر اپنے مثبت تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں قاضی صاحب کی کتابوں پر کیے گئے ان تمام تبصروں میں سے بعض کے اقتباسات کو متعلقہ کتابوں کے ضمن میں بیان کیا جا رہا ہے، اس میں ان لوگوں کے تبصرے بھی شامل ہیں جنہوں نے مصنف کی بعض تحریروں پر نقد کیا ہے۔

1۔ رجال السند و الهند

اس کتاب کے بعض پہلوؤں پر جہاں چند افراد نے تنقیدیں کیں، وہیں بہت سے افراد نے اس کے موضوع اور کتاب کی ترتیب اور اندازِ تحقیق کو پسند کیا، نیز مؤلف کو بھی اس پر داد و دہش پیش کی۔ جن لوگوں نے اس کتاب پر ستائشی کلمات کہے، ان کی تحریریں حسب ذیل ہیں۔

(1) مولانا عبد الماجد دریابادی اردو زبان کے مایۂ ناز انشا پرداز اور ادیب گزرے ہیں۔ ان کی یادگار کتابوں میں ''تفسیر ماجدی'' اور ''آپ بیتی'' اپنے موضوع پر اردو زبان میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اردو کے ادیب ہونے کے علاوہ یہ ایک کامیاب صحافی بھی تھے اور کئی اخبار ورسائل میں انہوں نے ادارتی فرائض انجام دیے تھے، ان کی ادارت میں نکلنے والا آخری پرچہ ہفتہ روزہ ''صدق جدید'' تھا، جس کے یہ تاعمر مدیر رہے، یہ اخبار ہر جمعہ کو لکھنؤ سے نکلتا تھا، اس میں سیاسی، سماجی، ملی اور مذہبی قسم کے مختلف مضامین کے ساتھ ساتھ ہر فن کی کتابوں پر مولانا دریابادی کے قلم سے تبصرے بھی شائع ہوتے تھے، چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری کی بعض کتابوں پر بھی ان کے قلم سے اس اخبار میں تبصرے شائع ہوئے۔ **رجال السند و الهند** پر ان کا تبصرہ 12 جون 1959ء کی اشاعت میں شائع ہوا، جس میں انہوں نے کتاب اور اس کے مصنف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''قاضی اطہر مبارکپوری کا نام پڑھے لکھوں کے لئے نامانوس نہیں، مدتوں سے وہ اسلامی، تاریخی، ملی عنوانات پر برابر لکھ رہے ہیں اور اب تک مقالات و مضامین کا انبار لگا چکے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ان کا

قلم تحقیقی میدان میں عربی میں بھی اپنی پختگی و روانی کا ثبوت دے سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب ساتویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی و پاکستانی مشاہیر اسلام کا تذکرہ ہے اور ایسے کاملین کا تذکرہ کوئی تین سو سے اوپر کا اس مجلّہ میں آ گیا ہے۔سب سے آخر میں ایک لمبی فہرست ماخذوں کی ہے، جس میں حدیث، رجال، تاریخ، جغرافیہ، ادب تذکرہ صوفیہ وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے نام درج ہیں۔

قاضی صاحب نے یہ کتاب تیار کر کے ہندوستانی اہل قلم کا سر دنیائے اسلام میں بلند کیا ہے، اس پر وہ اور ان کے پبلیشر (محمد احمد واخوانہ، بمبئی) دونوں قابل مبارکباد ہیں، کاش قاضی صاحب کو اتنی فرصت واطمینان نصیب ہو کہ کتاب کی آئندہ جلدوں کو چودہویں صدی ہجری تک کے مشاہیر تک لا سکیں۔''(56)

(2) دار المصنفین اعظم گڑھ ہندوستان میں مسلمانوں کا اہم ترین علمی ادارہ ہے، جہاں سے پچھلی ایک صدی میں دینی، علمی اور تاریخی نوعیت کی سیکڑوں تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ماہنامہ ''معارف'' اس ادارہ کا ترجمان ہے اور برصغیر کے وقیع مجلّات میں شمار کیا جاتا ہے۔ تقسیم ملک سے قبل مولانا سید سلیمان ندوی اس مجلّہ کے مدیر تھے، ان کے بعد یہ خدمت مولانا شاہ معین الدین ندوی کے سپرد ہوئی، جنہوں نے **رجال السند والھند** کے منظر عام پر آنے کے بعد ''معارف'' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''قاضی اطہر مبارکپوری نے ''رجال السند والہند'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے، اس میں قدیم یعنی ساتویں صدی سے پہلے کے علماء اور اصحاب کمال کے حالات جمع کرنے کی خصوصیت کے ساتھ کوشش کی گئی ہے جو عام طور سے کم ملتے ہیں، اس حیثیت سے اس کو نزہۃ الخواطر کا استدراک کہا جا سکتا ہے، فاضل مصنف نے بڑی محنت اور جستجو سے یہ کتاب لکھی ہے اور سیکڑوں مخزنوں کو کھنگال کر معلومات کا یہ خزانہ جمع کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ اور عربی طبقات وتراجم میں ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا، جس کے لیے فاضل مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں۔''(57)

(3) **لجنة احياء المعارف النعمانيه** دار المصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی نوعیت کا حیدرآباد میں ایک اہم علمی ادارہ تھا، جہاں سے ماضی میں حنفی مسلک کی کئی امہات الکتب تحقیق کے بعد شائع ہوئی۔ افغانستان کے مولانا ابوالوفاء افغانی اس ادارہ کے روح رواں تھے، جنہوں نے علماء کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر اسے قائم کیا تھا۔ مولانا افغانی سے قاضی اطہر مبارکپوری کے بھی علمی مراسم قائم تھے اور **لجنة احياء المعارف النعمانيه** سے شائع ہونے والی بعض کتابوں پر انہوں نے مقالے بھی لکھے، جو ان کی کتاب ''آثار واخبار'' میں شامل ہیں۔

مولانا افغانی نے اپنی چند تحریروں میں قاضی اطہر مبارکپوری کی بعض کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔ ان کا ایک

تبصرہ **رجال السند والھند** پر بھی ہے، جسے مولانا اسیر ادروی نے سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام کے ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر'' میں شائع کیا ہے۔ اس میں مولانا افغانی نے کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک ایسے گوشے کو پر کیا ہے جو اب تک خالی تھا، کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔'' (58)

(4) مفتی محمد شفیع عثمانی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے اجلہ تلامذہ میں سے ہیں، جو برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ **رجال السند والھند** کی طباعت کے بعد اس کی ایک نقل موصوف کو بھی دستیاب ہوئی، کتاب کے مطالعہ کے بعد انہوں نے مؤلف کے نام دو خط ارسال کئے، جن میں تراجم کتاب کی اہمیت وافادیت کا تذکرہ کرنے کے بعد مبارک باد پیش کی گئی ہے، ساتھ ہی طبع اول میں جو کام باقی رہ گیا تھا اس کی تکمیل کی طرف مؤلف کو توجہ دلائی اور ان کے حق میں دعائے خیر بھی کی۔ دو الگ الگ خطوط پر مشتمل موصوف کی اصل تحریریں حسب ذیل ہیں:

''آپ کا علمی تحفہ خود ہی اس کا مقتضی تھا کہ اس پر کچھ لکھا جائے، مگر فرصت کم ہونے کی وجہ سے تاخیر ہوئی، حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ جیسے کم علم کو اس کا حق بھی نہیں کہ اس عظیم تصنیف پر کوئی تقریظی کلمات لکھے، مگر اظہار مسرت اور تعمیل حکم کے لئے چند کلمات لکھ دیئے جو اسی خط کے ساتھ مرسل ہیں۔

بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ

6 شوال 1378ھ

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

حضرت العلامہ قاضی ابو المعالی اطہر مبارکپوری کی تصنیف ''رجال السند والہند'' کے مطالعہ سے مستفید اور محظوظ ہوا، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے ہندوسندھ کے مایۂ فخر و امتیاز مگر تاریخی مظلوم گروہ کے تراجم اور تذکرہ کو ایک منظم صورت میں پیش کر کے ایک بڑے خلا کو پورا فرمایا، آپ کی تحریر کے مطابق یہ بالکل صحیح ہے کہ ان ملکوں میں صوفیائے کرام اور اولیاء کے تذکرے اور سوانح حیات اور ان کے ملفوظات تو بڑی سرگرمی اور استیعاب کے ساتھ جمع کئے گئے، یہاں تک کہ بہت سے سوانح وتواریخ میں غلو اور مبالغے تک نوبت پہنچی، مگر علماء، مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء، فلاسفروں کے حالات ومقالات محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام ان ملکوں کی تاریخ لکھنے والوں نے نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ مصنف علام کو توفیق مزید عطا فرمائیں کہ اپنے وعدے کے مطابق ان رجال کا تذکرہ بھی جمع فرمادیں جو اگرچہ ہندوسندھ میں پیدا نہیں ہوئے، مگر ان کا طویل قیام استفادہ یا افادہ کی صورت میں ان

ملکوں میں رہا ہے، اللہ تعالیٰ ناشر کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے، جس نے اس مفید علمی سرمایہ کو بصورت طباعت شائع کر کے علمی دنیا کے لئے نہایت اہم تحفہ مہیا فرما دیا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی 15 اپریل 1959ء (59)

(5) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنے مقالہ ''رجال السند والہند پر ایک نظر'' میں جہاں ایک طرف کتاب کی لفظی و معنوی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، وہیں دوسری طرف تراجم کتاب کے حوالہ سے اس کی ترتیب و تحقیق میں مؤلف کی جو محنت صرف ہوئی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اس کام کو ایک ادارہ کے کام سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کتاب کی اہمیت اور مؤلف کی محنت کی داد دیتے ہوئے اس مقالہ کے اولین پیرایہ میں وہ لکھتے ہیں:

''ملک کے نامور انشاپرداز صحافی قاضی اطہر مبارکپوری کی جس کتاب کے لیے ہم چشم براہ تھے، شکر ہے کہ چند دن ہوئے وہ نہایت آب و تاب سے ٹائپ کے خوش نما حرفوں میں بمبئی سے شائع ہوگئی، یہ کتاب غیر منقسم بلکہ وسیع تر ہندوستان کے اہلِ کمال پر بہت تلاش اور تتبع سے لکھی گئی ہے، مدتوں سے اہلِ علم اور ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طبقہ میں اس کا چرچا تھا، اشاعت کی خبر پاتے ہی ہم نے اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اور بہت غور و فکر سے اس کا مطالعہ شروع کیا، اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب کی محنت و کاوش قابلِ داد ہے اور قاضی صاحب اس لحاظ سے مستحق مبارک باد ہیں کہ جو کام علمی اداروں کے کرنے کا تھا، وہ محض ذاتی دلچسپی و شوق کی بنا پر انہوں نے تنہا انجام دیا۔'' (60)

(6) مولانا اعظمی ہی طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی اپنے تنقیدی تبصرے کی آخری سطروں میں صاحبِ کتاب کو دادِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تاہم لائق مصنف قابل مبارک باد ہیں کہ عربی زبان میں یہ تذکرہ مرتب کر کے انہوں نے ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اور ابتدائی اور متوسط قرون اسلام میں عرب و ہند کے تعلقاتِ باہمی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔'' (61)

برِّ صغیر کے علماء کے علاوہ مختلف ذرائع سے عرب ممالک کے علماء و محققین کو بھی اس کتاب کی نقلیں دستیاب ہوئیں، مطالعہ کے بعد انہوں نے بھی مؤلف کے محققانہ اندازِ تحریر کو پسند کیا، نیز بعض نے اخبار و رسائل میں اس پر تبصرے کئے اور بعض نے مؤلف کو خطوط لکھ کر مبارکباد پیش کی۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ان تمام خطوط اور اخبار و رسائل کے صفحات میں شائع شدہ تبصروں کے تراشوں کو کاٹ کر اپنے پاس فائلوں میں محفوظ کر لیا تھا، ان کی وفات

کے بعد مولانا اسیر ادروی نے یہ تراشے ان کے صاحب زادوں سے حاصل کر کے ترجمہ کی شکل میں سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام کے خصوصی شمارے ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر'' میں شائع کر دیئے۔ اسی مجلّہ میں شائع شدہ بعض تراشوں اور خطوط کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(7) روزنامہ ''الندوۃ'' مکہ مکرمہ نے 27 شعبان 1378ھ / مطابق 1959ء کی اشاعت میں ''**نظرۃ فی کتاب رجال السند و الهند**'' کے عنوان سے تین کالموں کا ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا، اس کے اردو ترجمہ سے ماخوذ ایک اقتباس ذیل میں مذکور ہے:

> ''جب اسلام کی روشنی ہندوستان میں پہنچی اور غزوات وفتوحات کا سلسلہ چلا اس وقت اسلام کی بہت سی جلیل القدر شخصیتیں ہندوسندھ میں پہنچیں، جن میں صحابہ کرام اور تابعین کی مقدس جماعتیں تھیں، اس عہد زریں کی مفصل تاریخ اکابر رجال کے مستند تراجم ہندوستان کے ایک عظیم المرتبت محقق عالم اور اسلامی مؤرخ القاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری نے لکھے ہیں، ان کی کتاب رجال السند والہند کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مصنف نے اس کی تالیف میں کتنی مشقت ومحنت اٹھائی ہوگی، تاریخ وسیر کی کتنی کتابوں کو کھنگالا ہوگا اور بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہوگا؟ غزوات کی تحقیق اور کمیاب تراجم کی جستجو اور ان کو پوری تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔''(62)

(8) سعودی عرب میں حمد الجاسر نامی ایک مشہور صحافی، ادیب اور جغرافیہ داں گزرے ہیں۔ 1996ء میں انہیں عربی زبان وادب کی خدمت پر شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر قاضی اطہر مبارکپوری نے انہیں اپنی کچھ کتابیں ہدیہ کی تھیں، جس کے عوض میں موصوف نے شکریہ کے طور پر مؤلف کو جواب میں ایک خط لکھ کر ان کتابوں کو بہترین تحفہ سے تعبیر کیا ہے۔ ذیل میں خط کا اردو ترجمہ مذکور ہے، جس میں موصوف مکتوب الیہ سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

> ''**حضرة صاحب الفضيلة العالم الجليل المحقق المورخ الاسلامی الهندی القاضی ابو العالی اطهر مبارکفوری . اما بعد** : میں حیرت زدہ ہوں کہ ایسے جلیل القدر عالم کا کس زبان میں شکریہ ادا کروں، جنہوں نے بغیر ذاتی تعارف کے اتنی عظیم ترین تصنیفات مجھے ہدیہ میں بھیجی ہیں، سوائے اس کے کہ میرا اور ان کا ذہنی وفکری تعارف ہے، میرے خیال میں اس دنیا میں اس سے بہتر کوئی دوسرا تعارف ہو ہی نہیں سکتا۔
>
> محترمی! آپ کا بہترین تحفہ رجال السند والہند الی القرن السابع، العرب والہند فی عہد الرسالۃ، العقد الثمین، تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین کی شکل میں مجھے ملا، خدا آپ کو اس کا جزائے خیر دے، میں

سوائے شکریہ ادا کرنے کے اور کیا کرسکتا ہوں، دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تصانیف بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں، لیکن پریشانی یہ ہے کہ میرا موضوع جغرافیہ جزیرۃ العرب ہے اور اسی موضوع پر میری کتابیں ہیں، معلوم نہیں آپ کے ذوق کے مطابق کون سی کتاب ہوگی، اس لئے میں کتابوں کے نام اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں، ان میں سے جو کتابیں آپ منتخب فرمائیں میں ان کو اولین فرصت میں آپ کو بھیج کر خوشی حاصل کرسکوں۔ آخر میں آپ کی عنایت کا ایک بار اور شکرادا کرتا ہوں۔''

حمد الجاسر، شارع حمد الجاسر حی الورود السلیمانہ،

الریاض المملکۃ السعودیۃ۔(63)

(9) ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مصر میں ایک بڑے مشہور عالم گزرے ہیں، انہیں علمِ تاریخ سے خاص دلچسپی تھی اور اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھ چکے تھے،'' آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ موصوف ایک تحریر میں **رجال السند و الهند** کے تراجم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی ہستیوں کے حالات میں بہت بڑی کوشش ہے اور ہر پڑھنے والا اس کی قدر کرے گا۔''(64)

(10) مؤتمر عالمِ اسلامی کے رکن شیخ عبدالعالی عقباوی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اپنے موضوع پر واحد اور نادر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں کس قدر اہم ہستیاں گزری ہیں اور انھوں نے کیا کیا اسلامی خدمت کی ہے''۔(65)

(11) کتاب ''تاریخ مکہ'' کے مصنف استاد احمد السباعی مکی اس کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مصنف نے ایسے ایسے نادر و نایاب ماخذوں اور کتابوں سے ہندوستان کے قدیم علماء کے حالات جمع کئے ہیں، جن کا ملنا دشوار ہے، اللہ تعالیٰ اس جیسی کتاب سے ہمیں محروم نہ کرے۔''(66)

(12) اور جامع بنی امیہ دمشق کے ایک استاذ شیخ سلمان دمشقی نے اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''اس میں شک نہیں کہ مؤلف نے اس حق کو ادا کر دیا ہے جو ہمارے اوپر علمائے امت کی طرف سے واجب تھا۔''(67)

2۔العقد الثمین

قاضی اطہر مبارکپوری کی کتابوں میں ایک اہم تالیف" **العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعین** "ہے،جس میں انہوں نے خلفائے راشدین اور بنوامیہ کے عہد میں ہندوستان میں ہونے والی سیاسی وانتظامی سرگرمیوں کا نقشہ کھینچا ہے، نیز یہاں آنے والے صحابہؓ، تابعینؒ اور امراء وحکمرانوں کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں۔اس موضوع پر اب تک لکھی گئی کتابوں میں یہ پہلی مفصل کتاب ہے، جسے اس کے مؤلف نے کافی تحقیق وتدقیق کے بعد مرتب کیا ہے۔1968ء میں جب یہ کتاب ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی ممبئ سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی تو علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی، نیز عرب ممالک اور برصغیر کے متعدد علماء نے اس پر تبصرہ کیا، مؤلف کی تعریف وتوصیف میں ستائشی کلمات کہے اور اسے تحقیقی کاموں کی ایک اہم کڑی قرار دیا، اسی حوالہ سے ذیل میں برصغیر اور عالم عرب کی چند علمی شخصیات کے تاثرات نقل کیے جارہے ہیں۔

(1) مولانا سعید احمد اکبرآبادی ماہنامہ "برہان" میں اس کتاب کی بابت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "فاضل مصنف برصغیر ہندو پاک کے نامور محقق عالم اور مصنف ہیں، ان کی تحقیقات کا موضوع خاص ہندوستان سے اسلام کا تعلق ہے، چنانچہ اب تک اس سلسلہ میں متعدد کتابیں عربی اور اردو میں ان کے قلم سے نکل کر ارباب علم ونظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، زیر تبصرہ کتاب بھی اسی زنجیر طلائی کی ایک کڑی ہے، اس میں موصوف نے بڑی تفصیل اور تحقیق سے بتایا ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا تعلق کب قائم ہوا اور دونوں ملکوں پر اس تعلق کے اثرات کیا پڑے، عہد نبوت، عہد خلافت راشدہ اور پھر عہد بنوامیہ میں اس تعلق کی نوعیت کیا رہی، فتوحات یا تجارت وتبلیغ واشاعت اسلام کی تقریب سے ہندوستان میں صحابہ وتابعین میں سے کون کون سے بزرگ تشریف فرما ہوئے اور ان کی وجہ سے اس ملک کی تہذیب و ثقافت اور مذہب وسیاست میں کیا انقلاب ہوا۔زبان بڑی شستہ اور رواں ہے۔آخر میں مضامین اور مآخذ کی الگ الگ دو فہرستیں ہیں، غرض کہ بڑی ہی دلچسپ، معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے۔فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ہندوستان اور عرب کی تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔"(68)

(2) مجلّہ "معارف"، اعظم گڑھ کے مدیر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے دسمبر 1969ء کے شمارہ میں **العقد الثمین** کا تعارف کراتے ہوئے لکھا:

> "مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے عرب وہند خصوصاً ان کے ابتدائی اسلامی عہد کے تعلقات پر اردو اور

عربی میں کئی کتابیں لکھ دی ہیں، یہ عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ اور بنوامیہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات اور خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کا تذکرہ اور غزوات وفتوحات یا دعوت وتبلیغ وغیرہ کی غرض سے یہاں آنے والے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تراجم قلم بند کئے گئے ہیں اور آخر کے ایک باب میں اس زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماء ومحدثین کا اجمالی تذکرہ بھی ہے۔" (69)

چند سطور کے بعد بیان کیا:

"اس سے مسلمانوں کے ہندوستان پر ابتدائی حملے اور قبضے کی روداد اور قرن اول اور قرن ثانی کے ان مجاہدین، امراء، عساکر، حکام ووالیانِ ریاست کے، جو یہاں آئے اور مختلف مناصب پر فائز ہوئے یا داعیوں اور مصلحوں یا جن کا کسی نوع کا بھی یہاں سے تعلق رہا ہے، کے حالات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کتاب عرب وہند کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، زبان وبیان دلکش وسلیس ہے۔" (70)

(3) مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدق جدید" میں کتاب اور صاحبِ کتاب سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"اعظم گڑھ کا نام مولانا شبلی سے زندہ ہے اور شبلی کا خاص کارنامہ تاریخ امت ومشاہیر امت ہیں۔ شبلی کی خلافت سلیمان ندوی کو ملی اور سلیمان نے علاوہ دوسری خدمتوں کے ایک بڑی خدمت ہند وعرب کی مشترکہ تاریخ لکھ کر انجام دی، اب اسی سلسلہ کی ایک شاخ کی آبیاری اسی ضلع کے قاضی اطہر کر رہے ہیں اور ہند کے ابتدائی عربی عہد کی تاریخ سند واستناد کے ساتھ ایک دلچسپ وشگفتہ انداز میں عربی میں مرتب کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی رجال السند والہند اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں وغیرہ اسی زنجیر طلائی کی کڑیاں ہیں اور اس کی تازہ ترین قسط یہ پیش نظر کتاب ہے۔

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے یعنی فتح سندھ کے سلسلہ میں جو صحابہ اور تابعین ہندوستان غازی یا داعی کی حیثیت سے آئے، ان کا تذکرہ اور سندھ، مکران، گجرات کے صوبوں اور ڈابھیل، بھڑوچ، تھانہ وغیرہ مختلف شہروں کی خاصی تاریخ آگئی ہے۔ ارکان حکومت کی نظر سے اگر یہ سطریں گزر سکیں تو عرض یہ ہے کہ یہ کتابیں ہند وعرب دونوں حکومتوں کی سرپرستی وقدر دانی کی مستحق ہیں۔" (71)

(4) اس کتاب کی اشاعت کے بعد مؤلف نے اس کے بعض نسخے بھی ہدیۂ حجاز ومصر کے علمی حلقوں میں روانہ کیے، جہاں کچھ لوگوں نے بغور کتاب کا مطالعہ کیا اور مکتوب کی شکل میں اپنی آراء مؤلف کو ارسال کر دیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے جن عرب علماء کو یہ کتاب بھیجی تھی ان میں سے ایک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مساعد

الامین العام شیخ عمر بن محمد الفلاتی تھے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد موصوف نے مؤلف کے نام ایک خط میں کتاب کے متعلق اظہارِ رائے فرماتے ہوئے لکھا:

''آپ کا مکرمت نامہ اور اس کے ساتھ آپ کی بے مثال تصنیف ''العقد الثمین'' موصول ہوئی۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا، اس کے مقدمہ کو دیکھا، اس کے بعض مباحث کا مطالعہ کیا اور جب اس کے مآخذ و مراجع پر نظر ڈالی تو میں حیرت زدہ رہ گیا، اس کے بعض عنوانات پر جو نادر معلومات آپ نے فراہم کی ہیں حق یہ ہے کہ دوسروں کے بس کی بات نہیں، آج ملت اسلامیہ کو اسی طرح کی تحقیقی کتابوں کی ضرورت ہے، لیکن اس دشوار گزار راہ پر چلنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ ہماری خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے تاکہ ملت اسلامیہ آپ کے علمی و تحقیقی کارناموں سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکے۔''(72)

(5) شیخ عبد القدوس انصاری سعودی عرب میں ایک صحافی گزرے ہیں۔ موصوف جدہ سے نکلنے والے مجلّہ ''**المنهل**'' کے مدیر تھے اور مؤلف کتاب کا مقالہ ''نارجیل سے نخیل تک'' اس مجلّہ میں شائع کر چکے تھے، اس لیے جانبین میں مدت سے علمی روابط قائم تھے۔ **العقد الثمین** کی اشاعت کے بعد مؤلف نے ایک نسخہ انہیں بھی دیا، جس کے مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنے ایک خط میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''آپ کا بیش قیمت ہدیہ ''العقد الثمین'' پا کر بیحد خوشی ہوئی، آپ کی یہ تصنیف بے مثال ہے، اس نے تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے خلا کو پر کر دیا ہے، میں نے کتاب ہاتھ میں لیتے ہی ابتدا سے انتہا تک حرفاً حرفاً پڑھ ڈالی، مجھے ایسی اہم اور نادر معلومات حاصل ہوئیں جو بڑی بڑی کتابوں سے بھی شاید نہ حاصل ہوتیں، یہی نہیں بلکہ میں نے اس سے بہت سے اقتباسات نوٹ کر لیے ہیں جو اسی سال کے دوسرے شمارے میں انشاء اللہ آئیں گے، قارئین المنہل کے لئے یہ ایک لاجواب تحفہ ہوگا، خدا آپ کو تادیر امن و عافیت سے رکھے۔''

10 جون 1969ء (73)

(6) قاضی اطہر مبارکپوری کی اس کتاب پر سب سے جامع اور مفصل تبصرہ مصر کے شیخ محمد عبداللہ السمان کا ہے، جو انہوں نے چھ سالہ جیل کی قید و بند سے رہائی کے بعد سعودی عرب کے ہفت روزہ اخبار ''الدعوة'' کے مدیر کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا تھا۔ اس سلسلہ میں الدعوۃ کے مدیر اور ان کے مابین تفصیلی گفتگو ہوئی، جسے بعد میں مضمون کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اس انٹرویو کا اردو ترجمہ مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے قاضی اطہر مبارکپوری کی قلمی تحریروں سے نکال کر اپنے ایک مضمون کے ساتھ شائع کر دیا تھا، اسی مضمون سے ماخوذ اس انٹرویو کے بعض

اقتباسات یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔ انٹرویو میں ایڈیٹر نے شیخ محمد عبداللہ السمان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

''بے مثال مصنف اور مفکر اسلام عبداللہ السمان اسلامی میدان میں تیس سال سے محنت کر رہے ہیں اور اسلامی مبلغین اور دعاۃ میں اول درجہ کے ہیں، امام شہید حسن البناء کی صحبت اختیار کی اور ان سے متاثر ہوئے اور دین کی خاطر سینہ سپر ہونا انھیں سے سیکھا، ان کی پہلی ہی تصنیف ''الاسلام جائر لطف اھلہ'' پر ان کو جیل بھیج دیا گیا اور وہ کئی بار حکومت مصر کے عتاب کا نشانہ بنے، آخری مرتبہ مکمل چھ سال 1975ء سے 1981ء تک نظر بند رہے اور جیل خانہ سے اس حال میں نکلے کہ آپ کے ایمان میں مزید تازگی تھی، موصوف ایک قدیم رسالہ کے ایڈیٹر تھے جس کو استاذ احمد حسن الزیات نکالتے تھے، جامعہ ازہر کے میگزین الازھر کے وہ مستقل مقالہ نگار تھے، آپ کی 60 سے زیادہ تصنیفات ہیں اور الثقافۃ الاسلامیہ کا سلسلہ اشاعت 1958ء تک مسلسل سات سال جاری رہا ہے، مگر بار بار جیل جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا، جس کا اسلامی انسائکلو پیڈیا میں اہم ترین مقام تھا۔''

اس کے بعد ایڈیٹر نے استاد موصوف کے انٹرویو کو ''**مع العقد الثمین فی فتوح الھند**'' کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع کیا ہے، جس میں موصوف سے پوچھا گیا کہ چھ سالہ جیل سے رہائی کے بعد آپ عہد اسلامی کی ابتدائی فتوحات کی تاریخ و تحقیق پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟ حالانکہ اس سے قبل آپ نے اس پہلو پر کبھی اظہار خیال نہیں کیا۔ شیخ نے ایڈیٹر کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں نے سابقہ گفتگو میں کہا تھا کہ جس چیز نے میرے ذہن میں یہ قضیہ پیدا کیا وہ العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین کتاب ہے، ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کتاب کا مختصراً تعارف کرایا جائے۔ یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ کتاب مذکور کے مؤلف ہندوستان کے اسلامی مؤرخ ہے، بلکہ ہندوستانی علماء، محققین، مفکرین میں امتیازی حیثیت کے مالک اور ممتاز و سربرآوردہ ہیں، جو قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری کے نام سے بھی مشہور ہیں۔''

بعد ازاں قاضی اطہر مبارکپوری کے حالات زندگی اور کتاب کی اہمیت و خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''موصوف اس وقت مجلّہ البلاغ کے ایڈیٹر ہیں، مؤلف موصوف کی یہ کتاب ''العقد الثمین'' تاریخ اسلام کی پہلی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ کی آپ کی چار کتابیں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ رجال السند والہند، العرب والہند فی عہد الرسالۃ، الحکومات العربیۃ فی الہند، چوتھی کتاب المجد الغابر للہند الاسلامیہ، پانچوی کتاب یہ العقد الثمین ہے، اس میں اسلامی ہند کی اسلامی فتح کے آغاز سے حکومت

اموی کے اخیر دور تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حیات کو تادیر قائم رکھے، تاکہ مؤلف موصوف اپنی تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری رکھ سکیں، فی الحال موصوف نے ہندوستان میں عباسیوں کی حکومت کی تاریخ کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

العقد الثمین کی تالیف وترتیب میں مکمل دو سال 1386ھ سے 1388ھ تک صرف ہوئے ہیں، پہلی مرتبہ ہندوستان میں طبع ہوئی تھی اور دوسرا ایڈیشن دار الانصار قاہرہ سے شائع ہوا ہے، اس کے علاوہ دوسری کتابیں بھی قاہرہ میں چھپ رہی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اس سلسلہ میں قابل قدر محنت فرمائی ہے، غزوات اور فتوحات کی تحقیق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے، بلکہ موصوف تحقیقی میدان میں ان حضرات سے سبقت لے گئے ہیں، جنہوں نے غزوات وفتوحات کی تحقیق میں حصہ لیا ہے، مؤلف موصوف اپنی کتاب میں ان حضرات کا تعارف بھی کراتے ہیں جن کا اس میں ذکر ہے اور ہر ایک کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں جس کا وہ مستحق ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض ترجمہ چھوٹا ہے اور بعض بڑا ہے، چونکہ یہ تراجم معتمد مراجع سے ماخوذ ہیں اس لئے ہر ایک محقق اور مفکر کے نزدیک ان کو بڑی مقبولیت اور بڑا درجہ حاصل ہے۔

اب تک ہندوستان میں عہد اول کی جو تاریخیں لکھی گئیں وہ سرسری اور ضمنی حیثیت سے لکھی گئیں، مشہور مورخ مدائنی متوفی 225ھ نے ہندوستان کی عہد اول کی تاریخ میں تین کتابیں لکھیں اور واقدی متوفی 207ھ نے بھی اخبار فتوح السند، لکھی لیکن ان کی حیثیت اسلام کی عالمی تاریخ کے ایک جزء کی ہے، تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے اور پوری تحقیق نہیں کی گئی جو اس کتاب العقد الثمین میں موجود ہے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے عہد اول کی تاریخ اسی ملک کے اہل علم کے قلم سے ہو اور پوری تفصیل و تحقیق سے ہو، اگر ساری دنیا میں اسلام کے ابتدائی نفوذ کی تاریخ اسی طرح لکھی جائے جیسی العقد الثمین میں ہے تو اسلام کی نئی نسل میں احیاء اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا، اس سے ان کو حوصلہ ملے گا، کیونکہ عہد صحابہ وتابعین کے جوش جہاد اور دعوت اسلام کا جذبہ ان تاریخوں سے ملے گا وہ کہیں سے نہیں ملے گا، اگر عالمی پیمانہ پر یہ کام ہو جائے تو پھر اسلام ساری دنیا میں ایک ابھرتی ہوئی قوت کے طور پر اپنا وجود منوالے گا اور نئی نسل اپنی قدیم تاریخ سے اسلامی جذبہ مستعار لیکر عملی میدان میں آ گئی تو ساری دنیا کو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔"

الدعوۃ، سعودیہ عربیہ،

28 صفر 1403ھ / مطابق 13 دسمبر 1982ء (74)

3۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب سابقہ کتاب کے نصف اول کا اردو ترجمہ وتشریح ہے، جو 1972ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے متعلق اہلِ علم حضرات نے رسائل وخطوط میں جو تبصرے کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

(1) مولانا عبدالماجد دریابادی ''صدق جدید'' لکھنؤ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے موضوع پر ایک جامع اور فاضلانہ کتاب، عہد خلافت راشدہ سے ہندوستان میں صحابہ و تابعین کی آمد اور ان کے حالات، تمدنی، جغرافیائی، تاریخی وسیاسی ہر زاویہ سے ان پر نظر، مندرجات میں تحقیق واحتیاط کی پوری کوشش، تاریخ وسیر کی بیسیوں بلکہ پچاسوں کتابوں کا خلاصہ اور لب لباب، معلومات کی ایک قاموس، خواص وعوام دونوں کے لئے قابل مطالعہ۔'' (75)

(2) مولانا ضیاء الدین اصلاحی ''معارف'' میں اس کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''عرب و ہند کے تعلقات اور ان سے متعلق مباحث فاضل مصنف کا خاص موضوع ہے اور اس پر وہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، زیرنظر کتاب میں خلافت راشدہ کے زمانہ میں عرب و ہند تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے، پہلے مختصراً عہد رسالت میں، پھر خلافت راشدہ میں دونوں ملکوں کے جو تعلقات رہے، ان کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، اس سلسلہ میں اس دور میں ہندوستان میں غزوات وفتوحات اور یہاں کے سیاسی وانتظامی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری ابواب میں اس عہد میں ہندوستان میں عربوں کی آمد اور عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی اور ہندوستان میں آنے والے صحابہ وتابعین کے مختصر تراجم سے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کتاب محنت وتحقیق اور تلاش وجستجو سے لکھی گئی ہے، لیکن حشو وزوائد سے خالی نہیں، مصنف کی کئی کتابوں کا مرکزی موضوع یہی رہا ہے، اس لئے ان میں یکسانیت کے علاوہ بعض مباحث کا تکرار بھی ہے۔ شروع میں مراجع ومصادر کی مفصل فہرست دی گئی ہے، علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی اس موضوع کی مہتم بالشان کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' کا ذکر پتہ نہیں اس میں کیوں رہ گیا ہے۔'' (76)

(3) اور مولانا ابوالوفاء افغانی اس کتاب کے تعلق سے اپنے ایک مکتوب میں مصنف کو دعائیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کے مطالعہ سے فارغ ہو کر شکریہ کیا اور آپ کیلئے داعی ہوں کہ آپ کی جدو جہد کو اللہ جل شانہ مبارک کرے اور اس دار کے مزید دروازے آپ کے لئے

کھولے، ماشاءاللہ جہاں تک جانے کے ابواب مسدود تھے آپ نے اپنی کوشش سے انھیں کھول کر اندر سے جواہر نکالے اور عالم علم کو مالا مال کیا، یہ آپ ہی کا حق تھا کہ یہاں پہنچ سکے، گوابھی مزید جدو جہد کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اسے میسر کردے۔"

ابوالوفا افغانی حیدرآباد

14 رجب 1392ھ (77)

4۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب چند اہم تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے ۔مولانا عبدالماجد دریابادی "صدق جدید" میں اس کی بابت لکھتے ہیں:

"قاضی اطہر مبارکپوری مدیر ماہنامہ "البلاغ" بمبئی ملک کے ایک معروف و مستند اہل علم ہیں جنھیں ان کے افادات کے لحاظ سے بے اختیار ندوی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے، دنیائے عرب میں بھی وہ متعارف ہو چکے ہیں اور اردو میں ان کے مقالات و تصانیف کا ذخیرہ اب خاصا ضخیم ہو چکا ہے، پیش نظر کتاب ان کے آٹھ مقالوں کا مجموعہ ہے اور ہر مقالہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھنے والا اور اپنے موضوع پر فاضلانہ بحث کرنے والا۔ قدیم فاتحین ہند اور قدیم ہندی علماء، فضلاء اور عربی، ہندی، سیاسی، ثقافتی تعلقات ان سب موضوعوں پر اس کتاب کے اندر اچھی خاصی تاریخی معلومات مل جائیں گی۔" (78)

5۔ تذکرہ علمائے مبارک پور

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب قصبہ مبارک پور اور اس کے اطراف و جوانب میں آباد بستیوں کی چار سو سالہ علمی تاریخ پر مبنی ہے، جسے انہوں نے پچیس سال میں مرتب کیا تھا۔ کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے بعد جن چند علماء نے اس کے مضامین پر تاثرات پیش کئے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) سید ابوالحسن علی ندوی نے مصنف کے نام ایک خط میں اس پر تبصرہ کیا ہے، وہ خط ذیل مذکور ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

فاضل گرامی! زادلطفہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا، اس مرتبہ مئی جون کے اوائل میں حجاز جاتے ہوئے اور واپسی میں کئی روز بمبئی میں قیام ہوا، آپ غالباً تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے ملاقات نہیں ہوئی، اغلب ہے کہ آپ وطن آئے ہوئے ہیں، دو ہی چار دن ہوئے کہ آپ کی جدید فاضلانہ تصنیف"

تذکرہ علمائے مبارک پور'' پہونچی۔اس کے لئے دلی شکریہ قبول کیجئے،خصوصی تعلق کی بنا پر مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری کا تذکرہ تو پہلی ہی فرصت میں حرفاً حرفاً پڑھ لیا، پھر جستہ جستہ کتاب پرنظر ڈالی ،ابھی اور دیکھنا ہے، یہ موضوع تو میرے لئے ہمیشہ سے دلچسپ اور دل آویز رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں آپ سے بہت کام لئے ،رسالہ ''التوحید'' پر تبصرہ آپ کے قلم سے پڑھا، ذوق ومسلک کے اتحاد کا رنگ صاف نمایاں ہے، مگر افسوس ''انقلاب'' کے پڑھنے والوں میں ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو اس تبصرہ سے فائدہ اٹھائیں، کاش یہ تبصرہ کسی علمی رسالہ میں شائع ہوتا۔

آپ کا پرانا وعدہ ایک مرتبہ رائے بریلی آنے کا ہے، خدا کرے آپ کسی آمد وطن کے موقع پر اس کو پورا فرمائیں۔

مخلص۔ابوالحسن علی

15 اگست 1974ء(79)

(2) اور مولانا عبدالماجد دریابادی ''صدق جدید'' میں بیان کرتے ہیں:

''قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ملی و دینی طبقہ میں نہ صرف ایک مستند سنجیدہ مقالہ نگار بلکہ اچھے مصنف اور اہل قلم کا درجہ رکھتے ہیں، خصوصاً تاریخ ملی کے موضوعوں پر۔خوشی کی بات ہے کہ اب ان کی توجہ خود اپنے وطن کی طرف مبذول ہوئی ہے اور اپنے قصبہ مبارک پور کی تاریخ پر ایک مفصل کتاب لکھ ڈالی، قصبہ کی ساڑھے چار سو سال کی تاریخ اس میں آگئی ہے اور اس میں بادشاہوں، عالموں، فاضلوں، ادیبوں، شاعروں، فقیہوں سبھی کے تذکرے آگئے ہیں۔عبارت بہت دلچسپ ہے۔''(80)

6۔علیؓ وحسینؓ

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ بھی ایک تحقیقی کتاب ہے، جسے انہوں نے محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافتِ معاویہؓ ویزید'' کے جواب میں تحریر کیا تھا۔مارچ 1960ء میں جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو برّصغیر کے علمی حلقہ میں نہ صرف اسے پسند کیا گیا، بلکہ مجلّات ورسائل میں تفصیل سے اس پر تبصرے بھی کیے گئے ،ان ہی تبصروں میں سے چند تحریروں کے منتخب اقتباسات حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق جدید'' لکھنؤ 5 اگست 1960ء کے شمارے میں اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

''محمود عباسی صاحب کی معلوم ومعروف کتاب ''خلافت معاویہؓ ویزید'' کی تردید میں اہل سنت کے عالموں نے بھی بہت کچھ لکھا، ان سب میں زیادہ جامع اور سنجیدہ مضمون وہ تھا جو قاضی اطہر مبارکپوری

صاحب کے قلم سے روزنامہ ''انقلاب'' (بمبئی) میں قسط وار مدتوں نکلتا رہا اور اب بعد نظر ثانی اس کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ عام طور سے نہیں، لیکن کہیں کہیں مناظرانہ رنگ کتاب میں آ گیا ہے۔'' (81)

(2) اردو زبان کے مشہور شاعر و مصنف ماہر القادری کا ایک مضمون ستمبر 1960ء میں ماہنامہ ''فاران'' کراچی میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں انہوں نے قاضی اطہر مبارکپوری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان کی کتاب ''علیؓ و حسینؓ'' کا موازنہ محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافتِ معاویہؓ و یزید'' سے کیا ہے اور مضمون کے اولین پیرایہ میں کتاب ''علیؓ و حسینؓ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''محمود عباسی کی ناپسندیدہ کتاب ''خلافت معاویہؓ و یزید'' نے مسلمانوں میں جو فتنہ کھڑا کر دیا ہے، اس کی رد میں اب تک جتنی کتابیں آئیں ہیں، ان میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب (علیؓ و حسینؓ) سب سے زیادہ مدلل، جامع اور باوقار ہے۔'' (82)

(3) مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے قاضی اطہر مبارکپوری کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب پر بھی تبصرہ کیا اور اسے محمود احمد عباسی کی کتاب کے رد میں سب سے بہتر کتاب بتاتے ہوئے لکھا:

''محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہؓ و یزید'' نے اگر چہ ہندو پاک کے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا کیا، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ بعض اہل قلم اور سنجیدہ حضرات نے کتاب مذکور کے مضامین کا علمی اور سنجیدہ رد لکھا اور اس کی وجہ سے اصل مبحث کے متعلق اردو میں اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا۔ انہیں گنتی کے چند مصنفوں میں قاضی اطہر ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں، جو ان کے مسلسل مضامین کا کا مجموعہ ہے، پہلے ان تدلیسات و تلبیسات کا پردہ چاک کیا ہے جو عباسی صاحب نے اختیار کی تھیں، اس کے بعد حضرت علیؓ اور ان کے دور خلافت پر، امام حسینؓ کی شخصیت اور ان کے مقام و موقف پر اور پھر یزید کی ولیعہدی اور اس کے عہد امارت کے واقعات پر علمی سنجیدگی اور کمال احتیاط سے روشنی ڈالی ہے اور دوسرے مآخذ کے علاوہ حافظ ابن تیمیہ، ابن خلدون اور ابن کثیر وغیرہم کے ان مآخذ سے بھی استدلال کیا ہے جن پر عباسی صاحب کو بڑا بھروسہ تھا، اس کے بعد متفرق مگر مفید مباحث مثلاً حدیث ملک عضوض، قاتل حسین عمر بن سعد، حدیث غزوۂ مدینہ، قیصر اور یزید پر گفتگو کی ہے۔ غرض کہ عباسی صاحب کی کتاب کے رد میں اب تک جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں، زیر تبصرہ کتاب جامع اور معتدل نقطۂ نظر اور سنجیدہ تحقیق و زبان کی حامل ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔'' (83)

(4) اس کتاب پر ایک تبصرہ مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے اخبار ''مدینہ'' بجنور میں ستمبر 1960ء کے کسی تاریخ میں شائع ہوا تھا، جس کا بعض حصہ مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے اپنے مضمون میں شامل کر لیا۔ اس

مضمون میں قلم کار نے کتاب ''علیؓ وحسینؓ'' پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اللہ تعالی جزائے خیر عنایت فرمائے جناب قاضی اطہر مبارکپوری کو کہ انھوں نے جذبات سے بالاتر ہوکر ''خلافت معاویہؓ و یزید'' کا جواب جیسا چاہئے تھا، لکھا اور خوب لکھا، موصوف نے عباسی کے ترجمہ، مآخذ اور اقتباسات کی غلطیوں، عبارت کی کتر بیونت کو اس عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے کہ دوسرے کے بس کا کام نہیں تھا، قاضی صاحب نے یہاں تک کیا کہ اصل مآخذ اور نام نہاد مآخذ کو بھی بتلادیا، کتاب کے شروع کے 22 صفحات بطور مقدمہ جواہرات سے تولنے کے قابل ہیں جن میں موصوف نے کچھ تاریخی اصول بیان کئے ہیں، میرے نزدیک قاضی صاحب کی عجوبہ روزگار کتاب کو بار بار شائع ہونا چاہئے، کیا ہمدردان علیؓ وحسینؓ اس طرف توجہ کریں گے؟۔'' (84)

7۔معارف القرآن

قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب روزنامہ انقلاب میں ''جواہر القرآن'' کے عنوان سے شائع شدہ منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ 1956ء میں یہ کتاب چھپ کر جب منظر عام پر آئی تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق جدید میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک کہنہ مشق صاحبِ قلم ہیں، بمبئی کے اخبارات وجرائد میں ان کے قلم سے دینی، اسلامی، اصلاحی عنوانات پر مضامین سالہا سال سے نکل رہے ہیں، یہ ان کے اس قسم کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر مضمون کا تعلق قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ہے۔ جلی عنوانات توحید، رسالت، کتاب اور دینی زندگی نظر آئے۔ قرآن مجید کی جو خدمت بھی، خواہ کسی درجہ کی ہو، اخلاص کے ساتھ کی جائے مستحق اجر ہوتی ہے اور اس کتاب کے مصنف اجر کے حقدار بہر حال ہو چکے۔ حالاتِ حاضرہ پر اشارے مصنف جابجا کرتے گئے ہیں جو اکثر صورتوں میں مفید بھی ہیں اور پرلطف بھی۔'' (85)

8۔حج کے بعد

قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف میں شامل یہ مختصر کتابچہ ان کی ان چند تقاریر پر مشتمل ہے جو انہوں نے 1955ء میں حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ سے وطن واپسی پر بحری جہاز میں حجاج کرام سے مخاطب ہوکر کی تھیں۔ 16 ستمبر 1957ء کو اخبار ''الجمعیۃ'' میں اس پر ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں مضمون نگار نے کتاب اور مصنف دونوں کے متعلق لکھا:

''قاضی اطہر مبارکپوری صاحب قلم اور عالم فاضل ہونے کے ساتھ اہل دل بھی ہیں، انہوں نے اس

کتاب میں دل کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیئے ہیں، تبصرہ نگار نے کتاب کا پورا تعارف کرایا ہے۔(86)

9۔تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں

130 صفحات پر مشتمل قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب 1969ء میں شائع ہوئی تھی، موصوف نے اس میں علمِ دین کی اشاعت و تبلیغ سے متعلق صحابہؓ تابعینؒ اور سلفِ صالحین کے حالات و واقعات مستند ذرائع سے نقل کیے ہیں۔

(1) مولانا عبدالماجد دریابادی اخبار ''صدق جدید'' میں اس کے حوالہ سے مصنف کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس دعویٰ کا ثبوت کہ عہد سلف میں مسلمانوں کے مدرسے، مسجدیں، بازار سارے ہی مقامات تبلیغ و تعلیم کے میدان ہوتے تھے، مصنف کی وسعت نظر اور وسیع معلومات ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔''(87)

(2) اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ جون 1971 کے شمارہ میں کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

> ''زیرِ نظر کتاب میں حدیث، سیر، طبقات، رجال اور تاریخ کی کتابوں سے ابتدائی چند صدیوں کے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی انہماک اور دعوتی و تبلیغی سرگرمی کے واقعات ذکر کر کے دکھایا گیا ہے کہ اس عہد میں مسجدوں اور گھروں کے علاوہ بازاروں، راستوں اور ان تمام مجالس و محافل میں بھی جو مادی کاروبار کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں، درس و تدریس اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یہ سب تحریریں البلاغ بمبئی میں شائع ہو چکی تھیں، ان کو کتابی صورت میں شائع کر کے ناشر نے ایک مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے۔''(88)

10.جواهر الاصول فی علم حديث الرسول

یہ ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فارسی کی تالیف ہے۔قاضی اطہر مبارکپوری نے اسے 1973ء میں تصحیح و تحقیق کے بعد شائع کیا تھا۔جن اہلِ علم نے اس پر اپنی آراء بیان کیں، ان کی تحریریں حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق جدید'' میں اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ''حدیث نبویؐ کے ضخیم دفتروں سے قطع نظر خود اصول حدیث حدیث کا ایک مستقل فن ہے اور اس کے ماہرین فن نے تصنیفات کا انبار لگا دیا ہے اور ان میں ایک ممتاز لکھنے والے متاخرین میں ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فارسی ہیں، خوشی کی چیز ہے کہ ہمارے ہندوستان کے ایک معروف فاضل قاضی اطہر

صاحب مبارکپوری نے ان کی کتاب ''جواہر الاصول'' کا قلمی نسخہ کہیں سے ڈھونڈ نکالا تصحیح اور مقابلہ کے بعد اس کو شائع کرایا۔ کتاب مستند اور بلند پایہ اور طلبۂ فن کے ہر طرح کام کی ہے۔''(89)

(2) اور مولانا انظر شاہ کشمیری نے ماہنامہ ''دار العلوم'' میں اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مدارس کے نصابِ تعلیم میں شامل کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر کتاب شیخ علی فارسی کا علم حدیث پر منضبط جامع رسالہ ہے جس پر مشہور اہل علم قاضی اطہر مبارکپوری نے تعلیقات قائم کی ہیں اور مختلف مراجع سامنے رکھ کر مضامین کی تشریح وشواہد پیش کئے، رسالہ کی عربی اس قدر ہلکی پھلکی اور رواں دواں ہے کہ عربی سے معمولی شدبد رکھنے والا بھی بے تکلف استفادہ کرسکتا ہے، اگر تعلیقات میں اسماء معرب کردیے جاتے تو کتاب کی افادیت دوچند ہوجاتی، یہ رسالہ تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب کیا جاسکتا ہے۔(90)

11۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی تصانیف میں یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جو پہلی دفعہ 1988ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کی اشاعت سے پینتیس سال قبل 1954ء میں اسی موضوع پر مصنف کا ایک مقالہ ماہنامہ البلاغ کے خصوصی شمارہ ''تعلیمی نمبر'' میں شائع ہوا تھا، اس مقالہ کو علمی حلقوں میں خوب پسند کیا گیا، نیز مقالہ نگار کو اس پر مستقل کتاب لکھنے کا مشورہ دیا گیا، مزید برآں اہلِ علم حضرات نے اس پر شاندار تبصرے بھی کئے، جن میں سے دو تبصرے ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔

(1) پہلا تبصرہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہے۔ موصوف نے صدق جدید میں ماہنامہ البلاغ کے ''تعلیمی نمبر'' پر تفصیل سے تبصرہ کیا اور اس مقالہ کا خصوصی طور پر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ان میں ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' کو پڑھ کر اچھے اچھے پڑھے لکھوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔''(91)

(2) اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی پچیس مقالات پر مشتمل مصنف کی ایک دوسری کتاب ''مآثر و معارف'' کے مقدمہ میں اس کی اہمیت پر زور ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ مقالہ اس لائق ہے کہ صنعت وحرفت کی انقلاب انگیز توسیع وترقی کے اس دور میں مختلف جدید اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو، ساتھ ہی ہمارے علماء کو بھی اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے، جو علمی مشیخت میں گم ہوکر اور زندگی کے عملی میدان سے بے تعلق ہوکر بیٹھ گئے ہیں۔''(92)

12۔تدوین سیر ومغازی

قاضی اطہر مبارکپوری کی فہرستِ کتب میں شامل یہ بھی ایک اہم کتاب ہے، جسے انہوں نے وفات سے چندسال قبل مرتب کیا تھا۔بعض اصحابِ قلم نے اپنی تحریروں میں اس کتاب کی اہمیت وخصوصیات بھی بیان کی ہیں، جن میں مولانانظام الدین اسیرادروی اور پروفیسرظفراحمدصدیقی کے مضامین سے ماخوذ اقتباسات حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا نظام الدین اسیر ادروی اپنے ایک طویل مضمون میں زیرِ تبصرہ کتاب کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تدوین سیر ومغازی تو اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، کسی فن کی ایجاد ایک تدریجی عمل ہے، جب اس کی بنیاد پڑتی ہے تو کوئی بھی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ ایک فن کا آغاز ہو رہا ہے، اس فن کے اجزاء الگ الگ سیکڑوں کتابوں میں بکھرے ہوئے رہتے ہیں، اس لئے فن کی ابتدائی کڑیوں کو تلاش کرنا اوران کو جوڑنا دقت طلب کام ہوتا ہے۔فن سیر ومغازی مسلمانوں کا ایجاد کردہ ایک خاص فن ہے اوراساطین امت نے اس فن میں اہم ترین کتابیں لکھی ہیں، اسلامی تہذیب وتمدن کی جڑیں اسی فن کی تفصیلات میں پیوست ہیں، اس فن کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ پھر تدریجی طور پر یہ فن باقاعدہ کب مرتب ہوا؟ اس دقیق ترین بحث کو قاضی صاحب نے اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کام میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی جدوجہد، مشکلات اوران کی وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے۔یہ کتاب بھی قاضی صاحب کے شاہکاروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔''(93)

(2) اور پروفیسر ظفراحمد صدیقی اس کی اہمیت مندرجہ ذیل جملہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ہمارے محدود علم کے مطابق اردو بلکہ عربی میں بھی یہ اپنے موضوع پر اب تک کی سب سے بہتر اور منفرد کتاب ہے۔''(94)

یہ وہ چند تبصرے ہیں جو علماء ومحققین کی جانب سے قاضی اطہر مبارکپوری کی ان کتابوں پر کیے گئے اوران سے ان کی اہمیت وافادیت کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ علمی دنیا میں خود مصنف کا کیا مقام ومرتبہ تھا اس کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو علمی شخصیات نے خطوط کی شکل میں انہیں لکھے، آئندہ صفحات میں وہی تحریریں زیرِ بحث ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری معاصرین کی نظر میں

(چند علمی شخصیات کے خطوط کے حوالہ سے)

معاصرین کی نگاہ میں قاضی اطہر مبارکپوری کی کیا وقعت تھی اور ان کے نزدیک وہ کیا مقام و مرتبہ رکھتے تھے ؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان خطوط و مراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں جو ملک و بیرون ملک کے ہمعصر علماء، ادباء اور مصنفین و محققین نے انہیں لکھے تھے۔

قاضی اطہر مبارکپوری سے خط و کتابت کرنے والوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے اور تمام لوگوں کے خطوط حفاظت کے ساتھ انہوں نے فائلوں میں محفوظ کر رکھے تھے۔ ان کی وفات کے بعد صاحب زادے قاضی ظفر مسعود نے جب تمام مکتوبات کی ایک فہرست تیار کی تو خطوط کی مجموعی تعداد 1057 شمار کی گئی اور لکھنے والے 218 تھے، جن کا تعلق برصغیر کے علاوہ عرب، یوروپ و افریقہ کے دور دراز علاقوں سے تھا۔ قاضی ظفر مسعود نے بعد میں مکتوبات کے اس مجموعہ سے ایک معتد بہ حصہ اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اشاعت کی غرض سے مولانا اسیر ادروی کے حوالہ کر دیا، جنہوں نے ان خطوط کو مجلّہ ترجمان الاسلام کے خصوصی شمارہ "مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر" میں شائع کیا۔

اس مجلّہ میں شائع شدہ مکاتیب میں سے مولانا ابوالوفاء افغانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرنساوی اور پروفیسر ایم ایس خان وغیرہ کے خطوط و مراسلات منتخب کرکے یہاں ذکر کیے جارہے ہیں، کیونکہ ان سے قاضی اطہر مبارکپوری کی لیاقت و دانش مندی کا پتہ چلتا ہے اور انہیں علمی دنیا میں جو وقعت و اہمیت حاصل تھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

2۔ مولانا ابوالوفاء افغانی کا خط

لجنة احياء المعارف النعمانيه، حیدرآباد کے رئیس مولانا ابوالوفاء افغانی ایک مکتوب میں قاضی اطہر مبارکپوری سے تاریخ و تصوف کی چند کتابوں کی بابت استفسار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عزیزم قاضی اطہر مبارکپوری!

زمانہ ہوا آپ کی خیریت سے ناواقف ہوں، امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ چند کتب کی ضرورت ہے، مگر بازار میں موجود نہیں ہیں، کیا آپ ان میں سے کسی کا پتہ لگا سکتے ہیں؟ فوائد الفواد، تذکرہ علمائے

ہند، لطائف اشرفی، سیدالعارفین، گلزارابرار یا اس کا اردو ترجمہ، اذکار الابرار، خیرالمجالس بہ تصحیح پروفیسر خلیق احمد، ان کے سوا اولیاء ہند کے ملفوظات اصل یا تراجم ہوں اور میسر آ سکتے ہوں، آپ ان کی راہ پیدا کریں تو ممنون ہوں گا۔ بمبئی میں علماء کا اجلاس ہو رہا ہے، مجھے بھی دعوت نامہ ملا ہے، لیکن میں اپنے امراض وضعف کی وجہ سے شریک نہ ہوسکوں گا۔

ابوالوفاء، 11 ذی قعدہ 1392ھ (95)

خط کے جواب میں قاضی صاحب نے مولانا ابوالوفاء افغانی کو لکھا:

مخدومی ومحترمی!

السلام علیکم

میں قبل رمضان وطن چلا گیا تھا، تقریباً ڈھائی ماہ کے بعد واپسی ہوئی، آپ کے مسلم پرسنل لاکنونشن بمبئی میں شریک نہ ہونے پر افسوس ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر علوم اسلامیہ کی خدمت کے لئے زندہ رکھے۔

گزارش یہ ہے کہ "تذکرہ علمائے ہند" اب بالکل نایاب ہوچکی ہے، اس کا ایک نسخہ زائد مرے پاس ہے میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں، آجکل میں رجسٹری کے ذریعہ روانہ خدمت کردوں گا، قبول فرمایئے، محمد حسن غوثی ہندوی کی کتاب گلزار ابرار اب تک غیر مطبوع اور قلمی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ اس کا اصل نسخہ کہاں ہے؟ البتہ اس کا اردو ترجمہ گلزار ابرار ایک زمانہ میں آگرہ میں چھپا تھا، اپنے متعدد مقالات میں اس سے مدد لی ہے مگر میرے پاس نہیں ہے۔ لطائف اشرفی (ملفوظات وحالات حضرت سید اشرف سمنانی کچھوچھوی) کا اصل فارسی نسخہ زمانہ ہوا دہلی میں چھپا تھا، اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مبارک پور میں ہے، میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے، بوقت ضرورت آپ کے لئے مطلوبہ چیزیں روانہ کراسکتا ہوں، فوائد الفواد مطبوع ہے مگر نایاب ہونے کے باوجود کہیں سے مل جائے گی، سیدالعارفین بھی چھپ چکی ہے، خیرالمجالس کے لئے پروفیسر موصوف سے مراجعت فرمائیں، ان کتابوں کے علاوہ اولیاء ہند کے حالات وملفوظات میں میرے کتب خانہ میں مشکوٰۃ النبوۃ، خلاصۃ الاصفیاء، کرامات الاولیاء، ملفوظات قادری، معدن المعانی کے قلمی نسخے موجود ہیں، بحر ذخار کا نادر نسخہ سنا ہے کہ حیدرآباد میں ہے، ایسے ہی ایک نسخہ جونپور میں بھی ہے، اسی طرح مرأۃ الابرار کا نادر نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہے۔

والسلام (96)

2۔ پروفیسر ایس ایم خان کا خط

اسی طرح درج ذیل خط میں کلکتہ سے پروفیسر ڈاکٹر ایم ایس خان ایک کتاب کے بارے میں قاضی اطہر

مبارکپوری سے دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں ایک خاص علمی سوال کر رہا ہوں کہ آپ جلد از جلد اس کا جواب دیکر عند اللہ ماجور ہوں گے۔ اکتوبر سال رواں کے معارف (اعظم گڑھ) ص:305 میں آپ کا موقر مضمون ''الہند فی العہد الاسلامی'' پڑھا، اس کے صفحہ 306 پر آپ نے لکھا ہے کہ ''اسی طرح فضل اللہ عمری کی کتاب مسالک الامصار میں تغلقی دور کے بارے میں بہت قیمتی معلومات درج ہیں، مگر اس کا یہ حصہ ابھی تک مخطوطہ ہے۔'' مجھے اس حصے سے کافی دلچسپی ہے اور میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس کا پورا حوالہ لکھ دیں اور اپنے ماخذ بھی، یہ معلومات آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے، کیا آپ اس مخطوطہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟ وہ کس لائبریری میں ہے؟ ہوسکتا ہے کہ میں اسے حاصل کر کے ایڈٹ کر دوں۔

ایم ایس خان

8 دسمبر 1972ء (97)

ان کے جواب میں قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں:

مکرمی!

''مسالک الابصار فی ممالک الامصار''، فضل اللہ عمری کی کتاب کا پہلا حصہ مدت ہوئی نہایت آب و تاب سے مصر میں چھپ کر شائع ہوا ہے، میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، باقی جلدیں دار الکتب المصر یہ میں قلمی موجود ہیں، ڈاکٹر خورشید دہلی نے وہاں سے، وہ حصے جو ہندوستان سے متعلق تھے، نقل کر کے اصل مع ترجمہ کے مرتب کیا ہے، ندوۃ المصنفین دہلی سے ''اضواء جدیدۃ علی تاریخ الہند'' کے نام سے شائع ہوا ہے، آپ وہاں سے یہ کتاب طلب کر کے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سلسلہ میں باقی معلومات اس کے مقدمہ میں مل جائے گی۔

والسلام

قاضی اطہر مبارکپوری

25 دسمبر 1972ء (98)

3۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خط

قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ایک خط مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی دریافت ہوا۔ اس میں موصوف نے قاضی اطہر مبارکپوری سے ان کی علمی لیاقت کی بنا پر اپنے والد عبدالحی حسنی کی کتاب ''**الھند فی العھد الاسلامی**'' پر تفصیلی تبصرہ کی فرمائش کی ہے۔ اصل تحریر ملاحظہ کیجیے:

رائے بریلی

22 جون 1972ء

فاضل گرامی محب سامی زیدت معالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور تمام علمی وتالیفی مشاغل جاری، نفع اللہ بکم وبعلومکم۔

افسوس ہے کہ 8 جون کو جب میں بمبئی سے واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پاکر بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا جس میں ''انقلاب'' کے دوتین تراشے تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الہند فی العہد الاسلامی کا ایک کثیر الاشاعت اخبار میں نام آیا اور اس کا مختصر مگر وقیع تعارف بھی ہوگیا، اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک اچھا نوٹ اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا جو اول سے آخر تک آپ ہی کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا، اگرچہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست اس کتاب کی اشاعت کی اطلاع ملی ہے اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع کر رہے ہیں، اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا، ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہنچا، بمبئی سے اطلاع ملی ہے کہ پانچ نسخے وہاں پہنچے ہیں، اب دیکھئے کب تک لکھنؤ پہنچتے ہیں۔

مجھ کو پہلے تو یہ خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرنے کے وقت یہ نیت تھی کہ آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی درخواست کروں، جس کو آپ اشاعت کے لئے ''معارف'' کو بھیجیں، ہندوستان میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چند گنی چنی شخصیتوں کو حق ہے ان میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے اور آپ کا یہ موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش ومحنت کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم گروہی عصبیتوں سے بھی پاک ہے جو ہمارے اہل علم اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون ''معارف'' کے لئے سپرد قلم فرمائیں، جس میں اس کتاب کا علمی جائزہ لیا گیا ہو اور اس کا مقام متعین کیا جائے، خاص طور سے ہندوستان کے نظم مملکت، انتظامی ڈھانچے، اس عہد کے متعلق بیش قیمت معلومات اور خطط وآثار کے حصے پر فاضلانہ

اور منصفانہ تبصرہ ہو، یہ ان رسمی تبصروں سے ہزار درجہ بہتر ہوگا جو ایڈیٹر صاحبان جستہ جستہ نظر ڈال کر لکھ دیا کرتے ہیں اور جن سے کتاب کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

یہ میری آپ سے پہلی فرمائش ہے جس کی جرأت مجھے اس عزیز تعلق کے علم کے بعد ہوئی جو میرے نانا صاحب اور آپ کے نانا صاحب کے درمیان تھا، امید ہے کہ آپ اس کو رد نہ فرمائیں گے۔ آپ مضمون جب لکھ لیں یا تو براہ راست بھیج دیں اور مجھے اطلاع کر دیں یا میرے پاس روانہ کر دیں، میں شاہ صاحب کو بھجوادونگا۔

آخر میں عرض ہے کہ اس کو کتاب کے ہدیہ کی قیمت ہرگز نہ سمجھیں اور طبیعت پر جبر بھی نہ کریں، آپ کے مضمون کے بعد ہی اس کا خیال آیا اور اس کو بے تکلف عرض کر دیا، افسوس ہے کہ آپ لوناولہ تشریف نہ لائے، میں نے محمد بھائی اور اسماعیل بھائی سے ذکر بھی کیا، مگر وقت کم رہ گیا تھا اور قاری صاحب بھی بمبئی تشریف لائے ہوئے تھے، ورنہ تھوڑا سا وقت آپ کے ساتھ اچھا گزر جاتا۔

معلوم ہوا کہ بمبئی میں بارشیں شروع ہوگئیں، گویا ہمارے ہی جانے کا انتظار تھا، یہاں تو شدت کی گرمی پڑ رہی ہے اور نگاہیں آسمان کی طرف ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

والسلام

مخلص ابوالحسن علی

22 جون 1972ء

پوسٹ بکس نمبر 93 لکھنؤ (99)

4۔ مولانا سید محمد میاں کا خط

مولانا سید محمد میاں قاضی اطہر مبارکپوری کے خاص اساتذہ میں ہیں، لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں انہوں نے اپنے اس شاگرد کی بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ ماہنامہ شاہی کے خصوصی شمارہ ''تاریخ شاہی نمبر'' نومبر، دسمبر 1992ء میں شامل قاضی اطہر مبارکپوری کا ایک مضمون بعنوان ''استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی سے میرا تعلق''، صفحہ 440 تا 456 پر شائع ہوا ہے، اس مضمون میں انہوں نے مولانا محمد میاں سے اپنے روابط اور قلبی لگاؤ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس کے علاوہ مضمون کے آخر میں گیارہ خطوط بھی نقل کیے ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً انہیں لکھے تھے۔ انھیں خطوط میں سے ایک خط ذیل میں نقل کیا جارہا ہے جس میں مولانا محمد میاں نے قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں چند مفید مشورے دیئے ہیں۔ خط کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب 1973ء میں ممبئی چھوڑ کر واپس اپنے وطن مبارک پور آنا چاہتے تھے اور اس کی اطلاع انہوں نے ایک خط کے ذریعہ مولانا کو دی تھی، جس کے جواب میں انہوں نے حسب ذیل خط لکھا:

محترم مولانا دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

عزیز نامہ باعث مسرت ہوا اور تبصرہ مستوجب شکریہ، جزاکم اللہ، دیر آید درست آید، مگر آپ نے استاذ محترم لکھ کر تبصرہ کا وزن کم کر دیا، استاذ کی تصنیف کی تو تعریف کی ہی جاتی ہے، بہر حال آپ کا تبصرہ باوزن ہے، پھر آپ نے خصوصیات تحریر فرما کر اشتہار بھی مفت میں شائع کر دیا اور اس کا کوئی مطالبہ ہو سکتا ہے تو مطلع فرمائیے، تاکہ پیش کیا جائے۔ اچھا آپ کا بمبئی سے دل گھبرا گیا؟ اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے تو کیا پارچہ بافی کا کارخانہ قائم کریں گے یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہو جائے تو بمبئی سے دل گھبرا جانا مبارک! مگر شاید یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر کیا؟ صرف مطالعہ کریں گے یا مطالعے کا کوئی حاصل بھی پیش کر سکیں گے؟

احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں:

1۔ انسائکلو پیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے اور اگر وسائل مہیا ہو تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے، مگر عربی اور فارسی کی واقفیت سے کام نہیں چلے گا، ہندی سے بھی واقفیت ہونی چاہیے اور انگریزی سے بھی، مگر کام بہت بڑا ہوگا، ہندوستان کی تمام اہم لائبریریوں کو کھنگالنا پڑے گا۔

2۔ اگر یہ نہ ہو تو دوسرا کام ہے: ''تاریخ مذاہب ہند''۔ یہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہے، ابو ریحان البیرونی کی ''الہند'' سے مدد مل سکتی ہے، مگر کم از کم ہندی کی واقفیت بھی اس میں ضروری ہے۔

3۔ تیسرا کام جوان کے مقابلے میں آسان ہے، وہ ''تاریخ علماء اور مشائخ ہند'' ہے۔ اس میں بہت مواد آپ کو مل سکتا ہے، مگر یہ استیعاباً ہونا چاہیے، اس میں اتنا اضافہ اور کرلیں اور ان کے سیاسی وسماجی ماحول یعنی ''تاریخ مشائخ ہند، ان کے سیاسی اور معاشرتی ماحول اور خدمات''، ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اسی انداز پر مرتب کیا گیا ہے، مگر وہ صرف سلسلۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدود میں محدود ہے، وہ آپ کو نمونہ کا کام دے سکتا ہے، مگر مبارک پور میں یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے، اس کے لئے بھی آپ کو قدیم کتب خانوں سے استفادے کے لیے سفر کرنے پڑیں گے، تب وہ قابل قدر چیز ہوگی۔ تینوں کاموں کے لئے جانفشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے، کیا بمبئی میں کوئی گانٹھ کا پورا مل سکتا ہے؟

تقریباً ایک ماہ ہوا بواسیر کا شدید دورہ ہے، کم از کم دو بوتل خون نکل گیا، چلنا پھرنا مشکل ہو گیا، مگر الحمد للہ قلم چلتا رہا، چندروز کے علاوہ سلسلۂ درس بھی جاری ہے، البتہ بخاری شریف کی پریشانی ہے۔

والسلام

قدیم دعاگو، محتاج دعا

19 رجب 1393ھ/19 اگست 1973ء (100)

5۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا خط

علمائے ہند میں ایک بڑا نام ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ہے جن کا شمار اسلامی علوم وفنون کے بلند پایہ محققین میں ہوتا ہے ۔فرانسیسی زبان میں قرآن کے ترجمہ کے علاوہ اردو وعربی میں ان کی کئی مشہور کتابیں ہیں ۔قاضی اطہر مبارکپوری کے ان سے خاص علمی روابط تھے اور جانبین میں خط وکتابت کے ذریعہ علمی گفتگو بھی ہوتی تھی ۔قاضی صاحب کے نام ذیل میں ان کا بھی ایک خط درج ہے،ملاحظہ کیجئے:

> آج نوازش نامہ ملا،سرفراز ہوا..... آپ کی فاضلانہ کتاب کا ذکر سن چکا ہوں،خاص کر بمبئی کے پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن صاحب سے،لیکن ادھر کی ڈاک اب انگریزوں کے زمانہ کی طرح نہیں ہے، مشیۃ اللہ غالبۃ،کتاب آپ کی اور تالیفوں کی طرح نفیس اور مفید ہی ہوگی اور اس کی قطعاً محتاج نہیں کہ ایک ناچیز اس کا تعارف کرائے۔
>
> عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید
>
> 26ذی الحجہ 1410ھ(101)

6۔مولانا محمد یوسف بنوری کا خط

مولانا محمد یوسف بنوری علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز شاگرد اور ان کے علوم کے شارح تھے۔علم حدیث میں انہیں خصوصی کمال حاصل تھا،ساتھ ہی عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے،قاضی اطہر مبارکپوری کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ان کی سرپرستی حاصل تھی ۔موصوف ایک خط میں علمی موضوع پر ان سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تقریباً ایک ماہ بعد نامۂ گرامی کا جواب دے رہا ہوں،اس اضطراری تاخیر کے لئے معافی چاہتا ہوں، رجال السند والہند کا شکریہ،ماشاءاللہ خوب زیور طبع سے آراستہ ہوئی،جزاکم اللہ خیراً۔رجال السند والہند کے سلسلے میں ایک بہت بڑے محقق،جو امام صغانی کے معاصر ہیں،گزرے ہیں،مسعود بن حسین بن شیبہ ہندی صاحب کتاب التعلیم،جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی حمایت میں امام الحرمین وغزالی کی سخت تردید کی ہے،غالبًا اس کو میں نے دیکھا ہوگا،اس وقت مزید کچھ یاد نہیں،تقریظ عند الفرصت لکھ کر ارسال کردوں گا،انشاءاللہ۔

ایسے ہی ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> نامۂ گرامی نے ممنون فرمایا،کل انشاءاللہ معارف السنن خالد صاحب کے یہاں پہنچادی جائے گی، سنن سعید بن منصور کا کام مکمل ہوگیا،الحمدللہ خوش خبری آپ سے سنی۔

جواہر الاصول للتقی الفاسی المکی کا مجھے بالکل علم نہیں، دیکھ لیجئے کہ اگر فوائد ہوں تو اس پر کام کیجئے، بہر حال یہ فن اب بہت غنی ہوگیا، اچھا ذخیرہ مطبوعات میں آگیا ہے۔ آپ کے صاحب زادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاء اللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔

20 صفر المظفر 1384ھ (102)

7۔ جنرل محمد ضیاء الحق کا خط

جنرل محمد ضیاء الحق کا شمار پاکستان کے عظیم رہنماؤں اور سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ ان کا عہد پاکستان کی تاریخ کا روشن باب ہے جنہوں اس ملک کو ایٹمی طاقتوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ آرمی چیف اور اچھے سیاستداں ہونے کے علاوہ وہ علم دوست آدمی بھی تھے اور اسلامی تاریخ سے خاص شغف رکھتے تھے۔

1986ء میں پاکستان کے صوبۂ سندھ کی ایک تنظیم ''فکر ونظر سندھ''، سکھر نے اسلامی تاریخ کے موضوع پر کچھ کتابیں شائع کیں، جن میں قاضی اطہر مبارکپوری کی چار کتابیں (ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، خلافتِ بنوامیہ اور ہندوستان، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان) بھی شامل تھیں۔ کتابوں کی اشاعت کے بعد تنظیم کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو نے ہر کتاب کا ایک نسخہ جنرل ضیاء الحق کو ارسال کیا۔ دو سال کے بعد موصوف نے پروفیسر اسد اللہ بھٹو کو خط لکھا اور اس علمی تحفہ پر شکریہ ادا کیا، نیز ان کی تنظیم، جو بلند پایہ علمی خدمت انجام دے رہی تھی، اس پر مبارکباد بھی پیش کی۔ درمیانِ خط کتابوں کے تذکرے میں انہوں نے قاضی اطہر مبارکپوری کی دو کتابوں کا بطور خاص ذکر کیا اور انہیں محققانہ علمی سرمایہ تسلیم کرتے ہوئے مصنف کو داد شجاعت پیش کی۔ خط کی اصل تحریر حسب ذیل ہے:

جمادی الاول 1408ھ

13 جنوری 1988ء

مکرمی

السلام علیکم! گزشتہ دنوں آپ کی تنظیم ''فکر ونظر سندھ'' کی طباعت کردہ چودہ کتب بہ زبانِ اردو اور فارسی موصول ہوئیں، کتابیں بھیجنے کا شکریہ!

یہ کتابیں قاری کے لئے اپنے اندر بے پناہ مواد رکھتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عام قاری بھی میری طرح انہیں مفید پائے گا۔

آپ کی تنظیم نے لوگوں کو تاریخِ اسلام اور مشاہیرِ اسلام سے روشناس کرانے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے وہ

بہت مستحسن اور قابلِ قدر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ساحلِ مراد بخشے۔ آمین، آپ کی ان مساعی سے عام لوگوں کے علاوہ نوجوان نسل کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے متعارف کرانے اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں مدد ملے گی۔

اگر چہ آپ کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں قابلِ قدر ہیں لیکن میں قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتب ''خلافتِ امویہ اور ہندوستان'' اور ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' کا بطورِ خاص ذکر کروں گا اور ان کی عرق ریزی اور محققانہ دیانت داری کی داد دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتب تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی ۔

میری طرف سے ایک دفعہ پھر اتنی جامع اور مفید کتب شائع کرنے پر دلی مبارکباد قبول کیجیے، اللہ تعالیٰ آپ کی ان نیک کوششوں کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین

محترم پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب — خیر اندیش

صدر تنظیم فکر و نظر سندھ — محمد ضیاء الحق

سندھ، اسلامک سینٹر، سکھر (103)

8۔ مولانا ابو محفوظ الکریم کی ایک تحریر

اس سلسلہ کی آخری تحریر مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کی ہے۔ موصوف مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ تاریخ میں لکچر رتھے اور عربی زبان پر مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب'' **رجال السند والهند** '' کو حرف بہ حرف پڑھا اور اس میں جو خامیاں نظر آئیں انہیں ایک مقالہ کی شکل میں ترتیب دے کر برہان میں شائع کر دیا۔ کتاب پر تنقید کے باوجود انہیں مصنف کتاب کے علمی مقام و مرتبہ کا اعتراف تھا، جس کی شہادت انہوں نے اپنے ایک منظوم سفر نامے میں دی ہے۔ اپریل 1994ء میں وہ دار المصنفین کے کسی کام سے اعظم گڑھ آئے اور دورانِ قیام ایک دن قاضی اطہر مبارکپوری سے ملاقات کے لئے مبارک پور بھی گئے، لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اعظم گڑھ سے واپسی پر انہوں نے اپنے اس سفر کی روداد نظم کی شکل میں عربی زبان میں بیان کی اور اسے مع اردو ترجمہ کے قاضی صاحب کو بھیج دیا۔ ذیل میں اسی منظوم سفر کا اردو ترجمہ مذکور ہے:

مبارک پور کا سفر

9 ذی قعدہ 1414ھ / مطابق 21 اپریل 1994ء

1۔ وہ دن کتنا بابرکت اور عظمت والا تھا، جب میں اعظم گڑھ شہر سے روانہ ہوا اور میرے ساتھ ایک

معتبر رہبر مولوی ابوالبرکات صاحب تھے۔

2۔قصبہ مبارک پور میرے اس سفر کی منزل تھا، میں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر پہنچا۔

3۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے باہر بہت دور گئے ہوئے ہیں، پہلے سے میں نے انھیں اطلاع آنے کی نہ دی تھی۔

4۔وہ سہارنپور میں یا اسی علاقہ میں کہیں قرطاس وقلم کے درمیان واقع ہیں۔

5۔ جہاں وہ علم وفن کے حسین موتیوں اور جواہر پاروں کو تصنیف وتالیف کی لڑی میں پرورہے ہیں۔

6۔ وہاں میری ملاقات پہلے حسان سے ہوئی، پھر تھوڑی دیر کے بعد مولوی ظفر مسعود سے ہوئی، دونوں بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔

(حسان احمد اور مولوی ظفر مسعود قاضی صاحب کے صاحب زادگان گرامی ہیں)

7۔صاحب زادگان محترم نے بے تکلفی اور بشاشت کے ساتھ مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، انھیں اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

8۔دونوں کیا خوب فرزند ہیں اوران کے والد محترم بھی کیا خوب ہیں،نہایت شریف اور پاک طینت لوگ ہیں۔

9۔پھر مولوی ظفر مسعود مجھے ان محدث کے گھر لے گئے،جن کا ابھی چند ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔

(یعنی شیخ کبیر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)

10۔ان کے دو صاحب زادوں سے بطور تعزیت کے ملا،اس تازہ شاخ سے اصل کی خوشبو محسوس ہوئی۔

(ایک مولانا عبدالرحمٰن اور دوسرے ان کے بھائی مولانا عبدالعزیز،دونوں عالم وفاضل ہیں)

11۔وہاں اتفاقاً سید ابوالحسن علی ندوی بھی موجود تھے،میری حاضری سے وہ خوش ہوئے۔

12۔پھر سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے اور میں بھی قاضی اطہر صاحب کے گھر آ گیا۔

13۔ظفر مسعود اپنے گھر لے آئے اوران کی بیٹھک میں ہم نے آرام کیا۔

14۔ظہر کی نماز کے بعد انہوں نے کھانا کھلایا،عمدہ اور لذیذ کھانا۔

15۔پھر انہوں نے اپنی موٹر سائیکل پر مجھے بٹھایا اور بڑی مہارت سے چلا کر لے گئے۔

16۔ یہ مولانا عبیداللہ صاحب کی قبر ہے،جنہوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے اوراچھی خاصی بابرکت زندگی گزاری ہے۔

17۔صاحب ورع تھے،متواضع اور خاشع وخاضع تھے،انہوں نے حدیث کی نشر واشاعت اپنی فکر و ذہانت سے بھی کی اور تحریر وکتابت سے بھی۔

18۔ان کی کتاب مرعاۃ المصابیح اس بات کی دلیل ہے کہ ہادئ اکرم ﷺ کی سنتوں سے انہوں نے حظ وافر پایا تھا۔

19۔وہی صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی قبر ہے، تحفۃ الاحوذی جو ہر شک وتذویر کے لئے شفا ہے۔

(یعنی شیخ محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری علیہ الرحمۃ متوفی 16 شوال 1353ھ)

20۔رسول پور میں مولانا احمد حسین صاحب کا مرقد ہے، جو علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے طرز کے شاعر تھے۔

(یعنی شیخ ، ادیب ، کبیر مولانا احمد حسین ابن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ ، میرے والد محترم کے دوستوں میں سے تھے، میں نے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی ، وہ ہمارے دوست قاضی اطہر کے نانا تھے)

21۔وہ صاحب زہد وورع تھے، علم کے بحر ذخار تھے، نیکی وسعادت کے جمال اور برائی کی سراپا تردید تھے۔انھیں بدوی طلاقت، شہری جگمگاہٹ اور عمدگی کی رونق حاصل تھی۔

22۔ہم نے عصر کی نماز وہیں کی مسجد میں پڑھی اور ان بزرگ کے گھر کی زیارت کی۔

23۔یہ قبریں ایسے علمی وعملی کمالات کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے بیان سے زبانیں قاصر ہیں۔

24۔اللہ تعالیٰ ان پر بھی اور ہم پر بھی رحم فرمائے اور اپنے فضل عمیم سے سب کی مغفرت فرمائیں۔

25۔انھیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے دین یسیر کے طفیل باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔

26۔میرے اس بیان واقعہ سے قاضی اطہر صاحب کے خاندان کے امتیازات نمایاں ہیں۔

27۔رب کائنات انھیں انتہائی خوشحالی اور پھلتی پھولتی زندگانی عطا فرمائے۔

29۔پھر ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں یعنی اعظم گڑھ شہر لوٹ آئے۔(104)

یہ تمام تحریریں قاضی اطہر مبارکپوری کی دیانتداری اور محققانہ علمی صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے، ساتھ ہی ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معاصر اہلِ علم کی نگاہ میں وہ بلند پایہ علمی مقام رکھتے تھے۔معاصرین کے ان خطوط کے علاوہ موصوف کے علمی مقام ومرتبہ اور خدمات کے اعتراف میں وہ مقالات ومضامین بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جو ان کی وفات کے بعد مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوئے اور مضمون نگاروں نے ان میں ان کے علمی وتحقیقی کارناموں کو تسلیم کیا۔

حواشی وحوالہ جات

(1) مبارکپوری، قاضی اطہر، کاروانِ حیات، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء، ص:146

(2) مبارکپوری، قاضی اطہر، معارف القرآن، کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، بھڑوچ، 2006ء، ص:21

(3) مبارکپوری، قاضی اطہر، قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے، (مرتب: ضیاء الحق خیرآبادی)، قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ، 2005ء، ص:205،204

(4) اعظمی، حبیب الرحمٰن، ''رجال السند والہند پر ایک نظر''، مشمولہ: مقالات ابوالمآثر، (مرتب: مسعود احمد اعظمی)، دار الثقافۃ الاسلامیۃ، مئو، 2014ء، ج3، ص:243

(5) مبارکپوری، قاضی اطہر، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (مقدمہ)، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1982ء، ص:559

(6) مبارکپوری، قاضی اطہر، مآثر ومعارف، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1971ء، ص:222

(7) مبارکپوری، قاضی اطہر، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، فیمس بکس، لاہور، 1989ء، ص:64

(8) مبارکپوری، قاضی اطہر، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1972ء، ص:30

(9) تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ''، صفحات 74 تا 80۔

(10) ایضاً، ص:118-112

(11) تفصیلات کے لئے مصنف کی کتاب ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' کا صفحہ 110 ملاحظہ کیجئے۔

(12) خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:34

(13) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ص:97

(14) خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:74

(15) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ص:118

(16) قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے، ص:170،169

(17) ایضاً، ص:205،204

(18) تفصیلات کے لئے مصنف کی کتاب ''مآثر ومعارف'' میں شامل متعلقہ مضامین کا مطالعہ کیجئے۔

(19) مبارکپوری، قاضی اطہر، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، 1987، ص:34،33

(20) ان نومنکر روایتوں کے عنوانات یہ ہیں:

(1) حضرت آدم کے ہندوستان میں اترنے کی روایت (2) تاڑی کے متعلق اہلِ ہند سے ہوشیار رہنے کی روایت (3) عرب و ہند کے درمیان آمد و رفت کی روایت (4) رفاعہ بنت عبد صالح جنّیہ کی روایت (5) پانچ صحابہؓ کے سندھ آنے کی روایت (6) قنوج کے راجہ سرباتک ہندی کی روایت (7) بابا رتن ہندی کی روایت (8) حضرت تمیم داری کی روایت اور (9) راجا ملیبار سامری کی روایت۔

(21) خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:47، 48

(22) ایضاً، ص:39، 40

(23) ایضاً، ص:40

(24) ایضاً

(25) مبارکپوری، قاضی اطہر، خلافتِ امویہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1975ء، ص:29، 30

(26) خلافت راشدہ اور ہندوستان، ص:280

(27) مبارکپوری، قاضی اطہر، عرب و ہند عہدِ رسالت میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء، ص:152، 153

(28) خلافتِ امویہ اور ہندوستان، ص:661، 662

(29) ایضاً، ص:665-663

(30) ایضاً، ص:665، 666

(31) ایضاً، ص:666 اور 668

(32) ایضاً، ص:669، 670

(33) ایضاً، ص:662

(34) خلافت عباسیہ اور ہندوستان، ص:556

(35) ایضاً، ص:556، 557

(36) خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:361

(37) خلافت عباسیہ اور ہندوستان، ص:558

(38) ایضاً، ص:558

(39) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، مارچ 1959ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص:189

(40) معروفی، عبداللہ، ''سندھ و ہند کی علمی تاریخ رجال السند والہند''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام ''قاضی اطہر نمبر''، اگست تا ستمبر 2003ء، (مدیر: ضیاء الحق خیرآبادی)، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ، ص:352

(41) ایضاً

(42) معصومی، ابومحفوظ الکریم، ''سندو ہند کا ایک علمی وثقافتی تذکرہ: رجال السند والہند الی القرن السابع''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، جولائی 1959ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص:21

(43) ایضاً، ص:23

(44) ایضاً، ص:25

(45) تفصیلات کے لئے کتاب ''رجال السند والہند'' مطبع دارالانصار، قاہرہ، ص:204-208 ملاحظہ کیجئے۔

(46) مبارکپوری، قاضی اطہر، رجال السند والہند الی القرن السابع، المکتبۃ الحجازیہ، ممبئی، 1958ء، ص:15

(47) معصومی، ابومحفوظ الکریم، ''سندو ہند کا ایک علمی وثقافتی تذکرہ: رجال السند والہند الی القرن السابع''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، اگست 1959ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص:88

(48) مبارکپوری، قاضی اطہر، رجال السند والہند الی القرن السابع، دارالانصار قاہرہ، مصر، 1978ء، طبع دوم، ص:14

(49) اعظمی، حبیب الرحمٰن، ''رجال السند والہند پر ایک نظر''، مشمولہ: مقالات ابوالمآثر ص:244، 245

(50) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، ستمبر 1960ء، (مدیر سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص:189

(51) اعظمی، حبیب الرحمٰن، تبصرہ بر شہید کربلا و یزید، دارالثقافۃ الاسلامیۃ، مئو، 2015، ص:113

(52) ایضاً، ص:116

(53) ایضاً، ص:127

(54) اعظمی، حبیب الرحمٰن، ''ہندوستان میں علمِ حدیث اور قاضی اطہر''، مشمولہ: مقالات ابوالمآثر ص:232

(55) ایضاً، ص:236

(56) دریابادی، عبدالماجد، ''نئی کتابیں''، مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید، لکھنؤ، یوم جمعہ 5 ذی الحجہ 1378ھ / مطابق 12 جون 1959ء، ص:7

(57) ندوی، شاہ معین الدین، ''شذرات''، مشمولہ: ماہنامہ معارف، جولائی 1958ء، (مدیر: شاہ معین الدین ندوی)، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص:4

(58) ادروی، اسیر، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء، (مدیر: اسیر ادروی)، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس، ص:125

(59) ایضاً، ص:126، 127

(60) اعظمی، حبیب الرحمٰن، ''رجال السند والہند پر ایک نظر''، مشمولہ: مقالات ابوالمآثر ص:243

(61) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، مارچ 1959ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص: 189

(62) ادروی، اسیر، '' آئینہ درآئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 123

(63) ایضاً، ص: 124

(64) ایضاً، ص: 125

(65) ایضاً

(66) ایضاً

(67) ایضاً

(68) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، اگست 1969ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص: 140

(69) اصلاحی، ضیاءالدین، ''مطبوعاتِ جدیدہ''، مشمولہ: ماہنامہ معارف، دسمبر 1969ء، (مدیر: شاہ معین الدین ندوی)، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص: 477، 478

(70) ایضاً، ص: 478

(71) دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب''، مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 29 محرم الحرام 1389ھ / مطابق 18 اپریل 1969ء، ص: 5

(72) ادروی، اسیر، '' آئینہ درآئینہ''، مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 142

(73) ایضاً، ص: 143

(74) ایضاً، ص: 161-165

(75) دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب''، مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 3 جمادی الاول 1392ھ / 16 جون 1972ء، ص: 3

(76) اصلاحی، ضیاءالدین، ''مطبوعاتِ جدیدہ''، مشمولہ: ماہنامہ معارف، جولائی 1974ء، (مدیر: ضیاءالدین اصلاحی)، شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص: 77

(77) ادروی، اسیر، '' آئینہ درآئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 155

(78) ایضاً، ص: 147

(79) ایضاً، ص: 156، 157

(80) دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب ورسائل'' مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 4 رجب المرجب 1394ھ / مطابق 26 جولائی 1974ء، ص: 2

(81) دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب''، مشمولہ: ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 11 صفر المظفر 1380ھ / مطابق 5 اگست 1960ء، ص: 6

(82) ماہر القادری، ''ہماری نظر میں''، مشمولہ: ماہنامہ فاران، ستمبر 1960ء، (مدیر: ماہر القادری)، کراچی، ص: 54

(83) اکبرآبادی، سعید احمد، ''تبصرے''، مشمولہ: ماہنامہ برہان، ستمبر 1960ء، (مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)، ندوۃ المصنفین، دہلی، ص: 189

(84) ادروی، اسیر، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 129

(85) دریابادی، عبدالماجد، ''رسید کتب'' مشمولہ: ، ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ، یوم جمعہ 5 ربیع الثانی 1376ھ / مطابق 9 نومبر 1956ء، ص: 5

(86) ادروی، اسیر، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 121، 122

(87) ایضاً، ص: 145

(88) اصلاحی، ضیاء الدین، ''مطبوعات جدیدہ''، مشمولہ: ماہنامہ معارف، جون 1971ء، (مدیر: ضیاء الدین اصلاحی)، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص: 479

(89) ادروی، اسیر، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 155، 156

(90) ایضاً، ص: 156

(91) کاروانِ حیات، ص: 139

(92) مبارکپوری، قاضی اطہر، آثر و معارف، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1971ء، ص: 14

(93) ادروی، اسیر، ''سخنہائے گفتنی''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 6

(94) صدیقی، ظفر احمد، ''قاضی صاحب بحیثیت مورّخ و مصنف''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام، ''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 68، 69

(95) ادروی، اسیر، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام ''مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر''، ص: 148

(96) ایضاً، ص: 148، 149

(97) ایضاً، ص: 150

(98) ایضاً

(99) یہ تحریر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اصل خط سے منقول ہے۔

(100) مبارکپوری، قاضی اطہر، ''استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی سے میرا تعلق''، مشمولہ: ماہنامہ ندائے شاہی ''تاریخ شاہی نمبر''، اکتوبر تا دسمبر 1992ء، (مدیر: محمد سلمان منصور پوری)، مرادآباد، ص:453-451

(101) اعظمی، اعجاز احمد، '' قاضی اطہر صاحب معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینہ میں''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام'' قاضی اطہر نمبر، ص:383،384

(102) ایضاً، ص:380،381

(103) یہ تحریر جنرل محمد ضیاء الحق کے اصل خط سے نقل کی گئی ہے۔

(104) اعظمی، اعجاز احمد، '' قاضی اطہر صاحب معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینہ میں''، مشمولہ: ماہنامہ ضیاء الاسلام'' قاضی اطہر نمبر، ص:389-391

خاتمہ

علوم وفنون کے ارتقاء کے حوالہ سے سرزمین ہند ہمیشہ سے ہی مردم خیز رہی ہے۔سابقہ ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں یہاں بڑے بڑے علماء ودانشور پروان چڑھےاوردنیانے ان کےفضل وکمال کوتسلیم کیا۔

مسلمانوں کے دورِحکومت میں ملتان،لاہور،دہلی،جونپورعلومِ اسلامی کےاہم مراکز تھےاور ہرعلم وفن کے ماہرین دوردراز علاقوں سے یہاں آکرجمع ہوتے تھے۔اس پورے دور میں یہاں سیکڑوں ایسے علماء ومفکرین کی نشو نما ہوئی جنھوں نے اسلامی علوم کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا،اس حوالے سے امام رضی الدین حسن صغانی (م 1252ء)،شیخ احمد سرہندی (م 1624ء)،شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م 1642ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1762ء) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م1445ء)ملامحمود جونپوری (م 1505ء) شیخ علی ہجویری(م 1072ء)،خواجہ معین الدین چشتی (م1236ء)،بہاءالدین زکریا ملتانی (م1262ء)حضرت نظام الدین اولیاء (م1325ء) قاضی منہاج الدین (م1260ء)ضیاء الدین برنی(م1357ء)ملا عبد القادر بدایونی (م1615ء)اورامیرخسرو(1325ء) جیسے نابغائے روزگار علماء،صوفیاء،مؤرخین وادباء کے نام ذکرکیے جاسکتے ہیں کہ جنھوں نے اپنے خاص میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

انیسویں صدی کی ابتدامیں مسلمانوں کےسیاسی زوال کے بعد بھی برصغیر کےاطراف وجوانب میں علماء کی نشو ونما کا تسلسل برقراررہا۔اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمان سیاسی محاذ پرگرچہ مغلوب نظر آتے ہیں،مگر دینی وعلمی میدان میں ان کا سورج اس وقت بھی بلند ہی رہا،حالانکہ مخالف طاقتوں نے پروپیگنڈےاورحیلوں کے ذریعہ انہیں زیرکرنے کی ناکام کوششیں کیں۔اس دور میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی،سید احمد شہید،شاہ اسمٰعیل شہید،مولانا فضل حق خیرآبادی،مولانا نذیرحسین محدث دہلوی،مولانا محمد قاسم نانوتوی،سرسید احمد خاں،مولانا محمد علی مونگیری،مولانا محمود حسن اورمولاناعبدالحی حسنی جیسے علماء ومفکرین نے اپنی محنت وجستجو سے برصغیر کےالگ الگ خطوں میں ملی واصلاحی تنظیمیں اور تعلیمی ادارے قائم کیے،جن سے ملک میں اسلامی تہذیب وثقافت اورمذہبی شناخت قائم رکھنے میں کامیابی ملی۔

ان عظیم المرتبت علماء کی فہرست میں ایک اہم نام شبلی نعمانی کا ہے،جنھوں نے نہ صرف یہ کہ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ میں تدریسی فرائض انجام دیے بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تعلیمی خاکہ بھی مرتب کیا، ساتھ ہی اسلامی تاریخ میں سیرت نگاری کے موضوع پر الفاروق، المامون، النعمان اور سیرت النبی جیسی مدلل ومستند کتابیں لکھیں، مزید برآں قابل اور صلاحیت مند تلامذہ کی ایک ایسی جماعت تشکیل دی جس نے ان کے قائم کردہ ادارے دارالمصنفین کے پلیٹ فارم سے اسلام اور علوم اسلامی کے مختلف موضوعات پر بیش قیمت لٹریچر تیار کر کے اس فن کی نشر واشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

شبلی کا تعلق اس ملک کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ سے تھا، جہاں سابقہ زمانہ میں بہت سے علماء کا ظہور ہوا۔ دورِ جدید میں بھی یہاں پایہ کے علماء پیدا ہوئے اور قرآن، حدیث، فقہ وتاریخ کے موضوعات پر گرانقدر کتابیں تحریر کیں، چنانچہ مولانا حمید الدین فراہی، مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا محمد مصطفیٰ اعظمی وغیرہ اعظم گڑھ کے مختلف قریات وقصبات کی وہ اہم علمی ہستیاں ہیں، جنہوں نے علومِ اسلامی کے مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور علمی دنیا نے ان کا اعتراف کر کے ان سے استفادہ کیا ہے۔ اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے علمائے کبار کی اس صف میں شامل ایک نام قاضی اطہر مبارکپوری (1916ء-1996ء) کا بھی ہے جن کا تعلق اسی ضلع کے قصبہ مبارک پور سے ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری علم وتحقیق اور صحافت کی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ انہوں نے جنوری 1947ء میں روزنامہ ''زمزم'' لاہور سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا، بعد ازاں ہفت روزہ ''انصار'' بہرائچ اور روزنامہ ''جمہوریت''، ممبئی سے وقتی طور پر وابستہ رہے، جبکہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی میں طویل عرصہ تک مفوضہ خدمات انجام دیں، مزید برآں انہوں نے تاریخ وتذکرہ کے میدان میں متفرق موضوعات پر سیکڑوں علمی وتحقیقی مقالات اور اٹھائیس کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی حیات وخدمات کے مختلف پہلوؤں سے جو اہم معلومات اور نتائج نکل کر سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

حاصل مطالعہ (Findings)

قاضی اطہر مبارکپوری کی تمام حیثیتوں میں سب سے نمایاں حیثیت اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کے مؤرخ کی ہے۔ ابتدائی عہد سے مراد آغاز اسلام سے لے کر بنوعباس کے خاتمہ تک کا دور۔ اسلامی ہند کے اس دور کی تاریخ پر صدیوں سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا، کیونکہ قدیم مؤرخین میں سے اکثر نے برصغیر اور یہاں ہونے والی ابتدائی فتوحات اور ثقافتی روابط کو قابل اعتنا تصور نہیں کیا، البتہ بعض نے اس طرف توجہ دے کر بہت ہی انحصار کے

ساتھ یہاں کے واقعات ضمناً اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ۔ جہاں تک ہندی مؤرخین کا تعلق ہے تو ان کی تمام تر تحریریں عہدِ غزنوی یا زمانہ مابعد سے شروع ہوتی ہیں ۔ دورِ جدید کے بعض مؤرخین و مصنفین ، جن میں مولوی عبد الحلیم شرر ، سید سلیمان ندوی اور ابوظفر دسنوی شامل ہیں ، نے اس طرف خاص نذرِ عنایت کی اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں ، بعد ازاں قاضی اطہر مبارکپوری نے دونوں ملکوں کے باہمی روابط و تعلقات پر مشتمل چار سو سالہ تاریخ **رجال السند و الهند** ، **العقد الثمین** ، **الهند فی عهد العباسیین** ، عرب و ہند عہدِ رسالت میں ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان ، خلافتِ بنو امیہ اور ہندوستان اور خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان کی صورت میں جدید معیار و مذاق کے مطابق مرتب کی ۔ ان کتابوں میں انہوں نے جنگی مہمات و فتوحات کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ملکی و تمدنی احوال و کوائف کی جزئیات بھی بیان کی ہیں ، نیز علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور پانچ سو سے زائد اشخاص کا تعارف پیش کیا ہے ، متعلقہ موضوع پر ان کی یہ کتابیں دورِ حاضر میں سند کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے ان میں جس عہد اور جس طرز کی تاریخ نگاری کا بیڑہ اٹھایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ، اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور اب تک ان کے انجام دیے ہوئے کاموں کے کسی پہلو پر کوئی اضافہ تو درکنار ، پچھلی نصف صدی میں کسی نے ان سے ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے ، اس کی اصل وجہ وہ مراجع و مصادر ہیں جن کی ورق گردانی کے بعد مصنف نے چھوٹی سے چھوٹی معلومات ان کتابوں میں قرینہ سے جمع کی ہے ۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے فقط عرب و ہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ تاریخ و سیر اور تذکرہ نگاری کے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور تذکرہ علمائے مبارک پور ، دیار پورب میں علم اور علماء ، تدوین سیر و مغازی ، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت ، طبقات الحجاج ، خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات ، ائمہ اربعہؒ ، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء جیسی علمی و تحقیقی کتابیں لکھیں ۔

دورانِ تحقیق اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ فن تاریخ اور سیر و تذکرہ کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری علمِ حدیث سے بھی خاص شغف رکھتے تھے اور رجال و رواۃِ حدیث نیز اصول حدیث پر ان کی گہری نگاہ تھی ۔ حدیث یا علمِ حدیث کے موضوع پر انہوں نے کوئی مستقل کتاب تحریر نہیں کی اور نہ ہی حدیث کی کسی کتاب کی شرح لکھی ، البتہ ابوحفص عمر بن احمد کی ''**تاریخ اسماء الثقات**'' اور ابوالفضل محمد بن محمد فارسی کی ''**جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول**ؐ '' پر حواشی و تعلیقات کا اضافہ کر کے انہیں ضرور شائع کیا ، اس سے قبل یہ دونوں کتابیں مخطوطات

کی شکل میں نایاب تھیں، ان کے علاوہ علمِ حدیث کی تاریخ وتدوین اور فنونِ حدیث کے موضوع پر انہوں نے تین تعارفی وتحقیقی مقالات لکھے جو کہ ان کی کتاب ''مآثر ومعارف'' میں شامل ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انہیں محمد ﷺ اور اہل بیت سے خاص انسیت ومحبت تھی اور اس سلسلہ میں ان کے مقام ومرتبہ پر کوئی کچھ کہے یا لکھے یہ ان کو بالکل گوارہ نہیں تھا، چنانچہ 1959ء میں جب محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافتِ معاویہؓ ویزید'' منظرِ عام آئی تو اس پر تنقید کرنے والوں میں وہ پیش پیش رہے اور سابقہ کتاب کی تردید میں تفصیل سے لکھا، جس پر برصغیر میں ان کی خوب مدح سرائی ہوئی۔ اسی طرح ان کے دو مضامین بعنوان ''تصاویرِ رسولؐ کی بحث'' اور ''تصاویرِ رسولؐ کی بحث پر علمائے ازہر کا جواب اور ہمارا جواب الجواب'' دیکھے جاسکتے ہیں، جو ماہنامہ ''البلاغ'' ممبئی میں ستمبر 1962ء اور مارچ 1964ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ دونوں مضامین سیرت کے موضوع پر ایک مصری فاضل محمد احمد برانق کے ان کتابچوں کی تردید میں لکھے تھے جو بچوں کے لئے تیار کیے گئے تھے اور ان پر جگہ جگہ نبی اکرمؐ اور اہلِ بیت کی تصاویر بنی ہوئی تھیں، ان تصاویر سے موصوف کے دل کو ٹھیس پہنچیں۔ زندگی کے آخری مرحلہ میں بھی وہ محمدؐ کی سیرت پر ''سیرت النبیؐ خود آپؐ کی زبانی'' کے عنوان سے مواد جمع کر رہے تھے، مگر یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔

دورانِ تحقیق قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں کے مطالعہ سے اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ انہوں نے اپنی زیادہ تر تحریروں میں اسلام کے ابتدائی زمانہ کو موضوعِ بحث بنا کر اس زمانہ کے مسلم معاشرے، علوم وفنون اور رجال کی تاریخ وتذکرے پر کام کیا ہے، اس حوالہ سے عرب وہند کی تاریخ پر مبنی کتابوں کے علاوہ ائمہ اربعہؒ، طبقات الحجاج، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم وتربیت، تدوین سیر ومغازی اور خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات کو بہ طور خاص پیش کیا جاسکتا ہے، ساتھ ہی ابتدائی دور کے محدثین وفقہاء کی حیات وخدمات اور حالات وواقعات پر مبنی مقالات ومضامین کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں اور مقالات ومضامین کے ذریعہ انہوں نے علمی حلقے میں سیکڑوں ائمہ اور رجال حدیث وفقہ کا محققانہ تعارف کرایا ہے، خصوصاً وہ لوگ جن کے تراجم قدیم مؤرخین وتذکرہ نویسوں کی کتابوں تک ہی محدود تھے، انہوں نے ایسے لوگوں کا از سرِ نو تعارف کرا کر صفحۂ قرطاس پر انہیں زندہ کیا، اس حوالہ سے انہوں نے صرف ''**رجال السند والھند**'' میں جن نامعلوم افراد کے تراجم جمع کیے ہیں ان کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں ان کے بیانات قیاس آرائی اور ظن و

تخمین پر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی بات حوالوں کی روشنی میں اور مدلل طور پر کہتے ہیں، ساتھ ہی روایات کے جمع واستیعاب کی بھی کوشش کرتے ہیں، اگر کوئی روایت انہیں منکر یا کمزور نظر آتی ہے تو متن میں اس کے ضعف ونکارت کی تصریح بھی کر دیتے ہیں، نیز روایات میں اختلاف وتعارض کی نشاندہی کے دوران اس کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔ یوں تو یہ خوبیاں ان کی تمام کتابوں میں پائی جاتی ہے، لیکن اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان اور **العقد الثمین** میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

اسی طرح وہ اپنی تحریروں میں قدیم عرب مؤرخین ومصنفین کی کتابوں سے روایات جوں کی توں نقل نہیں کرتے، بلکہ پہلے اس کے لفظی ومعنوی پہلو کی تہہ میں جاتے ہیں، اگر کسی عبارت میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو جرح وتعدیل کا طریقہ اختیار کر کے عقلی ونقلی دلائل سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقد وجرح کا یہ طریقہ انہوں نے اسلامی ہند کی عظمت رفتہ اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں میں جا بجا اختیار کیا ہے۔ قدیم عرب مؤرخین ومصنفین ہی کی طرح اپنی بعض تحریروں میں انہوں نے مستشرقین پر اعتراضات بھی کیے ہیں اور ان کی تحقیقات کو بے بنیاد بتایا ہے، لیکن کہیں بھی کسی ایک مستشرق کی نام کے ساتھ وضاحت نہیں کی اور نہ ہی کسی ایسے موضوع کی تصریح کی ہے جسے کسی مستشرق نے زیرِ بحث لا کر اس کی غلط تاویل کی ہو، حالانکہ مستشرقین کے تعلق سے ان کے دو مستقل مقالات یعنی ''استشراق اور مستشرقین'' اور ''ہنگری کے مستشرقین اور ان کے علمی کارنامے'' ان کتاب مآثر ومعارف میں شامل ہیں۔

اسی طرح ان کی تحریروں کے حوالہ سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ کسی خاص نظریے کے اثبات یا اس کی نفی کے لئے نہ مطالعہ کرتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ پیش بندی کے بغیر کھلے ذہن اور کھلی طبیعت کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر حاصل مطالعہ کو پیش کر دیتے ہیں، اس لئے نہ تو خود کسی مغالطہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ قاری کو اپنے مخصوص نظریات کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف اس قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ان کے حوالوں پر پوری طرح اعتماد اور نتائج سے بالکل اتفاق کر سکتے ہیں اور بلاشبہ یہ ان کا بڑا اکتساب ہے جس کی عصرِ حاضر میں بڑی اہمیت ومعنویت ہے اور اسلامی تاریخ کے جن پہلوؤں پر انہوں نے کام کیا ہے وہ بعد والوں کے لئے بنیادی مصادر ومراجع کا درجہ رکھتے ہیں۔

دورانِ مطالعہ اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے پوری محنت اور بھر پور اجتہادی صلاحیت کے ساتھ کتابوں کی تدوین وتالیف کی، لیکن پھر بھی دورانِ تحقیق ان سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں جن کا انہوں نے اعتراف کیا اور دوسرے مقامات پر بطور استدراکات ان کی تصحیح کی، اس کی وضاحت چوتھے باب میں

متعلقہ مقام پر کردی گئی ہے۔ اسی طرح ان کی بعض تحریروں میں موجود خامیوں کی طرف ان کے معاصر محققین نے نشاندہی کر کے انہیں متوجہ کیا، اس حوالہ سے جن معاصر اہلِ علم نے ان تحریروں پر تنقید کی ہیں، ان میں مولانا ابومحفوظ الکریم، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے ان کی دو کتابوں یعنی ''**رجال السند والهند**''، ''علیؓ وحسینؓ'' اور ایک مقالہ ''ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت'' پر نقد کیا ہے، پھر ان میں سے بھی اولین دو لوگوں نے صرف رجال السند والہند پر تنقید کی ہے، جبکہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے تینوں تحریروں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ان ناقدین کی معقول تنقید و استدراکات کا اعتراف کیا اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کی۔

مطالعے کے ماحصل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ معیار کے اعتبار سے قاضی اطہر مبارکپوری اپنی تمام تحریروں کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول وہ تحریریں جن میں وہ زیرِ بحث موضوع کو بغیر کسی دلیل کے سرسری طور پر بیان کر دیتے ہیں، اس سے بات تو واضح ہوتی ہے مگر اس کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں رہتی، اس قسم کے مضامین روزنامہ ''انقلاب'' کے مخصوص کالموں میں اور ماہنامہ ''البلاغ'' کے اداریہ میں وہ لکھتے تھے۔ اور دوسری تحریریں وہ ہیں جن میں وہ اپنی بات انتہائی ٹھوس دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ، ماہنامہ ''برہان'' دہلی، ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند اور ماہنامہ ''البلاغ'' ممبئی میں شائع ہونے والے ان کے مستقل مقالات و مضامین اور ان پر مشتمل کتابیں اسی نوعیت کی تحریریں ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری کے مضامین و مقالات اور تحریروں کو دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی سے بڑے متاثر تھے، ان کی ولادت گرچہ شبلی کی وفات کے دو سال بعد ہوئی، مگر علامہ شبلی اور دارالمصنفین کی کتابوں سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اس بات کی تصریح انہوں نے خودنوشت سوانح ''کاروان حیات'' میں کی ہے۔ سیرت اور تذکرہ و سوانح نگاری علامہ شبلی کا خاص میدان تھا اور ان موضوعات پر انہوں نے المامون، النعمان، الفاروقؓ اور سیرت النبیؐ جیسی مدلل و مستند کتابیں تحریر کی تھیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ان کی پیروی میں اسی موضوع پر قلم اٹھایا اور **رجال السند والهند**، طبقات الحجاج، ائمہ اربعہ، تذکرہ علمائے مبارکپور اور دیارِ پورب میں علم اور علماء جیسی کتابیں لکھیں، مزید برآں متعدد مضامین میں علماء کے واقعات و حالات اور خدمات بیان کی ہیں، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ زندگی کے آخری مرحلے میں وہ ''النعمان'' کے طرز پر امام احمد ابن حنبلؒ اور امام لیث بن سعدؒ پر مواد جمع کر رہے تھے، بلکہ کچھ حد تک کام ہو بھی چکا تھا، مگر اس کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے

قبل ہی ان کی وفات ہوگئی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ وہ جدید اور انوکھے عناوین کو موضوعِ تحریر بناتے تھے، ان کے یہاں قدامت پسندی نہیں تھی یعنی جو موضوعات رائجِ زمانہ تھے ان سے صرف نظر کر کے وہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے تھے جن پر نہ کے برابر کام ہوا ہو، اس سلسلہ میں طبقات الحجاج، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء، تدوین سیر و مغازی، خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات اور خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت ان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ جن موضوعات پر بھی انہوں نے کام کیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر یا تو بالکل کام نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو بہت اختصار کے ساتھ ہوا ہے، لہٰذا جن جدید اور انوکھے موضوعات پر انہوں نے قلم اٹھایا، تفصیل سے ان کی جزئیات سے بحث کی۔

ان کی حیات و علمی خدمات کے مطالعہ سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے وہ ایک فکر مند انسان تھے اور مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے متمنی تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز تعلیم سے کیا اور اسی پر ان کا اختتام ہوا۔ ساری زندگی وہ علم کی طلب میں مصروف رہے، ساتھ ہی اس کی نشر و اشاعت کا کام بھی انہوں نے انجام دیا۔ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ مسلمانوں کی نئی نسل تعلیمی میدان میں آگے بڑھے، اس کے لیے انہوں نے کچھ عملی اقدام بھی کیے، جن کے نتیجہ میں مسلم بچوں کے لئے دو مدارس (ایک بھیونڈی میں مدرسہ مفتاح العلوم اور دوسرا مبارک پور میں مدرسہ حجازیہ) اور بچیوں کے لئے ایک اسکول (انصار گرلس کالج، مبارک پور) کا قیام عمل میں آیا۔ تحریری میدان میں بھی انہوں نے دینی، اصلاحی اور فکری موضوعات پر قلم اٹھایا اور اسلامی نظام زندگی، تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور پیشہ میں علم اور علماء، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک اور خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات وغیرہ کتابیں تحریر کیں، تا کہ ان کے مطالعہ سے مسلمانوں میں حصول تعلیم کا جذبہ پیدا ہو اور وہ ترقی کی راہ پر وہ گامزن ہو سکیں۔ اسی طرح روزنامہ انقلاب میں ''جواہر القرآن'' اور ''احوال و معارف'' کے کالموں میں اس نوعیت کے جو مضامین وہ لکھتے تھے ان سے بھی ان کے فکری نظریہ کا پتہ چلتا ہے۔

الغرض قاضی اطہر مبارکپوری نے تاریخ و طبقات اور سیر و تراجم کے مختلف پہلوؤں پر جو تصانیف و مقالات لکھے ہیں وہ علومِ اسلامی کے کتب خانوں میں بیش بہا اضافہ ہیں، جن میں انہوں نے ابتدائی عہد کی کتابوں سے مواد تلاش کر کے جمع کیا ہے اور معاصرین کو ان سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تجاویز (Suggestion)

زیرِنظر موضوع پر دورانِ تحقیق جو تجاویز آئیں اور مستقبل میں ان پر تحقیق کی گنجائش محسوس ہوئی، وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کے تاریخی مآخذ پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

2۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی تاریخ نگاری کا سابقہ مصادر کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

3۔ اسی طرح اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کے تاریخی وثقافتی حالات پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔

4۔ ہندوستان کے مختلف خطوں میں متعدد قریات وقصبات تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، اس حوالہ سے ان کی علمی وتاریخی خدمات پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

5۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے سیرت اور تذکرہ وسوانح کے جن موضوعات پر کام کیا ہے ان کو آگے بڑھانے کی گنجائش ہے۔

6۔ عرب اور ہندوستان کے باشندگان اموی وعباسی عہد میں ایک دوسرے کو کس نظریے سے دیکھتے تھے اس پر بھی کام کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

اردو کتب

(1) ابن الحسن عباسی، یادگار زمانہ شخصیات کا احوال ومطالعہ، مکتبۃ النور، دیو بند، 2020ء

(2) اقبال احمد خاں سہیل، کلیات سہیل، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2011ء

(3) اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حیات اور علمی کارنامے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1973ء

(4) اقتدار محمد خان، 1947ء کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1995ء

(5) ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1999ء

(6) ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، 2008ء

(7) // // ، سیرت سید احمد شہید، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، 2017ء

(8) // // ، مولانا محمد الیاسؒ اوران کی دینی دعوت، رحمانیہ بک ڈپو، نئی دہلی، 2012ء

(9) // // ، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، 2013ء

(10) // // ، ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، 2016ء

(11) ابوظفر دسنوی، تاریخ سندھ، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2018ء

(12) احسان دانش، جہان دانش، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(13) // // ، جہانِ دگر، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(14) اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2004ء

(15) بپن چندرا، جدید ہندوستان، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1971ء

(16) ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، 2014ء

(17) جوزف ہورووتس، سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اوران کے مؤلفین، مترجم: نثار احمد فاروقی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 1998ء

(18) حبیب اللہ، اعظم گڑھ کا علمی ادبی اور تاریخی پس منظر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2004ء،

(19) حبیب الرحمٰن اعظمی، اعیان الحجاج، تنویر پریس، لکھنؤ، 1958ء

(20) // // ، تبصرہ بر شہید کربلا ویزید، دار الثقافۃ الاسلامیۃ، مئو، 2015ء

(21) // // ، مقالات ابوالمآثر، دار الثقافۃ الاسلامیۃ، مئو، 2014ء

(22) حبیب الرحمٰن جگدیش پوری، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، مرکز دعوت وتحقیق، دیوبند، سن اشاعت غیر مذکور

(23) حسین احمد مدنی، نقش حیات، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، 2007ء

(24) خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن اشاعت غیر مذکور

(25) رضی احمد کمال، جمعیۃ علماء ہند، شعبۂ نشر واشاعت، جمعیۃ علماء ہند، نئی دہلی، 2004ء

(26) سعید احمد اکبرآبادی، مسلمانوں کا عروج وزوال، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1947ء

(27) سرسید احمد خاں، اسباب بغاوتِ ہند، مرتب: ڈاکٹر فوق کریمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی، 2018ء

(00) سید اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند جونپور، شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جونپور، 1963ء

(28) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2015ء

(29) // // عرب وہند کے تعلقات، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2017ء

(00) // // عربوں کی جہاز رانی، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2014ء

(30) سید عابد علی وجدی، ہندوستان اسلام کے سایہ میں، پرویز بک ہاؤس، نئی دہلی، 2008ء

(31) شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2019ء

(32) شیخ محمد اکرام، موج کوثر، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2016ء

(33) شمیم طارق، انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2015ء

(34) ضیاء الحق خیرآبادی، تذکرہ سید الملت، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2019ء

(35) ضیاء الدین اصلاحی، ہندوستان عربوں کی نظر میں، شبلی اکیڈمی دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2009ء

(36) طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مکتبہ الحق، ممبئی، 2001ء

(37) ظفر احمد نظامی، تاریخ ہند عہد جدید، قاضی پبلیشر زاینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، 2015ء

(38) عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ، دلگداز پریس، لکھنؤ، 1907ء

(39) عبدالحمید خان عباسی، اصولِ تحقیق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام، 2012ء

(40) عبدالغفار مدھولی، جامعہ کی کہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2004ء

(41) عبدالقدوس وعبداللہ صابر، رہنمائے تحقیق، الہدیٰ پبلیکیشنز، دہلی، 2016ء

(42) عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، شباب ایجوکیشنل بک ہاؤس، لکھنؤ، 2017ء

(43) عبدالمنعم النمر، آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، مترجم: محمد علاء الدین ندوی، مجلس گیارہ ستارہ انڈیا، کھگڑیا، بہار، 2012ء

(44) عزیز الحسن صدیقی، سرمایہ ملت کے نگہباں، مکتبہ حسن، غازی پور، 2019ء

(00) غلام قادرلون، قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، 2014ء

(45) فیاض گوالیاری وقمرالزماں مبارکپوری، صدر رنگ، جعفریہ لائبریری مبارک پور، اعظم گڑھ، 1970ء

(46) قاضی اطہر مبارکپوری، آثار واخبار، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1988ء

(47) 〃 〃 آسودگانِ خاک، حافظ فاؤنڈیشن، غازی پور، 2021ء

(48) قاضی اطہر مبارکپوری، اسلامی شادی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(49) 〃 〃 اسلامی نظام زندگی، ادارہ فیضان معرفت بلساڑ، گجرات، 2004ء

(50) 〃 〃 اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، فینس بکس، لاہور، 1989ء

(51) 〃 〃 افاداتِ حسن بصریؒ، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(52) 〃 〃 ائمہ اربعہ، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، 2017ء

(53) 〃 〃 بناتِ اسلام کی علمی ودینی خدمات، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2007ء

(54) 〃 〃 تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(55) 〃 〃 تدوین سیر ومغازی، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، 1990ء

(56) 〃 〃 تذکرہ علمائے مبارک پور، مکتبۃ الفہیم، مئو، 2010ء

(57) 〃 〃 جواہرالقرآن، قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ، 2022ء

(58) 〃 〃 حج کے بعد، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء

(59) 〃 〃 خلافتِ امویہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1975ء

(60) 〃 〃 خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1972ء

(61) 〃 〃 خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1982ء

(62) 〃 〃 خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، سن اشاعت غیر مذکور

(63) 〃 〃 خیرالقرون کی درسگاہیں اوران کا نظامِ تعلیم وتربیت، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، 2017ء

(64) 〃 〃 دیارِ پورب میں علم اور علماء، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2020ء

(65) 〃 〃 صفاتِ نفس، نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند، 2015ء

(66) 〃 〃 طبقات الحجاج، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2006ء

(67) 〃 〃 عرب وہند عہد رسالت میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2004ء

(68) 〃 〃 علمائے اسلام کی خونیں داستانیں، قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ، 2009ء

(69) 〃 〃 علماءِ اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2004ء

(70) 〃 〃 علیؓ وحسینؓ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 2007ء

(71) 〃 〃 قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے، قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ، 2005ء

(72) // // قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، مکتبہ صوت القرآن، دیوبند، سن اشاعت غیر مذکور
(73) // // کاروان حیات، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2003ء
(74) // // مآثر و معارف، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1971ء
(75) // // محمد کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہؓ و تابعین کے زمانہ میں، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2005ء
(76) // // مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشے میں علم اور علماء، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم، دیوبند، 2011
(77) // // مسلمان، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2006ء
(78) // // معارف القرآن، کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، بھڑوچ، 2006ء
(79) // // مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ، مرتب: محمد صادق مبارکپوری، مکتبۃ الفہیم، مئو، 2006ء
(80) // // مئے طہور، قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ، 2006ء
(81) // // ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، 1987ء
(82) // // ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت، مکتبۃ الفہیم، مئو، 2006ء
(83) قمر الزماں مبارکپوری، سخن وران اعظم گڑھ، جعفر لائبریری مبارک پور، اعظم گڑھ، 2015ء
(84) قاضی ظفر مسعود، مورخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا سوانحی خاکہ اور علمی کارنامے، دائرہ ملیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، 1996ء
(85) گیان چند، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی، 2008ء
(86) محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مکتبہ دارالعلوم، دیوبند، مارچ 2015ء
(87) مالک رام، نذر حمید، مجلس نذر حمید، نئی دہلی، 1981ء
(88) محمد اسامہ، برصغیر ہندو پاک میں فکر اسلامی کے شارح مولانا صدرالدین اصلاحی - ایک مطالعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 2018ء
(89) محمد اسحاق جلیس، تاریخ ندوۃ العلماء، مجلس صحافت و نشریات، لکھنؤ، 2017ء
(90) محمد الیاس برنی، قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، مکتبہ دارالعلوم، دیوبند، 2018ء
(91) محمد حبیب الرحمٰن شروانی، علمائے سلف و نابینا علماء، مکتبہ الحق، ممبئی، 2005ء
(92) محمد حبیب و خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1984ء
(93) محمد سہیل شفیق، مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری، قرطاس، پاکستان، 2019ء
(94) محمد صادق مبارکپوری، مشاہیر احیاء العلوم، ارکان مجلس منتظمہ مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور، اعظم گڑھ، 2017ء
(95) محمد طیب، شہید کربلاؓ اور یزید، فیصل پبلیکیشنز، دیوبند، 2010ء
(96) محمد یونس نگرامی، ہندوستان میں عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء اور ان کی علمی خدمات، نامی پریس لکھنؤ، 1979ء
(97) محمد میاں، اسیران مالٹا، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، 2002ء

(98) 〃 تحریک ریشمی رومال، مکتبہ جاوید، دیوبند، 2002ء

(99) 〃 ،علمائے ہند کا شاندار ماضی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، 2016ء

(100) محمود احمد عباسی، خلافتِ معاویہؓ و یزید، حارث پبلی کیشنز، کراچی، 2018ء

(101) مہربان علی، جامع الفتاویٰ، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، 2008ء

(102) نظام الدین اسیر ادروی، تحریکِ آزادی اور مسلمان، دار المؤلفین، دیوبند، 2017ء

(103) 〃 〃 ،دار العلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک، دار المؤلفین، دیوبند، 2015ء

(104) نگار افشاں، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری حیات و خدمات، ایوروزا اکاڈمی، علی گڑھ، 2018ء

(105) نور عالم خلیل امینی، پسِ مرگ زندہ، ادارہ علم و ادب، دیوبند، 2010ء

عربی کتب

(1) ابو حفض عمر بن احمد ، تاریخ اسماء الثقات ، شرف الدین الکتبی و اولادہ ، ممبئی ، 1986ء

(2) ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری، الادب المفرد ، دار الصدیق ، بیروت ، 2000ء

(3) ابو الفضل محمد بن محمد الفارسی ، جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول ﷺ ، الدار السلفیہ ، ممبئی ، 1986ء

(4) اورنک زیب الاعظمی ، القاضی ابو المعالی اطہر مبارکفوری ، مرکزی پبلیکیشنز ، نئی دھلی ، نومبر 2020ء

(5) عبد الحی الحسنی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند ، مؤسسۃ ھنداوی للتعلیم و الثقافۃ ، القاھرۃ ،

(6) عبد الحی الحسنی ،نزھۃ الخواطر و بھجۃ المسامع و النواظر ، دار ابن حزم ، بیروت ، 1999ء

(7) قاضی اطھر مبارکفوری، الحکومات العربیۃ فی الھند ،مترجم: عبد العزیز عزت ، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1973ء

(8) قاضی اطھر مبارکفوری ، رجال السند و الھند الی القرن السابع ، المکتبۃ الحجازیہ ، ممبئی ، 1958ء

(9) قاضی اطھر مبارکفوری ، رجال السند و الھند الی القرن السابع ،طبع ثانی, دار الانصار قاھرہ ،مصر ، 1978ء

(10) قاضی اطھر مبارکفوری، العرب و الھند فی عھد الرسالۃ ،مترجم: عبد العزیز عزت ، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1973ء

(11) قاضی اطھر مبارکفوری ، العقد الثمین ، دار الانصار ، قاھرہ ، 1979ء

(12) قاضی اطہر مبارکفوری ، مرآت العلم ، غیر مطبوعہ

(13) قاضی اطہر مبارکفوری، الہند فی عہد العباسیین ، دار الانصار ، قاہرہ 1979ء

(14) قاضی اطہر مبارکفوری ، من القاعدۃ بغدادی الی صحیح البخاری ، مترجم: اورنگ زیب الاعظمی

(15) یوسف ہوروفنتس ، المغازی الاولیٰ و مؤلفوھا ،مترجم : حسین نصار ،مکتبۃ الخانجی ، قاہرہ ، 2001ء

English Books

(1) Amalendu De, Islam In Modern India, Maya Prakashan, Culcutta, 1982

(2) Annemarie Schimmel,Islam In The Indian Subcontinent, Sung-e-Meel Publications, Lahor, 2003

(3) D.L.Drake Brockman,Azamgarh A Gazetteer,Vol XXXIII,Newal Kishore Press,Lucknow,1911

(4) Maulana Abul Kalam Azad, India Wins Freedom (The Complete Version), Orient Longman, Madras, 1988

(5) M.Mujeeb, The Indian Muslim, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 2003

(6) Muhammad Usman Maroofi, Luminus Star: Qazi Athar Mubarakpuri, Qazi Athar Acadmy Mubarakpur, Azamgarh, 2021

(7) Mushirul Hasan ,Islam In South Asia: Encountering The West Before And After 1857,Vol 2, Manohar Publishers, New Delhi ,2008

(8) Tara Chand, History Of The Freedom Movemment In India, Publications Division, Ministry Of Information & Brodcasting, Govt Of India, 1974

رسائل وجرائد

(اردو)

مجلّہ/رسالہ	نوعیت	مقام اشاعت	تاریخ اشاعت
اسلام اور عصر جدید	سہ ماہی	نئی دہلی	جنوری تا مارچ 2021ء
البدر	ماہنامہ	کاکوری	فروری 1983ء
افکار ملی	//	دہلی	اپریل 1994ء
انوار العلوم	//	اعظم گڑھ	جولائی 1996ء
انصار	ہفت روزہ	بہرائچ	
برہان	ماہنامہ	دہلی	
ترجمان الاسلام	سہ ماہی	بنارس	اکتوبر 1996ء تا مارچ 1997ء
تعمیر حیات	پندرہ روزہ	لکھنؤ	10 ستمبر 1996ء
حیاتِ نو	ماہنامہ	بلریا گنج، اعظم گڑھ	اگست، ستمبر 1996ء
دار العلوم	//	دیوبند	
صدق جدید	ہفت روزہ	لکھنؤ	
ضیاء الاسلام	ماہنامہ	شیخوپور، اعظم گڑھ	اگست تا دسمبر 2003ء
فاران	//	کراچی	دسمبر 1960ء
قائد	//	مرادآباد	
معارف	ماہنامہ	اعظم گڑھ	

(عربی)

مجلّہ/رسالہ	نوعیت	مقام اشاعت	تاریخ اشاعت
الازہر	ماہنامہ	قاہرہ	جمادی الاول 1411ھ
الداعی	//	دیوبند	اگست 1996ء
ثقافة الهند	//	نئی دہلی	

ضمیمہ

مختلف رسائل وجرائد میں قاضی اطہر مبارکپوری کے شائع شدہ مقالات ومضامین کی فہرست

نمبر شمار	مقالہ / مضمون	مجلّہ	مقام اشاعت	نوعیت	تاریخ اشاعت
1	مصلح اعظم ﷺ	قائد	مرادآباد	ماہنامہ	ربیع الاول 1358ھ
2	امام دار الہجرۃ مالک بن انسؒ	//	//	//	شعبان ورمضان 1358ھ
3	ہندوستان کی جنگ آزادی کے فیصلہ کن مرحلے	جمہوریت	ممبئی	روزنامہ	6اگست 1950ء
4	1370ھ کی آمد! اسلامی برادری کے لئے یوم احتساب	//	//	//	تاریخ اشاعت غیر مذکور
5	ماہ صیام اور انسانیت کا احترام	البلاغ	//	ہفت روزہ	14 مئی 1954ء
6	کعبہ کے فضائل وخصائل	//	//	//	28 مئی 1954ء
7	مسافران حج وزیارت کی راہ میں: پرانی مشکلات اور نئی سہولتیں	//	//	//	//
8	عید یعنی اسلامی عظمت وایثار کا مظاہرہ	//	//	//	4 جون 1954ء
9	اسلامی زندگی کے چند حسین حقائق	//	//	//	11 جون 1954ء
10	جلال کعبہ اور جمال مدینہ: اسلام کے دو مرکزی مقامات کے ابدی حقائق	//	//	//	18 جون 1954ء
11	شمع حرم کے پروانے	//	//	//	25 جون 1954ء
12	اسلام اور اسلامی علوم: دینی تعلیم کی اہمیت اور علمائے دین کا منصب	//	//	//	9 جولائی 1954ء
13	مدینہ میں معرکۂ سیف وقلم: بیٹے امام ربیعۃ الرائے اور باپ مجاہد فروخ کی داستان	//	//	//	28 جولائی 1954ء
14	ابوعبداللہ محاسبی بصری اور اہل دل کی دو باتیں	//	//	//	16 اگست 1954ء
15	امام ابوحنیفہ کے لال	//	//	//	21 اگست 1954ء
16	اسلام کے بنیادی تعلیم کے مرکز، اصبہان اور بصرہ کے مکاتب	//	//	//	28 اگست 1954ء
17	زندگی یا موت: کیا موت بازار میں بکتی ہے	//	//	//	3 ستمبر 1954ء

18	زندگی اور غم زندگی	〃	〃	〃	10 ستمبر 1954ء
19	حضرت مخدوم علاء الدین علی مہائمی: جنوبی ہند کا ابن العربی اور شاہ ولی اللہ	البلاغ	ممبئی	ہفت روزہ	17 ستمبر 1954ء
20	شام مرگ سے صبح زندگی تک: سونے اور جاگنے کے اسلامی اصول وقوانین	〃	〃	〃	24 ستمبر 1954ء
21	انسانی خدمت اور اسلامی اوقاف	〃	〃	〃	1 اکتوبر 1954ء
22	ایک حاجی، ایک امام اور ایک درزی	〃	〃	〃	15 اکتوبر 1954ء
23	کعبہ کے دوراہی کلیسا میں	〃	〃	〃	22 اکتوبر 1954ء
24	رحمۃ للعالمین کی بستی	〃	〃	〃	〃
25	کعبۃ اللہ کی وحدت و مرکزیت کے ڈاکو قرامطہ	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	جون 1954ء
26	فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ	〃	〃	〃	جولائی 1954ء
27	اللہ کا ایک بندہ اللہ کے گھر میں	〃	〃	〃	〃
28	سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی	〃	〃	〃	اگست 1954ء
29	فقہ اہل سنت کی ترویج واشاعت	〃	〃	〃	ستمبر 1954ء
30	مفلس کون؟	〃	〃	〃	اکتوبر 1954ء
31	اسلام کا ابتدائی نظام تعلیم وتعلم	〃	〃	〃	اکتوبر 1954ء
32	خلیفہ اسلام اور قاصد اسلام: اسلامی جمہوریت کا ایک نظام	〃	〃	〃	اکتوبر 1954ء
33	ملک موید عماد الدین ابو الفداء صاحب (حماۃ اقلیم شام کا بادشاہ اور علم کا شہنشاہ)	〃	〃	〃	نومبر 1954ء
34	مسلمانوں کے ہر طبقہ وہر پیشہ میں علم اور علماء	〃	〃	〃	دسمبر 1954ء تا فروری 1955ء
35	استشراق اور مستشرقین	〃	〃	〃	〃
36	تنقید وتبصرہ: مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	〃	〃	〃	〃
37	علمائے اسلام کے القاب وخطابات	〃	〃	〃	اپریل 1955ء
38	حضرت فقیہ ربیع بن صبیح بصری ہندی گجراتی	〃	〃	〃	مئی 1955ء

39	حضرت امام احمد ابن حنبل شیبانی بغدادی	//	//	//	جون 1955ء
40	اسلام اور چین کے قدیم تعلقات	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	جولائی 1955ء
41	مکتوبات امام احمد	//	//	//	ستمبر، اکتوبر 1955ء
42	اسلامی دنیا کی تحریکات اور ہندوستان کا موقف	//	//	//	ستمبر 1955ء
43	مکہ میں ہندوستان کے علمی خانوادے	//	//	//	ستمبر 1955ء
44	کفر اسلام پر ایک عبرت آموز حکایت	//	//	//	نومبر 1955ء
45	ملک معظم سعود کے تین خطبے	//	//	//	دسمبر 1955ء تا جنوری 1956ء
46	سات لاکھ فرزندگانِ اسلام کو کتاب وسنت کا پیغام	//	//	//	//
47	آج کا جزیرۃ العرب (عمرانی، اقتصادی، معاشی، تمدنی اور ارتقائی حالات)	//	//	//	//
48	شمس العلماء سرخسی اور اصولِ سرخسی	//	//	//	فروری 1956ء
49	جانور اور اسلامی تعلیمات	//	//	//	مارچ 1956ء
50	دار ارقم بن ابی ارقم: مکہ مکرمہ میں اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا مرکز	//	//	//	مارچ، اپریل 1956ء
51	طبقات الحجاج	//	//	//	اپریل 1956ء تا اپریل 1957ء
52	مسلمانوں کے بحری کارنامے (جہاز رانی، جہاز سازی اور بحری انتظامات)	//	//	//	جون 1956ء
53	مسلمانوں کا نظام تذکیر وتبلیغ	//	//	//	جولائی 1956ء
54	امام ابو بکر مراغی کی تحقیق النصرہ	//	//	//	ستمبر 1956ء
55	المنجد کی غلطیاں اور افترا پردازیاں	//	//	//	اکتوبر 1956ء
56	تعلیم وتعلم	//	//	//	نومبر 1956ء
57	جوامع ومساجد: دینی تعلیم کے عمومی مراکز	//	//	//	دسمبر 1956ء
58	اسلامی علوم اور مسلم عوام	//	//	//	جنوری 1957ء
59	بھوپال میں تبلیغی اجتماع	//	//	//	جنوری 1957ء
60	دینی علوم بازاروں اور دکانوں میں	//	//	//	فروری 1957ء

61	مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی تاریخ زراعت	//	//	//	مارچ تا مئی 1957ء
62	ایک تاریخی سورۃ یٰسین کا تعارف	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	مئی 1957ء
63	حج کے بعد (دو مرتبہ)	//	//	//	ستمبر، اکتوبر 1957ء اور مارچ تا مئی 1971ء
64	افاداتِ حسن بصریؒ (دو مرتبہ)	//	//	//	اکتوبر تا دسمبر 1957ء
65	جوامع و مساجد: ثقافتِ اسلامیہ کے مراکز	//	//	//	نومبر 1957ء
66	بناتِ حرم	//	//	//	ستمبر 1957ء تا جنوری 1958ء
67	حرمین شریفین چوتھی صدی میں	//	//	//	فروری 1958ء
68	دورِ صحابہؓ میں تعلیم و تعلم	//	//	//	اپریل تا اگست 1958ء
69	الجزائر میں فرانسیسی شیطنت	//	//	//	ستمبر تا نومبر 1958ء
70	دو بناتِ حرم	//	//	//	دسمبر 1958ء تا فروری 1959ء
71	زیادات الزیادات امام محمدؒ	//	//	//	مارچ تا جون 1959ء
72	خانقاہیں اور مدرسے	//	//	//	دسمبر 1959ء
73	مسجد کی آمدنی اور وقوفہ اشیاء کی منتقلی	//	//	//	اگست 1960ء
74	اموی حکومت و خلافت	//	//	//	ستمبر تا اکتوبر 1960ء
75	حکومت کویت کے چند گرانقدر علمی تحفے	//	//	//	فروری 1961ء
76	اسلام میں آزادی اور جمہوریت کا تصور	//	//	//	مئی 1961ء
77	مکتوباتِ بصری	//	//	//	ستمبر 1961ء
78	ملفوظاتِ بصریؒ	//	//	//	اکتوبر 1961ء
79	نارجیل سے نخیل تک	//	//	//	جولائی تا دسمبر 1962ء
80	اسلام میں قربانی کا تصور	//	//	//	اپریل، مئی 1959ء
81	کوکن کی اسلامی تاریخ کی پہلی صدی	//	//	//	اپریل، مئی 1959ء
82	تصاویرِ رسول کی بحث	//	//	//	ستمبر 1962ء
83	تاریخ قصبہ مبارک پور	//	//	//	جون 1966ء
84	اسلامی علوم کے عوامی مرکز: مسلمانوں کے مکانات	//	//	//	اگست 1966ء
85	ہندوستان کے مدارس سے عرب جانے والے طلبا	//	//	//	مارچ 1963ء

86	مسند حمیدی	//	//	//	مارچ 1963ء
87	غلاف کعبہ	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	اپریل 1963ء
88	فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد	//	//	//	اپریل 1963ء
89	قرون اولی کی علمی سرگرمیاں	//	//	//	جون 1963ء
90	ہندوستانی سفارت خانہ جدہ کے بارے میں حجاج کے بیانات	//	//	//	جولائی 1963ء
91	قصبہ مبارک پور تاریخ کی روشنی میں	//	//	//	اکتوبر 1963ء
92	مقام ابواء جہاں پر ام النبی ﷺ دفن ہیں	//	//	//	فروری 1964ء
93	وہ اہم ترین سوال جسے مسلمانان ہند کو حل کرنا ہے	//	//	//	فروری 1964ء
94	تصاویر رسول کی بحث پر علمائے ازہر قاہرہ کا جواب اور ہمارا جواب الجواب	//	//	//	مارچ 1964ء
95	قرآنی رسم الخط کے خلاف نیا فتنہ	//	//	//	جولائی 1964ء
96	اسپین میں امام ابن حزم کی نوسوسالہ یادگار تقریب	//	//	//	نومبر 1964ء
97	مدینہ منورہ کی ایک عید	//	//	//	اپریل 1965ء
98	دینی تعلیم کے عمومی مرکز: جوامع ومساجد	//	//	//	جولائی تا ستمبر 1965ء
99	دینی تعلیم کے عمومی مرکز: بازار اور دکانیں	//	//	//	اکتوبر، نومبر 1965ء
100	مشائخ گردیز کا تعلق مشرقی اضلاع سے	//	//	//	مارچ تا جولائی 1966ء
101	تاریخ قصبہ مبارک پور	//	//	//	مارچ تا مئی 1966ء
102	تاثرات (مکتوبات حجاز)	//	//	//	مارچ تا مئی 1966ء
103	اسلام اور عیسائیت	//	//	//	نومبر 1966ء
104	خانوادہ حضرت شاہ کرم دیوان لہراوی	//	//	//	نومبر 1966ء
105	امام محمد کی کتاب الآثار	//	//	//	جنوری 1967ء
106	اہل حرمین سے ملاقاتیں	//	//	//	مارچ 1967ء
107	حکومت مصر کا قرآنی تحفہ	//	//	//	مئی 1967ء
108	کتاب الزہد والرقائق	//	//	//	جولائی 1967ء
109	صیہونیت اور یہودیت	//	//	//	ستمبر 1967ء
110	مجاہدین ہند: بنو ابی العاص الثقفی	//	//	//	اکتوبر 1967ء تا جون 1968ء

111	تعارف وتبصرہ	//	//	//	فروری تا نومبر 1968ء
112	سنن سعید بن منصور خراسانی مکی	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	اکتوبر 1968ء
113	خانوادۂ نائبین قضاۃ مبارک پور	//	//	//	جنوری، فروری 1969ء
114	مولانا محمد طاہر معروفی اوران کا عہد	//	//	//	مارچ 1969ء
115	ہندوستان میں اسلام کی آمد	//	//	//	اپریل 1969ء
116	فضائل ماہ شعبان	//	//	//	ستمبر 1969ء
117	ایک علمی مکتوب :من الاستاذ عبد العزیز عزت الیٰ القاضی اطهر	//	//	//	دسمبر 1969ء
118	خانوادۂ علمائے رسول پور	//	//	//	جنوری، فروری 1970ء
119	خانوادۂ علمائے سریاں	//	//	//	مئی 1970ء
120	راجگان چشت کے دو بزرگ	//	//	//	نومبر 1970ء
121	خانوادۂ مشائخ بھیرہ ونہرا ومبارک پور	//	//	//	جون تا ستمبر 1971ء
122	رویت ہلال پر دہلی میں اجتماع	//	//	//	نومبر 1971ء
123	نہر زبیدہ اور نہر فاطمہ	//	//	//	جنوری، فروری 1972ء
124	شیخ نعمت اللہ ہندی مکیؒ (متوفی 1046ھ)	//	//	//	مئی 1972ء
125	حضرت بیزرطن ہندی یمنیؒ	//	//	//	مئی 1972ء
126	اسلامی شریعت اور حالات زمانہ	//	//	//	جون 1972ء
127	راجہ سید مبارک مانک پوری بانی مبارک پور	//	//	//	جولائی 1972ء
128	ملکہ شرقیہ بی بی	//	//	//	ستمبر 1972ء
129	مسلم خواتین	//	//	//	مئی تا اکتوبر 1973ء
130	چند مسائل رمضان	//	//	//	اکتوبر 1973ء
131	چند علماء ومشائخ (دو مرتبہ)	//	//	//	نومبر، دسمبر 1973ء تا جنوری 1974ء
132	بادیہ عرب میں سفر حج	//	//	//	نومبر، دسمبر 1973ء
133	مرثیہ اندلس	//	//	//	جنوری 1974ء
134	ترکستان شرقی کے چند مجاہد علماء	//	//	//	جنوری 1975ء
135	جنوبی کوریا میں اسلام	//	//	//	مارچ 1975ء
136	نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے	//	//	//	مئی 1975ء

137	نظام الملک طوسی اور علماء وصوفیاء	//	//	//	نومبر 1975ء
138	علم طب کی تاریخ	البلاغ	ممبئی	ماہنامہ	دسمبر 1975ء
139	بنو قریضہ کے یہود	//	//	//	فروری 1976ء
140	ماہ ذوالحجہ کے نیک اعمال	//	//	//	دسمبر 1976ء
141	مکاتیب حضرت مولانا ابوالوفاء افغانیؒ	//	//	//	دسمبر 1976ء
142	کعبہ کے امتیازات	//	//	//	ستمبر 1978ء
143	سلطان العلماء امام عزالدین بن عبدالسلام (ترجمہ و تلخیص)	//	//	//	ستمبر 1978ء
144	مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی	//	//	//	جنوری 1979ء
145	میری طالب علمی: قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک	//	//	//	فروری، مارچ 1979ء
146	زائرین حرمین	//	//	//	مارچ تا دسمبر 1979ء- جنوری، فروری 1980ء- مئی تا ستمبر 1980ء- نومبر 1980ء
147	گراں خوابی	//	//	//	جنوری 1980ء
148	عیدین کا مصافحہ	//	//	//	فروری 1980ء
149	کعبہ کا دیکھنا عبادت اور ثواب ہے	//	//	//	نومبر 1980ء
150	ساتویں صدی کے رجال السند والہند	معارف	اعظم گڑھ	ماہنامہ	جنوری تا اپریل 1958ء
151	دولت ماہانیہ سنجان (بمبئی)	//	//	//	مارچ تا مئی 1959ء
152	امام ربیع بن صبیح بصری ہندی	//	//	//	فروری، مارچ 1960ء
153	ہند و عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات	//	//	//	اپریل، مئی 1960ء
154	امام ابوموسی اسرائیل بن موسی بصری ہندی	//	//	//	اگست، ستمبر 1960ء
155	قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی بصری	//	//	//	دسمبر 1960ء
156	مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا	//	//	//	جنوری 1961ء
157	راجہ رہمی اور ہندوستان کے چند دوسرے راجے	//	//	//	فروری، مارچ 1961ء
158	علمائے اسلام کے القاب کی تاریخ	//	//	//	جنوری، فروری 1962ء
159	نارجیل سے نخیل تک	//	//	//	مارچ تا اگست 1962ء
160	عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات	//	//	//	جنوری، فروری 1963ء

161	عرب میں آباد ہندوستانیوں کو دعوت اسلام	//	//	//	مئی، جون 1963ء
162	امام ابوموسیٰ سعید بن منصور خراسانی اور ان کی سنن	معارف	اعظم گڑھ	ماہنامہ	اکتوبر 1964ء
163	امام محمد کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ	//	//	//	نومبر 1965ء
164	مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاع شرق سے	//	//	//	دسمبر 1965ء، جنوری 1966ء
165	لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ	//	//	//	جنوری 1976ء
166	فاتح ہند محمد بن قاسم ثقفی	//	//	//	جون، جولائی 1969ء
167	پیغمبر اسلام اور ہندوستان کے باشندے	//	//	//	فروری 1964ء
168	حضرت میر علی عاشقان سرائے میری	//	//	//	نومبر، دسمبر 1969ء
169	ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی	//	//	//	مئی تا اکتوبر 1971ء
170	حافظ امان اللہ بنارسی	//	//	//	اگست، ستمبر 1972ء
170	الہند فی عہد الاسلامی	//	//	//	اکتوبر 1972ء
172	ہندوستان میں علم حدیث اموی دور تک	//	//	//	جنوری، فروی 1973ء
173	ملا محمود جونپوری	//	//	//	مئی تا جولائی 1973ء
174	شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی	//	//	//	جنوری، فروری 1974ء
175	مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء	//	//	//	جولائی 1974ء
176	دیار پورب کا دوسرا علمی دور	//	//	//	دسمبر 1974ء، جنوری 1975ء
177	دیار پورب کا تیسرا علمی دور	//	//	//	ستمبر، اکتوبر 1975ء
178	بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات	//	//	//	دسمبر 1975ء، جنوری 1976ء
179	دیار پورب کا چوتھا علمی دور	//	//	//	اگست 1976ء
180	آل مقسم قیقانی سندھی	//	//	//	فروری تا اپریل 1977ء
181	امام ابوالحسن مدائنی (اسلامی ہند کے پہلے مؤرخ)	//	//	//	فروری، مارچ 1981ء
182	ابومعشر سندھی صاحب المغازی	//	//	//	ستمبر، اکتوبر 1981ء
183	امام ابوحفص ابن شاہین بغدادی	//	//	//	جولائی، ستمبر 1982ء
184	تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین	//	//	//	فروری 1983ء
185	حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر	//	//	//	نومبر 1984ء

186	عہدِ نبوی کی چند یادگار تحریریں	〃	〃	〃	اکتوبر 1988ء
187	مدینہ میں سیر و مغازی (پہلی صدی کے نصف آخر تک)	معارف	اعظم گڑھ	ماہنامہ	مارچ 1989ء
188	حضرت میر سید احمد بادپا	〃	〃	〃	جنوری 1990ء
189	صحابہ کرام کے صحف احادیث	〃	〃	〃	اکتوبر 1989ء
190	حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی سواد عراق کے فاتح اول	〃	〃	〃	ستمبر تا نومبر 1992ء
191	ہجرت سے پہلے مدینہ کی درسگاہیں	〃	〃	〃	نومبر 1991ء
192	عہد صحابہ کا نظام تعلیم و تربیت	〃	〃	〃	اپریل، مئی 1993ء
193	اسلامی تعلیمات کے ابتدائی مقامات و مراکز	〃	〃	〃	اپریل 1994ء
194	مدینہ منورہ کی دینی و علمی اور ادبی مجلسیں	〃	〃	〃	دسمبر 1994ء
195	ابوہاشم خالد بن یزید اموی	〃	〃	〃	اپریل 1995ء
196	تدوین فتاویٰ عہد بہ عہد	〃	〃	〃	دسمبر 1995ء
197	جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول	برہان	دہلی	ماہنامہ	اگست 1972ء
198	مشائخ جیبن پور	〃	〃	〃	مئی 1984ء
199	اخبار الاصفیاء (ہندوستان کے علماء و مشائخ کا ایک جامع تذکرہ)	〃	〃	〃	نومبر 1985ء
200	امام یحییٰ بن آدم قرشی اور ان کی کتاب الخراج	〃	〃	〃	فروری 1986ء
201	امام ابوحنیفہؒ: ابتدائی دور تصنیف کے عظیم مصنف	〃	〃	〃	نومبر 1987ء
202	غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ	〃	〃	〃	ستمبر 1986ء
203	قصص اور قاص	〃	〃	〃	ستمبر 1987ء
204	مکتوبات عثمانی (مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے خطوط)	〃	〃	〃	اگست 1988ء
205	حضرت مفتی صاحبؒ اور ندوۃ المصنفین	〃	〃	〃	نومبر، دسمبر 1991ء
206	خانقاہیں اور مدرسے	دارالعلوم	دیوبند	ماہنامہ	جنوری 1961ء
207	کلکتہ کا علمی سفر	〃	〃	〃	اپریل 1988ء
208	مدینہ منورہ کی مجلس القلادۃ	〃	〃	〃	دسمبر 1991ء
209	درسگاہ نبویؐ	〃	〃	〃	اپریل، مئی 1992ء
210	مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	〃	〃	〃	اکتوبر 1992ء
211	ہندوستان کے قدیم اولیاء و مشائخ				اپریل تا جون 1993ء

212	ہجرت سے پہلے مدینہ کی درسگاہیں	افکارمعلم	اعظم گڑھ	ماہنامہ	جنوری1992ء
213	ہجرت سے پہلے مکہ کی درسگاہیں	افکارمعلم	اعظم گڑھ	ماہنامہ	مارچ1992ء
214	علمائے صحابہؓ اوران کے شاگرد	//	//	//	اپریل1993ء
215	دیاراعظم گڑھ کے چندغیرمعروف مشائخ	انوارالعلوم	اعظم گڑھ	ماہنامہ	اپریل1996ء
216	مشائخ سارین	//	//	//	مئی1996ء
217	عہدرسالت میں صنعت پارچہ بافی	ترجمان الاسلام	بنارس	سہ ماہی	اکتوبر1993ء

قاضی اطہر مبارکپوری (1916-1996)
تصاویر کے آئینہ میں
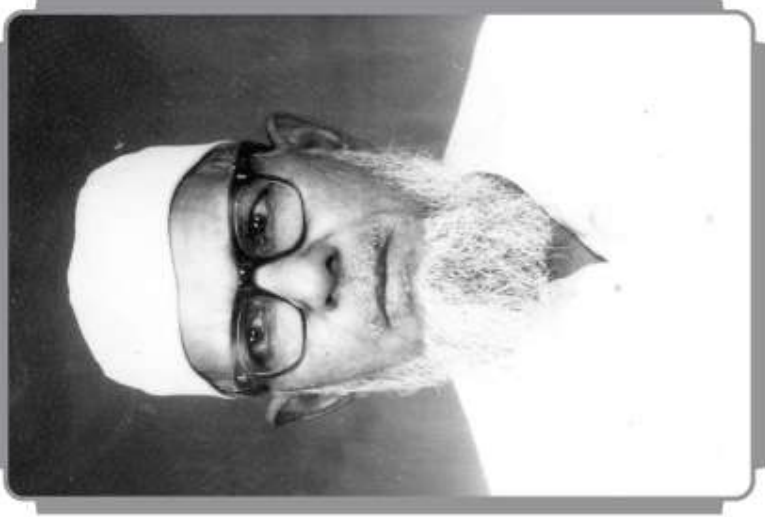
قاضی اطہر مبارکپوری کی جوانی اور بڑھاپے کی فائل فوٹو۔
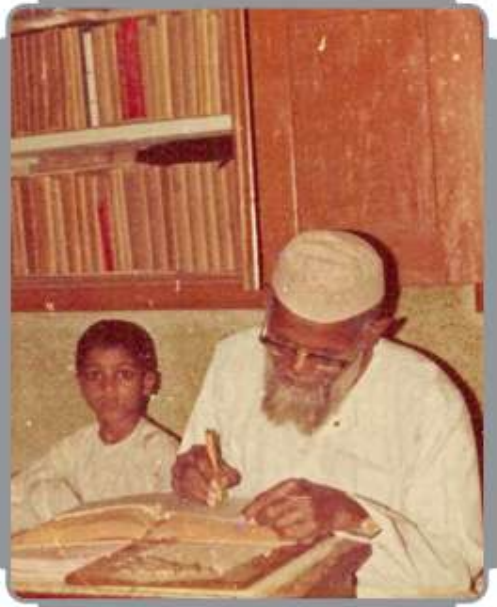
زیرنظر تصاویر کا تعلق قاضی اطہر مبارکپوری کی زندگی کے مختلف مراحل سے ہے۔ دائیں سے بائیں:۔ پہلی تصویر 1955ء کی ہے جس میں وہ ہاتھ میں بالٹی لیے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں، یہ تصویر ممبئی کے الکزنڈرا گودی پر جہاز میں حاجیوں کو پانی پلانے کے دوران لی گئی تھی۔ دوسری تصویر 27 فروری 1957ء کی ہے، اس میں قاضی صاحب صابوصدیق مسافر خانہ میں شاہ قطر شیخ علی بن عبداللہ بن قاسم ثانی کو استقبالیہ پیش کررہے ہیں۔ تیسری تصویر میں قاضی صاحب موصوف 1976ء میں انصار گرلس کالج کے یوم تاسیس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے۔ چوتھی تصویر 1982ء کی ہے جس میں موصوف اپنے ذاتی کتب خانہ میں لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں، ساتھ میں پوتے قاضی فرحان احمد کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر کرنل جمال عبدالناصر اور قاضی اطہر مبارکپوری (1960ء)

وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی دعوت پر مصری صدر کرنل جمال عبدالناصر 1960ء میں ہندوستان کے دورے پر آئے، اس موقع پر وہ ممبئی بھی تشریف لے گئے، جہاں گورنر ہاؤس میں جمعیۃ علمائے ہند کے وفد کے ساتھ قاضی اطہر مبارکپوری کی ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی تصویر گورنر ہاؤس میں استقبالیہ جلسے کی ہے، جس میں صدر جمال عبدالناصر، قاضی صاحب، عبدالحمید انصاری اور مصطفی فقیہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور دوسری تصویر میں قاضی صاحب صدر موصوف کو اپنی مشہور کتاب ''رجال السند والہند'' پیش کر رہے ہیں۔

میں بھارت کا راشٹرپتی

ذیل سنگھ

قاضی اطہر مبارکپوری

کو

عربی کی مسلمہ قابلیت

اور

علمی شغف کے لیے

یہ سند عطا کرتا ہوں

نئی دلی　　　　راشٹرپتی

مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۸۵

۲۵ پھاگن ۱۹۰۶

یہ تصاویر 15 اگست 1984 میں یوم آزادی کے موقع پر لی گئی ہیں۔ اولین تصویر اس اعزازی سند کی ہے جو صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ نے بدست خود قاضی اطہر مبارکپوری کو عنایت فرمائی، جیسا کہ نیچے کی بائیں تصویر سے واضح ہے، جب کہ دائیں جانب اجتماعی تصویر اسی موقع پر مغل گارڈن کی ہے، اس میں صدر موصوف، قاضی صاحب اور دیگر افراد کے علاوہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

زیر نظر تصاویر میں صدر جمہوریہ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق قاضی اطہر مبارکپوری کو سندھی ادبی میلے (1984) میں حمائل شریف، سندھ کی روایتی چادر، اجرک ٹوپی اور شیلڈ پیش کرتے ہوئے۔

عرب وہند کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف
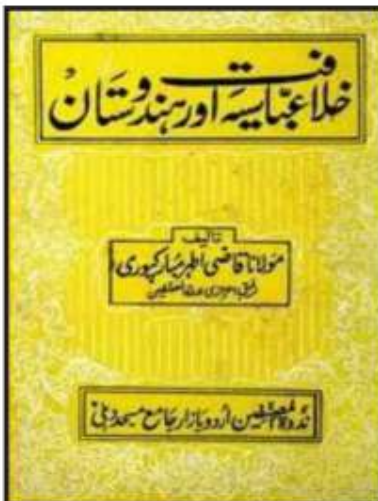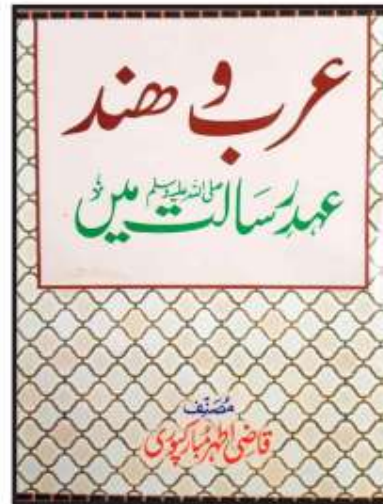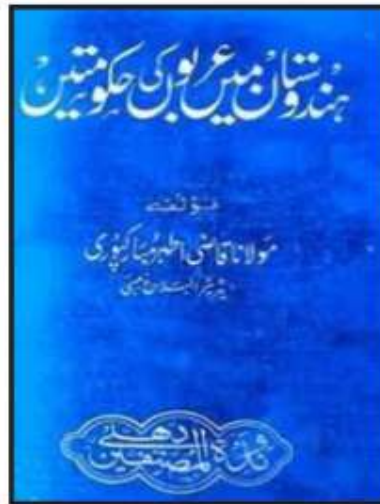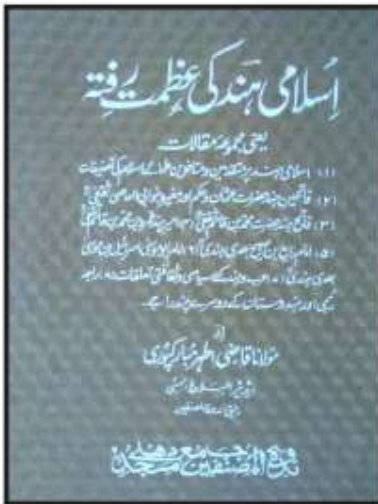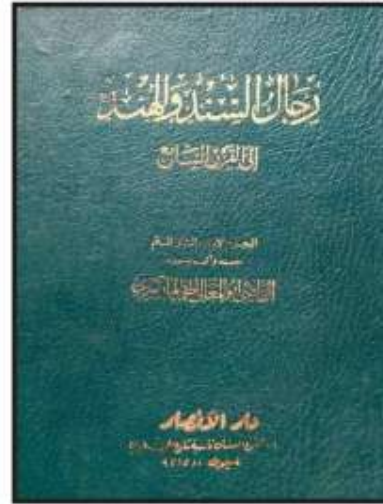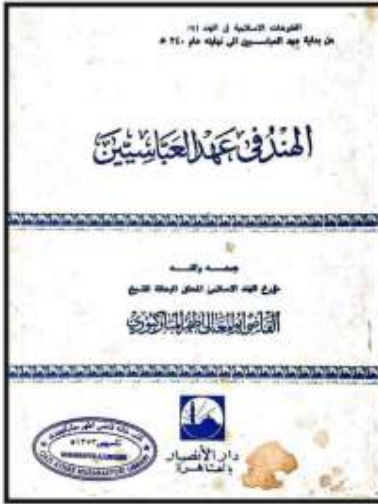
متفرق موضوعات پر قاضی اطہر مبارکپوری کی اہم کتابیں
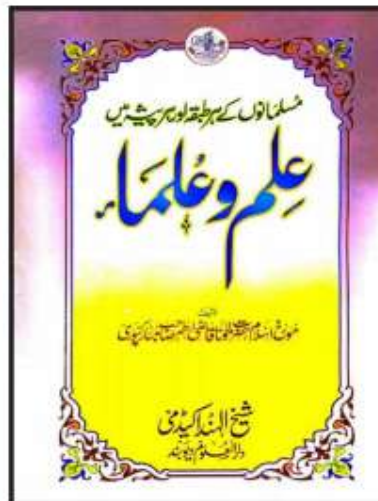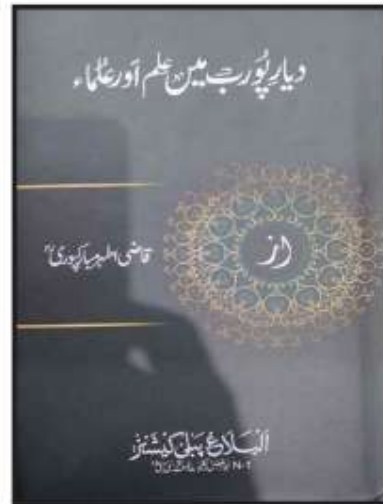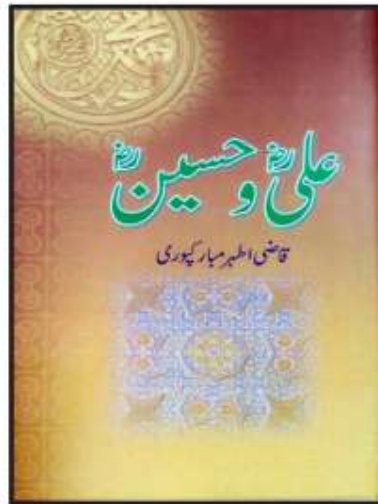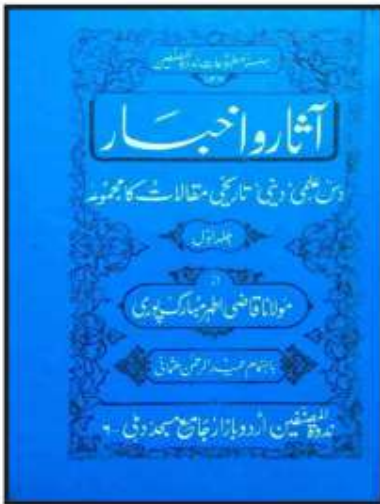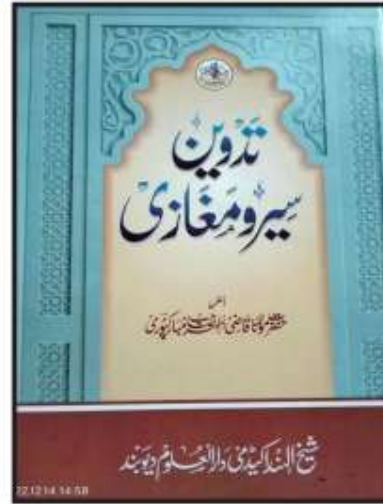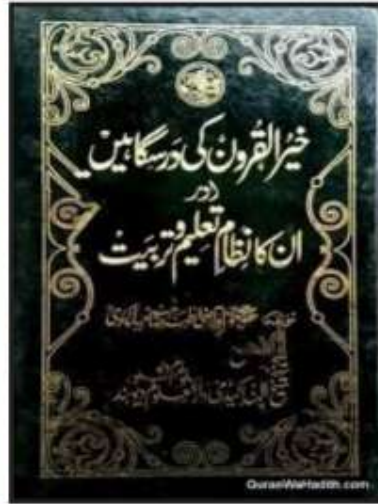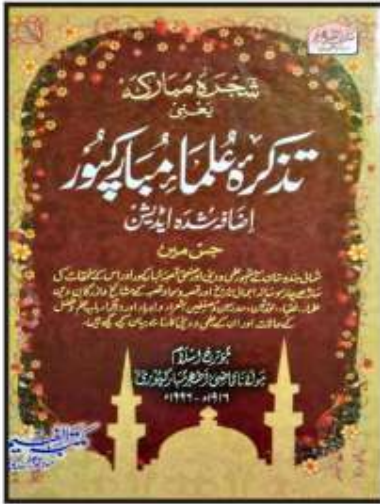
روزنامہ "جمہوریت" ممبئی میں قاضی اطہر مبارکپوری کے مطبوعہ مضامین کے تراشے
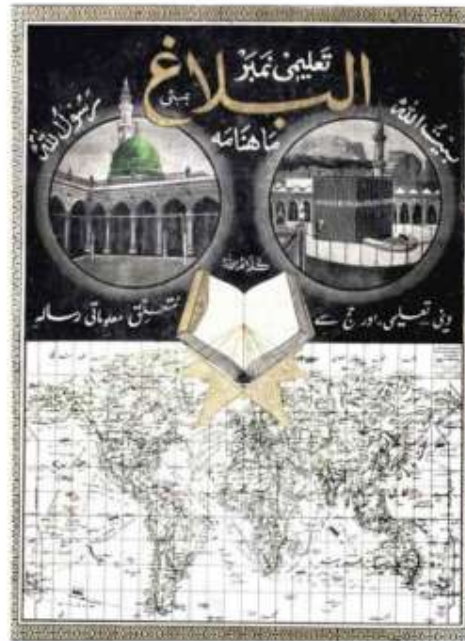
۱۳۷۰ھ کی آمد

جمہوریت

ہندو مہا سبھا کی انتخابی مہم

قاضی اطہر مبارکپوری کی سند اجازہ

سند خصوصی

الاجازة المسندة لسائر الكتب الحديثية

مختلف تنظیموں، اداروں اور علمی وادبی شخصیات کی جانب سے
قاضی اطہر مبارکپوری کے نام جاری کردہ خطوط ورسائل

قاضی اطہر مبارکپوری کے نام مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ خط یکم اگست 1972ء کا ہے۔اس خط کا موضوع مولوی عبدالحئ حسنی کی کتاب ''الہند فی عہد الاسلامی'' ہے جس پر قاضی اطہر مبارکپوری نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فرمائش پر تفصیلی تبصرہ لکھا، جو اکتوبر 1972ء میں مجلہ ''معارف'' میں شائع ہوا۔
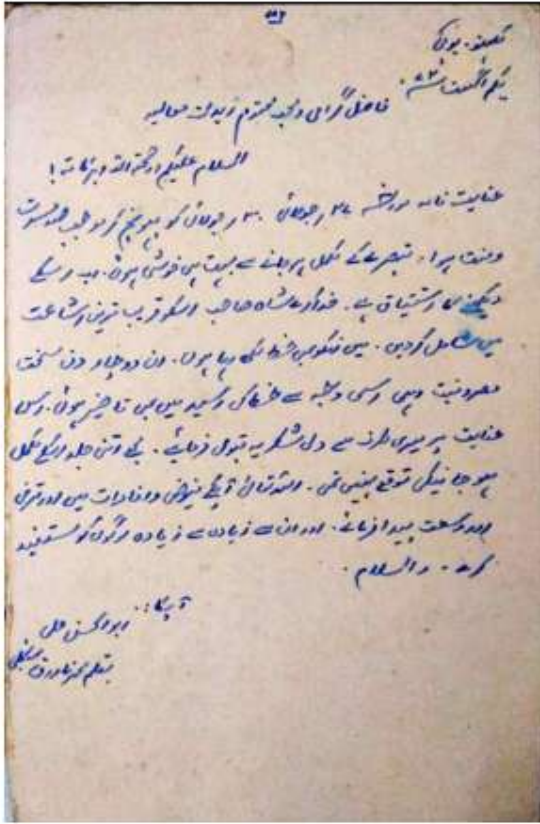
یہ خط پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا ہے جو انہوں نے جنوری 1988ء کو ''تنظیم فکر و نظر سکھر'' سندھ کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو کو لکھا تھا۔خط کا موضوع فارسی و اردو کی وہ چودہ کتابیں ہیں جو مذکورہ تنظیم سے شائع کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو ارسال کی تھیں۔ موصوف کو یہ کتابیں بہت پسند آئی اور مکتوب الیہ کو اس کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی، ساتھ ہی بطور خاص قاضی اطہر مبارکپوری کی دو کتابوں (خلافتِ امویہ اور ہندوستان اور خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان) کا تذکرہ کر کے ان کے تحقیقی اسلوب کی داد دی ہے۔

PRESIDENT

بسم الله الرحمن الرحيم

المملكة العربية السعودية
الرئاسة العامة
للاشراف الديني بالمسجد الحرام
ادارة مكتبة الحرم الشريف المكي

الرقم .. ٢١ح
التاريخ . ٦/٩/١٣٩٦هـ
المشفوعات [illegible]

فضيلة الشيخ القاضي أبو المعالي اطهر المباركفوري المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته :

وبعد .. فقد تسلمت " مكتبة الحرم المكي الشريف " هديتكم الكريمة لها وهو مؤلفكم القيم " العقد الثمين في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين " .. واني باسم المكتبة وروادها اتقدم لكم بخالص الشكر والتقدير ازاء ما قدمتم لها .

شاكراً لكم كريم عنايتكم . سائلاً المولى القدير ان ينفع به طلاب العلم والمعرفة ـ وتقبلوا تحياتي .

مدير مكتبة الحرم المكي بالنيابة

عبد العزيز الدوسري

بسم الله الرحمن الرحيم

المنهل

الرقم ———
التاريخ ———
المشفوعات ———

م الهاتف ٢٩٧٣

• أنشئت سنة ١٣٥٥هـ - ١٩٣٥م بالمدينة المنورة
• ثم صدرت بمكة المكرمة الى سنة ١٣٧٥هـ
• تصدر الآن بجدة - المكتب بالشرفية - شارع ... ت ٢٩٧٣

صاحب السماحة الاستاذ المبجل القاضي اطهر مباركفوري المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته :-

وبعد فقد حظيت بخطابكم الكريم المؤرخ في ١٨/ ١١/ ١٣٨٨ في هذا اليوم الموافق ٢٢/ ١/ ٨٩ مع الحاج العزيز الاستاذ مختار احمد فحمدت الله على سلامة صحتكم ومما زاد سروري وضاعف حبوري تفضلكم بالهدية الثمينة ((الفتوحات الاسلامية أو العقد الثمين في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين)). والحقيقة ان هذا الكتاب هو كتاب السنة فقد ملأ فراغا كبيرا واؤكد لكم صادقا اني قرأته من الغلاف الى الغلاف واستفدت منه معلومات لا توجد منسقة مترتبة ممحصة في سواه.. وهو بحق ... ته وكتبت عنه كلمة مهمة ستقرؤونها ان شاء الله تعالى في منهل الشهر الثاني من عامنا الحالي واني لشاكر ومقدر تشجيعكم المنهل وسيصلكم المجلة تباعا هدية لكم ان شاء الله هذا وشرفونا بما يلزم اما المقدمة التي كتبها اخوكم فقد زينها كتابكم القيم وياحبذا لو تتفضلون علينا ببحث من محيط علومكم وآرائكم ليقتبس منها قراء المنهل انوارا سماء جا وادبا اسلاميا راقيا . اننا لمنتظرون وخاصة فيما يتعلق بالهند والعرب والاسلام وعلاقا

والله يرعاكم

في ٢٣/ المحرم ١٣٨٩ هـ .
الموافق ١٠/ ٤/ ١٩٦٩م

اخوكم المخلص
عبد القدوس الانصاري

٦/١/٥٢٩
٨٩/١/١٨

بسم الله الرحمن الرحيم

المملكة العربية السعودية
الجامعة الاسلامية
بالمدينة المنورة
الادارة المالية

من عبدالعزيز بن عبدالله بن باز الى حضرة الاخ المكرم أ. ابراهيم ميان كيمبرن وفقه الله
١٠٢ جمعيت اسلامية بميان ترو ٢

سلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد ،

بالاشارة الى خطابكم رقم ... وتاريخ ٢ / ٨ / ١٣٨٨ هـ المرفق به نسخة
من كتاب السفر التمهيدي لمرحلة الرشد) نفيدكم أننا نـود
رأينا تأمين (خمس عشرة) نسخة من (الأدب الفارسية)
بالسعر المحدد من قبلكم وهو ( ) للنسخة الواحدة لذا اعتمدوا ارسال النسخ
المشار اليها مع أمرنا هذا وفاتورة بالمستحق لكم لمقابلتكم به تولاكم الله والسلام عليكم .

نائب رئيس الجامعة الاسلامية

٩ / ٢ / ١٣٨٩ هـ
١٩٦٩ / ١٤ / ٤

بسم الله الرحمن الرحيم

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا

الرابطة [illegible] الإسلامي
الأمانة [illegible]

الرقم - ١٩ -
التاريخ ٢٨ / ٤ / [illegible]
المرفقات - ٢٦ [illegible] ٨٤

حضرة صاحب الفضيلة الشيخ القاضي أبو المعالي أطهر المباركفوري حفظه الله

الهنـــــد

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته . وبعد :-

احيط فضيلتكم علما بان ابنكم اطلع على بعض مؤلفاتكم القيمة أشكر لكم جهودكم الجبارة في هذا السبيل الذي كشفتم فيهم جوانب بعيدة من تاريخ هؤلاء الابطال والقواد الذين فتحوا بلاد الهنــد والسند . جزاكم الله خير الجزاء .

فلهذا ارجو من فضيلتكم أن ترسلوا لي من مؤلفاتكم المدون ادناه أسماؤها بالبريد الجوي المسجل نسخة واحدة بكل واحدة منهم وكذلك اخبروني باسعارها ان شاء الله سارسل لكم ثمنهم بطريق البنك او كما امرتني فضيلتكم . وفقكم الله ورعاكم وتفضلوا بقبول فائق التحية والاحتـــرام ....

مقدمه ابنكم ابو فيصل

[illegible]

عبد الغفـــور

١ ـ دول العرب في الهند .

٢ ـ العقد الثمين في فتوح الهند .

٣ ـ العرب والهند في عهد الرسالة .

٤ ـ المجد الغابر للهند الاسلامية .

عنوان :

مكة المكرمة / رابطة العالم الاسلامي

ادارة المجمع الفقهي الاسلامي

ابو فيصل عبد الغفور [illegible]

حكومة الكويت

وزارة الارشاد والانباء

الكويت في ٢٧/٢/٦٢ — الاشارة : م ا ب / ١ / ٢ / ١٩٦

٢١ جنوري ١٩٨١ م

Qazi Athar Mubarak

تحية ود وتقدير ،

كانت وزارة الارشاد والانباء قدمت اليكم مجموعة الكتب التي اصدرتها في سلسلة " التراث العربي " اسهاما منها في احياء كنوزنا الادبية القديمة .

ويسر هذه الوزارة ان تتلقى رأيكم في هذه السلسلة وفي الجهد المتواضع الذي تبذله في هذا السبيل ، كما يسرنا ان نتلقى اقتراحاتكم في هذا الشأن وان ترشدونا الى المخطوطات التي ترون ثمة فائدة في نشرها او الى الكتب المطبوعة التي نفدت نسخها وتعتقدون بان من المستحسن اعادة طبعها من جديد .

وعلى امل ان نتلقى توجيهاتكم هذه في وقت قريب ، نرجو قبول اصدق الشكر والاحترام ،،

المدير العام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Joint Secretary

No.8(1)/ADS(R&R)/85
Ministry of Religious Affairs &
Minorities Affairs
GOVERNMENT OF PAKISTAN

Islamabad, the 5th March, 1985.

Subject:- INTERNATIONAL SEERAT CONFERENCE 1985.

Dear Scholar,

I feel honoured to bring it to your kind attention that this Ministry will convene an International Seerat Conference on the sacred occassion of the birth-day of the holy Prophet (peace be upon him) in the first week of December, 1985.

You are cordially invited to participate in the said conference as a speaker-delegate. You will be treated as a guest of the Government of Pakistan and all the expenses on your journey to Pakistan and back and boarding and lodging in Pakistan will be borne by this Ministry.

It will be of interest to you to know that the main theme of the conference is "Universal Status of the Holy Prophet (peace be upon him)". A list of the sub-titles is also enclosed herewith for ready reference.

It will be a highly appreciated if you favour us with a research paper in the proposed Conference on any one of the sub-titles attached, keeping in view the problems and conditions prevalent in the world to-day, by the 30th June, 1985.

With kind regards,

Yours sincerely,

(REHMATULLAH KHAN) 5/3/85

Maulana Athar Mubarikpuri,
Post Mubarikpur,
District Azamgarh,
India.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

8(1)/ADS/R&R/85
Ministry of Religious Affairs &
Minorities Affairs
GOVERNMENT OF PAKISTAN

Islamabad, the 28th March, 1985.

Director General

Subject:- INTERNATIONAL SEERAT CONFERENCE, 1985

Dear scholar,

In continuation of this Ministry's letter of even number dated the 5th March, 1985, regarding the subject cited above, it is requested that the languages for the above conference are Arabic, English and Urdu. As such, you are requested kindly to pen-down your research papers in one of these languages keeping in view the main theme of the Conference - "Universal Status of the Seerat of the Holy Prophet" (peace be upon him), the sub-titles of which have already been supplied to you.

With kind regards,

Yours sincerely,

(Dr. Aminullah Vaseer)

Maulana Athar Mubarikpuri,
Post Mubarikpur,
District Azamgarh,
India.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

No. 8 (1) / ADS / 85
Ministry of Religious Affairs &
Minorities Affairs
GOVERNMENT OF PAKISTAN

Islamabad, the 17th July, 198

Subject :— INTERNATIONAL SEERAT CONFERENCE - 1985

Dear Sir,

The Ministry of Religious Affairs, Government of Pakistan, has decided to organize an International Seerat Conference in the Capital City of Islamabad from 12th to 13th Rabiul Awwal (1406 A. H.) approximately 26th and 27th November, 1985. The theme of the Conference will be "Universal Aspect of the Seerat of the Holy Prophet".

2. On behalf of the Government of Pakistan, I have the honour to extend a cordial invitation to you to attend this Conference in which a galaxy of scholars and other eminent personalities, particularly from all over the World of Islam, will participate.

3. We shall look forward to receiving your positive response at your earliest convenience.

4. Relevent Material is enclosed.

5. Please accept the assurance of our highest consideration.

Yours faithfully,

(CH. SHAUKAT ALI)
Secretary General
of the Conference

Qazi Athar Mubarakpuri
Markaz-e-Ilmi
153, Janji har Street Bombay
400003,
India.

HAMDARD FOUNDATION, PAKISTAN

THE PRESIDENT
HAKIM MOHAMMED SAID

20th December, 1985.

Dear Friend,

A New Year is dawning, a year full of promise and hope. On this occasion please accept my warm greetings and good wishes for a happy New Year.

The Year 1986 is special for the world — it is the *International Year of Peace*. Let it be our earnest hope and prayer that the foundations of a lasting peace are firmly laid, to ensure a world where the mind is without fear, and where we can devote our energies to the conquest, not of lands, but of ignorance, hunger and disease through co-operation, understanding and mutual trust.

I firmly believe in the fact that man occupies the place of honour in this 'not too solid' universe. Man is the measure of dignity and the creator of beauty. Within man's being lies hidden the seeds of peace. He used the pen and the tablet, and made them the basis of both civilization and culture, whether the latter were nurtured by the sublimity of creative art and literature or the tragic greatness of a Socrates or a Mansur enunciating 'the Truth'. It is man who shines behind the sacred Verse and the all-conquering Knowledge. Though bitten many a time and betrayed not infrequently, I yet retain my faith in inherent human goodness. I firmly believe that civilization and culture, creative art and literature and the quest for peace, truth, and freedom from suffering are all different facets of knowledge. If man settles down in the world of knowledge and wisdom, his thought and conduct can reflect only peace and truth. He can, through his love for man and respect for man's dignity, make this turbulent, tormented world, a haven of peace and tranquillity.

I will be most grateful if you could graciously favour me with your views on ~~"Man — the World — Peace". A brief dissertation of about two hundred and fifty~~ words will be a valued contribution to a book that I intend compiling on this subject for publication and distribution in 1986 — the *International Year of Peace*.

May God guide us through another year.

Yours sincerely,

(Hakim Mohammed Said)
President
Hamdard Foundation Pakistan

Qazi Athar Mubarakpuri

Hamdard Centre, Nazimabad, Karachi-18 (Pakistan), Tel:616001-5 Lines, Lahore : 53819, Rawalpindi : 64338, Peshawar : 74186
Telex No. 24529 HAMD PK

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Phone: 158002

TANZEEM FIKR-O-NAZAR SIND

(REGISTERED)

CENTRAL OFFICE:
RAHIM MARKET, FLAT NO. 12
SUKHA TALAB,
SUKKUR - PAKISTAN

Ref. No. ____ دام اقبالکم

Date ٢٧ فروری ١٩٨٦ء

واجب الاحترام صاحب السعادت والفضیلت حضرت مولانا اطہر مبارکپوری صاحب

السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ،

امید ہے کہ رب ذوالجلال کے فضل و کرم سے آپ ہر طرح با عافیت ہونگے۔ یہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے موقع پر اسلام آباد میں ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے ذاتی طور پر مسرت حاصل ہوئی کہ میری خواہش اور کوشش کے نتیجہ میں آپ تشریف لائے۔ آپ کی عظیم اسلامی خدمات سے اہل علم پوری طرح واقف ہوئے۔ آپ کے پیش کردہ مقالہ کی ندرت اور محنت کو ہر ایک صاحب نے سراہا۔

١٤٢٣
٢٣ اپریل ١٩٨٦ء کو تنظیم فکر و نظر سندھ کے زیر اہتمام سکھر میں

" عالمی شاہ عبد اللطیف بھٹائی کانفرنس "

منعقد ہو رہی ہے۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اسکا افتتاح کرینگے اور پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک کے بھی نامور دانشور اور صاحبان علم و فضیلت اس میں شرکت فرمائینگے۔ ارشاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی روشنی میں ہم آپ پر پھر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں آپ سے بے حد محبت ہے۔ سندھ اور ہند کی تاریخ پر جو آپ نے کام کیا ہے اس کے لئے تاریخ آپ ممنون احسان ہے۔ جس محنت، جانفشانی اور قلبی لگاؤ کے ساتھ آپ نے کام کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ہم اس بات پر آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے تنظیم فکر و نظر سندھ سے اتنی محبت کا اظہار کیا کہ اپنی کتب شایع کرنے کی اجازت دینا فرمائی۔ اس کانفرنس کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ اس موقع پر آپ کی چار کتب کا صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب افتتاح کرینگے۔

تاریخ سندھ سے بے حد شغف اور اس کانفرنس کی علمی اہمیت کے پیش نظر آپ سے گزارش ہے کہ آپ سکھر تشریف لائیں اور کم از کم دو ہفتہ سندھ میں قیام فرمائیں۔

امید ہے کہ آپ ہماری مخلصانہ اور برادرانہ دعوت کو ضرور شرف قبولیت بخشینگے۔

آمد و رفت کے اخراجات تنظیم کے ذمہ ہونگے۔

والسلام

اسد اللہ بھٹو
Asadullah Bhutto

پروفیسر اسد اللہ بھٹو

صدر تنظیم فکر و نظر سندھ سکھر

قلم تازہ —
آپ کی خدمت میں تار بھیج چکا ہوں — [illegible]

12x3x87

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Phone: 158002

TANZEEM FIKR-O-NAZAR SIND

(*REGISTERED*)

CENTRAL OFFICE;
RAHIM MARKET, FLAT NO. 12
SUKHA TALAB,
SUKKUR - PAKISTAN

*Ref. No.*________

Date ۲۷ ~~اپریل~~ مارچ ۱۹۸۶ء

واجب الاحترام صاحب السعادت والفضیلت
جناب قاضی اطہر مبارکپوری صاحب

السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ

آپ کا تار ملا - عالمی شاہ لطیف کانفرنس میں آپ کی شرکت کی نوید نے اہل علم میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے- کانفرنس کا پروگرام انشاء اللہ حتمی ہے جو ۲۲ تا ۲۶ اپریل ۱۹۸۶ء تک ہے- کانفرنس میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے علاوہ وزیر اعظم پاکستان جناب محمد خان جونیجو کی شرکت کی خاصی امید ہے- اس موقع پر آپ کی تاریخ ساز خدمات کے اعتراف میں تنظیم کی طرف سے شیلڈ پیش کی جائیگی - حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی محنت اور کاوش نے تاریخ کے گم شدہ کڑیوں کو تلاش کیا ہے- یہ کام آپ سے پہلے شاید کوئی بھی سر انجام نہ دے سکا- اللہ کا یہ لطف و کرم آپکے حصہ میں مقدر تھا -

براہ کرم اپنی آمد اور فلائیٹ کی اطلاع دینا فرمائیں تاکہ ہم آپکے استقبال کیلئے کراچی کے ہوائی اڈے پر موجود رہیں - مزید گذارش کہ شاہ عبد اللطیف کے متعلق ایک کتاب خدمت میں بھیجی ہے- ایک مزید بھیجی جا رہی ہے تاکہ آپ تحریری یا تقریری شکل میں اظہار خیال فرمائیں- مزید درخواست کہ "سندھ کی علمی عظمت رفتہ" کے موضوع پر بھی اپنے جامع ~~مقالہ~~ مقالے سے ~~بھی~~ ہمیں نوازیں-

والسلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ-

آپ کا مخلص

اسد اللہ بھٹو

پروفیسر اسد اللہ بھٹو
صدر تنظیم فکر و نظر سندھ سکھر

قلم تازہ -

مزید ایک کتاب کے لئے عرض کیا ہے کہ وہ بھیج رہے ہیں، وہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے فی الحال نہیں بھیج سکے - انشاء اللہ کچھ روز میں ارسال کریں گے -

یہ بھی گذارش ہے کہ ہمارے ہاں ہفتہ دو ہفتہ تک قیام فرمائیں -

اسد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Phone : 158002

INTERNATIONAL
SHAH ABDUL LATIF BHITAI CONFERENCE

CENTRAL OFFICE :
TANZEEM FIKR-O-NAZAR SIND
(REGD)
SIND ISLAMIC CENTRE
SUKKUR - PAKISTAN

Ref No. ____________ Date ۳ اپریل ۱۹۸۷ء

محترمی و مکرمی جناب قاضی اطہر مبارکپوری

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مؤدبانہ گذارش کہ ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں
کہ آپ نے "عالمی شاہ لطیف کانفرنس" میں شرکت کے لیئے
ہماری مخلصانہ دعوت کو شرف قبولیت بخشا۔

آپ سے گذارش ہے کہ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء
بروز جمعۃ المبارک وقت ۹:۰۰ بجے صبح کے مقالاتی اجلاس میں بطور
مہمان خاص کی حیثیت سے شرکت کرنا فرمائیں۔

علاوہ ازیں ۲۴ اپریل ۱۹۸۷ء کے اختتامی اجلاس
جس کی صدارت صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق فرما
رہے ہیں۔ اس میں بھی آپ اپنے قیمتی خطاب سے سامعین
کو نوازیں۔

والسلام

229

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دار العلوم دیوبند

DARUL ULOOM DEOBAND, (U.P.) INDIA

Ref. No............ Dated ۱۲/اپریل
از دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

مکرمی و محترمی زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ —

امید ہے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں گے —
شیخ الہند اکیڈمی کا دعوت نامہ ملاحظہ گرامی سے گذرا ہوگا، مجلس شوریٰ سے ایک یوم قبل ۲۸ اپریل میٹنگ رکھی گئی ہے —
جیسا کہ جناب نے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مجلس میں خود شرکت فرمائیں گے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے، اسکے پیش نظر پوری توقع ہے کہ جناب تشریف لانے کا پروگرام بنا چکے ہوں گے۔
جناب نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار فرمایا ہے جو ہم خدام دار العلوم کیلئے انتہائی مایوسی اور تکلیف کا باعث ہے۔ جیسا کہ اس ناچیز نے زبانی طور پر عرض کیا تھا کہ یہاں قیام کی کوئی پابندی نہ ہوگی، جناب کی صوابدید کے مطابق پروگرام بن جائیگا۔ پھر جناب کو تامل نہیں ہونا چاہئے، ممکن ہے جناب کو یہ خیال ہو کہ عمر کی اس منزل میں ذمہ داری کا بار نہیں اٹھانا چاہئے اور گوشۂ عافیت میں زندگی گذارنی چاہئے۔ ہمارا یہ عرض کرنا ہے کہ جناب کو تو اپنی نگرانی میں کام کی لائن متعین کرکے ذی استعداد لوگوں کو اس کام میں لگانا ہے اور انکی رہنمائی فرمانی ہے۔ یہ کام زیادہ بار کا باعث نہیں ہوگا —
ذاتی طور پر جناب اپنے ذوق اور دلچسپی کی بنا پر تحقیقی مقالے اور تصانیف تحریر فرماتے رہے ہیں وہ شیخ الہند اکیڈمی کی جانب سے شائع ہو کر اکیڈمی کی حیثیت اور بلند معیاری کا باعث ہوں گے،
محترمی! اس ناچیز کی یہ گزارش ہے کہ جناب اپنی زیر نگرانی اور زیر تربیت کچھ ایسے رجال علم بنا جائیں جو مستقبل میں اس علمی و دینی خدمت کو انجام دیتے رہیں، اور دار العلوم کے مقاصد میں سے یہ مقصد بھی پورا ہوتا رہے۔ دار العلوم کا آپ پر حق ہے۔

مجھے امید ہے کہ جناب اس عاجز کی معروضات پر غور و خوض فرمائیں گے اور اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں گے —
بہر حال شیخ الہند اکیڈمی کی اس میٹنگ میں ضرور تشریف لے آئیں، مناسب ہو تو ایک دو روز قبل تشریف لے آئیں تاکہ کام کے نقشہ اور ضروری امور پر پہلے گفتگو ہو جائے۔
امیدوار ہوں کہ اس معروضہ کو شرف قبولیت سے نوازیں گے —
جناب کیلئے دعا گو ہوں، اور دار العلوم کیلئے آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں —

والسلام

مرغوب الرحمٰن عفی عنہ

حکیم محمد سعید

HAKIM MOHAMMED SAID
HAMDARD NATIONAL FOUNDATION, PAKISTAN
NAZIMABAD - KARACHI-18
(PAKISTAN)

KARACHI : 616001-5 ; 616452 ; 215908 ; RES : 410612
LAHORE : 53818 PESHAWAR : 74186
RAWALPINDI : 64338 ; RESIDENCE : 67419

حوالہ نمبر : ق / ت / ۸۲ / ۹

کراچی : ۱۰ ــ شعبان المعظم ۱۴۰۲ ھ
۲۰ ــ اپریل ــ ۱۹۸۲ ء

مکرمی و محترمی قاضی اطہر صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا خط اور حسب ذیل کتب جو آپ نے از راہ کرم بھجوائی ہیں موصول ہوئیں :

۱) خلافت راشدہ اور ہندستان (۲) خلافتِ امویہ اور ہندستان (۳) خلافت عباسیہ اور ہندستان (۴) ہندستان میں عربوں کی حکومتیں (۵) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۶) دیار پورپ میں علم و علما (۷) مآثر و معارف

یہ سب کتابیں ہمدرد یونیورسٹی لائبریری میں شامل کر دی گئی ہیں ۔ اس تحفہ علمی پر میں آپ کا شکر گزار ہوں ۔

اس خط کے ساتھ مطبوعات ہمدرد کی فہرست ارسال خدمت ہے ۔ اس میں آپ جو کتابیں ندوۃ المصنفین کے کتب خانے کے لیے پسند فرمائیں بھجوا دی جائیں گی ۔

صاحبزادے کی صحت کے لیے اللہ تعالٰی سے دعا کرتا ہوں ۔

یقین ہے مزاج بعافیت ہوگا ۔

آپ کا مخلص

(حکیم محمد سعید)

بخدمت محترم جناب قاضی اطہر مبارک پوری صاحب
قاضی منزل ۔ مبارک پور ۔ اعظم گڑھ یوپی
انڈیا

مرثیہ
قاضی اطہر مبارک پوری

از: ایوب مبارک پوری

اے مورخ اے مبارک پور کے نورِ نگاہ
اے سراپا علم و دانش فکر وفن کے بادشاہ

اے ادیب عصرِ نو پروردۂ دار القضاء
مصر کے بازار میں چلتا ہے سکّہ آپ کا

باریابی ‘‘آم’’ کی ملکِ رُطب تک ہوگئی
آپ کے افکار کی شہرت عرب تک ہوگئی

فکرِ نو سے کر دیا شعلے کو شبنم آپ نے
تشنہ کاموں کو پلایا ‘‘جام زم زم’’ آپ نے

قلبِ ظلمت میں جلایا یوں صحافت کا چراغ
دم زدن میں ہوگئی روشن فضائے ‘‘البلاغ’’

ہے ‘‘رجال ہند وسند’’ اہلِ نظر کے سامنے
ہے ‘‘مآثر اور معارف’’ بھی بشر کے سامنے

عالمِ اسلام کو بھیجا پیامِ زندگی
ناز کے قابل ہے ‘‘اسلامی نظامِ’’ زندگی

‘‘ہند اسلامی’’ کو ہے کیا کیا بتایا آپ نے
عظمتِ رفتہ کا افسانہ سنایا آپ نے

عقدۂ ‘‘عقد ثمین’’ حل کرکے پانی کردیا
ہر ورق کو مائل جادو بیان کردیا

تذکرہ اسلام کا سا وقت بھارت میں بھی تھا
‘‘رشتۂ ہند وعرب’’ عہدِ رسالت میں بھی تھا

وادیٔ تاریخ میں بہتا ہے دریا نور کا
تذکرہ ہے خوب علماءِ مبارک پور کا

شاعری کی بزم میں آکر سخنور ہوگئے
تھے کبھی عبدالحفیظ اب قاضی اطہر ہوگئے

اللہ اللہ آپ کے زورِ قلم کا ‘‘انقلاب’’
اک زمانہ ہو رہا ہے درسِ حق سے فیضیاب

جملہ تصنیفات میں شامل علیؓ اور حسینؓ
ہے معطر جس کی خوشبو سے فضائے مشرقین

بانی انصار کی خدمت عظیم الشان ہے
دختران قوم پر یہ آپ کا احسان ہے

جانب ملکِ عدم حضرت بہ عجلت چل دیئے
چھوڑ کر ایوب ہم کو فخرِ ملت چل دیئے

تیرگی میں نور کا مینار ہوکے رہ گئے
آپ آج ‘‘اخبار اور آثار’’ ہوکے رہ گئے

PERSONAL PROFILE

Waseem Ahmed
Mobile No: +91 9911064126
Email: waseemislamicstudies@gmail.com
Address: H No C-122, Gali No 9/2,
Shiv Mandir , Maujpur,
Delhi-110053
Email:waseemislamicstudies@gmail.com

Academic Qualification

Qualification	Board/University	Year
Ph.D. (Islamic Studies)	Jamia Millia Islamia,New Delhi	Admission in December 2017
Ph.D. Course Work	Jamia Millia Islamia	2018
M.A.(In Islamic Studies)	Jamia Millia Islamia	2017
B.A. Hons.(Islamic Studies)	Jamia Millia Islamia	2015
Alim (Intermediate)	U.P. Board Of Madarsa Education	2010
Moulvi(High School)	U.P. Board Of Madarsa Education	2008

Seminars

1. Paper titled "Maulana Hifzur Rahman Seoharwi aur Gandhi Ji : Bahemi Taluqaat" presented in two days national conference on the life & achievements of Mujahid -e-Millat Hazrat Maulana Hifzur Rahman Seoharwi held by Jamiat Ulama-e-Hind in New Delhi on 22-23 December 2022.
2. Paper titled "Ulum-e-Islami ki tarveej wa Ishaat: Shah Abdul Aziz Muhaddis Dehlvi aur unke Talamezah ke Hawale se" presented in two days national Seminar/Webinar on "Shah Abdul Aziz Muhaddis Dehlvi: Ilmi Sarmaya aur Fikri Meeras" held on 10-11 December 2022 by Indian Institute of Objective Studies in New Delhi.
3. Paper titled "Arab-o-Hind ki Qadeem Ilmi wa Saqafti Tareekh Qazi Athar Mubarakpuri ke Hawale se" presented at Mushirul Haq National Seminar of Research Scholars organized by Department of Islamic Studies, Jamia Millia Islamia New Delhi on 14th September 2023.

Publications

1. Paper titled "Islamic Ambiance: A Critical need for contemporary Indian Muslim Society" published in December 17th 2022 issue of the journal Radiance viewsweekly.
2. Paper titled “Arab-o-Hind ki Qadeem Ilmi wa Saqafati Tareekh:Ulama-e-Hind ki Tehreero ke Hawale Se” published in monthly journal “Baraheen” of the issue of December 2023.

Achievements

- Qualified National Eligibility Test & Junior Research Fellowship (NET-JRF) in November 2017.

Experience

- Taught Islamiat paper to under graduate students during the academic session 2019-20 & 2020-21 as a research scholar in Jamia Millia Islamia New Delhi.

Co-curricular Activities

- 2016-2017 worked as managing editor for the student's magazine "Sada-e-Jauhar" published by subject association, Department of Islamic Studies, Jamia Millia Islamia New Delhi.
- 2015-2016 worked as general secretory of the subject association, Department of Islamic Studies, Jamia Millia Islamia New Delhi.
- 2014-2015 worked as joint secretory of the subject association, Department of Islamic Studies, Jamia Millia Islamia New Delhi.

Personal Details

Mother's Name: Amna

Father's Name: Mohammad Shafi

Date of Birth: 8th April 1992

Gender: Male

Marital Status: Married

Nationality: Indian

Religion: Islam

Uloom-e-Islami ke Farogh mein Qazi Athar Mubarakpuri ki Khidmaat: Ek Tajziyati Mutaala

Thesis

Submitted to

Jamia Millia Islamia

In partial fulfillment of the requirements for the award of the

Degree of Doctor of philosophy

Islamic Studies

By

Waseem Ahmed

under the supervision of

Dr. Mohd. Arshad

Jamia Millia Islamia

DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES

FACULTY OF HUMANITIES & LANGUAGES

JAMIA MILLIA ISLAMIA

NEW DELHI

Uloom-e-Islami ke Farogh mein Qazi Athar Mubarakpuri ki Khidmaat: Ek Tajziyati Mutaala

Ph.D. Thesis

By

Waseem Ahmad

DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES
FACULTY OF HUMANITIES & LANGUAGES

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI

DECEMBER, 2023